زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

## ...... چہرے اور مہرے ......

مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش میں تبدیلی کے عینی شاہد جناب مسعود مفتی ''چہرے'' کے عنوان سے 1974ء میں اس داستانِ دل فگار کو ضبطِ تحریر میں لا چکے ہیں، ازاں بعد 1975، 1976 میں کتابی شکل اور 1987ء سے 1991ء تک احمد ندیم قاسمی کے مجلّے ''فنون'' میں قسط وار تحریر کرتے رہے ہیں۔ بقول قاسمی صاحب ''یہ نہایت سچی اور سلیس تحریر جب نیشنل سینٹر میں پڑھی گئی تو کچھ لوگ سناٹے میں آ گئے، کچھ رونے پر مجبور ہو گئے، اور جو رو نہ سکے وہ لرزتے ہوئے یہ سوچتے رہے کہ تاریخ کے عامل کردار بعض اوقات ملکوں اور قوموں سے کیسے کیسے قیامت خیز مزاق کر جاتے ہیں'' انتظار صاحب اپنے احساسات کچھ اس طرح بیان فرماتے ہیں ''مسعود مفتی اپنا مضمون سنا رہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں سے آنسو اُمنڈ رہے تھے۔ یہ مشرقی پاکستان کے آخری لمحوں کی داستان تھی۔ مشرقی پاکستان نے کیسے دم توڑا، نزع کے وقت کیا عالم تھا اور بنگلہ دیش کی پیدائش کیا رنگ لائی'' اگر ہمارے اندر حقیقت سے آنکھیں چار کرنے اور اپنے اعمال سے رجوع کرنے کا ذرا سا بھی مادہ باقی ہے تو جناب مسعود مفتی کی تازہ تصنیف ''چہرے اور مہرے'' ہمارے لیے رہنمائی کا بہترین ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ دو سو پچاس صفحات کی مجلد یہ کتاب مبلغ تین صد پچاس روپے کے عوض دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد سے بآسانی دستیاب ہے۔

...... انوار شریف

## ...... پاکستان کے سات مصوّر ......

زیرِ نظر کتاب میں جناب شفیع عقیل نے تمام مصوروں کی حیات کے اُن گوشوں کو بھی نہایت خوبی سے اُجاگر کیا ہے جو اوّل تو اور دوسری جگہوں پر کم کم ہی سامنے آئے ہیں اور جہاں کہیں آئے ہیں وہاں بھی بے حد اجمال کے ساتھ۔ تو شفیع عقیل کا یہ کام اس لحاظ سے بھی گراں قدر ہے کہ ہم اس کے ذریعے فن اور فنکار دونوں کا بہ یک وقت اور جامع مطالعہ کرتے ہیں اور یوں اس کام کی افادیت کا دائرہ بے حد وسیع ہو جاتا ہے اور اس فن سے متعلق افراد ہی نہیں بلکہ عام قارئین اور مصوری سے عام سطح پر دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا یقیناً درست ہوگا کہ پاکستان میں آئندہ جو کام بھی مصوری کے مطالعے کے ذیل میں کیا جائے گا، شفیع عقیل کی یہ کتاب اُس کے لیے بنیادی اور اہم ترماخذ ثابت ہوگی۔ دیدہ زیب سرِ ورق نفیس کاغذ کی مجلد اور بامعنیٰ یہ کتاب پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے، جس کی قیمت آٹھ سو روپے مقرر کی گئی ہے، اکادمی بازیافت کراچی سے طلب کی جا سکتی ہے۔

...... مبین مرزا

## ...... پمپوش ......

دیپک کنولؔ موجودہ دور کے منجھے ہوئے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ پچھلی چار دہائیوں سے مسلسل افسانے لکھتے آ رہے ہیں۔ دیپک کنولؔ صاحب کے افسانے ہر خاص و عام کو پسند ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں سطحیت نہیں ہوتی بلکہ تجربے اور عصری زندگی کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ اُن کی زبان بڑی سلیس اور شگفتہ ہوتی ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ رہتے تو ممبئی میں ہیں مگر اُن کی کہانیاں کشمیر کے گرد گھومتی رہتی ہیں۔ اُن کے دل و دماغ سے کشمیر ایک پل کے لئے بھی محو ہوتا نہیں۔ اُن کی ہر کہانی میں کشمیر چھایا رہتا ہے۔ وہاں کے لوگوں کا درد، اُن کی بدحالی اُن کے افسانوں میں بیان ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں شامل سبھی افسانے سال نو کے بہترین افسانوں میں شمار کرنے کے لائق ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ کنولؔ صاحب کے گزشتہ مجموعے کی طرح افسانوں کا یہ گلدستہ ''پمپوش'' بھی قارئین کے دل و دماغ کو خوشبوؤں سے بھر دے۔ ایک سو ساٹھ صفحات اور چودہ افسانوں پر مشتمل یہ کتاب دو سو ہندوستانی روپے کے عوض راہی کتاب گھر، دہلی پر دستیاب ہے۔

...... نعیم حیدر نقوی

# متاعِ چہارسو



☆

# قرطاسِ اعزاز

○○○

# کرشن کمار طوؔر

○○

# کے نام

○○

## ''نقوشِ دائمی''

○○○

کہیں کچھ ان کہا سا ہی کہا ہے
اسے دیکھوں جسے دیکھا ہوا ہے
رفاقت اس کی ہے کچھ مجھ کو ایسے
مری سانسوں میں وہ جیسے بسا ہے
شعاعیں ہر طرف ہیں اس کی رقصاں
ادب کا ایک وہ روشن دیا ہے
نقوش دائمی ہیں شعر اس کے
غزل اس کی غزل سے ماسوا ہے
کہیں وہ عجز سے ہے کچھ عبارت
بہت روشن کہیں اس کی انا ہے
معجز کیوں نہ میں اس کو پکاروں
کہ اس سے رات دن کا واسطا ہے
اسے کیوں کر نہ ابر تر کہیں ہم
زمین شعر پر چھایا ہوا ہے
رعونت سے اسے پرہیز ہر دم
بھلا اس سے اسے کب واسطا ہے
طراوٹ اس کی دیکھیں کیا سخن میں
وہ شاخ شعر پر گل سا دھرا ہے
وہ ہے کچھ موجزن ایسا رگوں میں
کہ دریا وادیوں میں بہہ رہا ہے
رہے ہیں متصل پرویز اس کے
یہاں زیر و زبر جب بھی ہوا ہے

کرشن پرویز (روپڑ، بھارت)

# ''گردشِ حزیں''

## عروب شاہد

(راولپنڈی)

نام :
کرشن کمار طور

ولدیت :
شری ہیرالال۔شریمتی گلاب دیوی (مرحومین)

پیدائش :
گیارہ اکتوبر 1933ء (لاہور)

تعلیم :
ایم۔اے، ڈپلومہ ان جرنلزم۔ سرٹیفکیٹ ان ٹورزم۔ سرٹیفکیٹ ان ہوٹل مینجمنٹ اور کیٹرنگ ٹیکنالوجی۔

ہجرت :
لاہور کے بعد پہلے انبالہ اور بعد میں پٹیالہ اور آخر میں دھرم شالہ۔

ایڈریس:
134/E کھیناراروڈ، دھرم شالہ 176215، ہماچل پردیش، بھارت

فون :
091-1892-222932

موبائل :
091-9816020854

**مطبوعات :**

۱۔ دریافت، تالیف، ہماچل پردیش کے شعراء کا انتخاب کلام اور تعارف وتبصرہ۔
۲۔ ترتیب۔تالیف، ہماچل پردیش کے شعرا کے کلام کا انتخاب۔
۳۔ سیر سبزہ۔آزادغزلوں پر مشتمل کلام۔
۴۔ شعر شگفت غزلوں کا مجموعہ 1982۔
۵۔ عالم عین غزلیات 1988۔
۶۔ مشک منور غزلوں کا مجموعہ 1995۔
۷۔ رفتہ رمز غزلوں کا انتخاب 2002۔
۸۔ سرنامہ گماں نظری غزلوں کا مجموعہ 2005۔
۹۔ غرفۂ غیب نئی غزلوں کا انتخاب 2010۔
۱۰۔ چشمۂ چشم حمد،نعت اور اسلام پر مشتمل انتخاب 2010۔
۱۱۔ کشش کاف کلام، اب تک کے کلام پر مشتمل کلیات، زیر ترتیب۔

**اعزاز وانعام:**

۱۔ کتابوں پر بہار اردو اکادمی سے انعام۔
۲۔ کتابوں پر اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام۔
۳۔ کتابوں کی اشاعت کے لئے پنجاب اور ہماچل پردیش حکومتوں سے مالی معاونت۔
۴۔ امریکہ بائیو گرافیکل انسٹی ٹیوٹ سے مین آف دی ایئر کا انتخاب 2002۔
۵۔ انجمن ترقی اردو ہند کی جمشید پور شاخ سے قومی امیر خسرو ایوارڈ 2006۔
۶۔ ہماچل پردیش سرکار اکادمی آف آرٹ، لٹریچر اینڈ لینگوئجز کی طرف سے 2007ء کے لئے فخر اور اعزاز۔
۷۔ ساہتیہ اکادمی، نئی دلی اور دیگر ادبی انجمنوں کی طرف سے منعقدہ سیمینار، ادبی مذاکرات اور شعری محفلوں میں شرکت۔

**دیگر :**

ایڈیٹر، سرسبز شعر اور نقد شعر پر مشتمل رسالہ جو گذشتہ بیس برس سے شائع ہو رہا ہے۔لوگوں اور شعرا پر ان کی تخلیقات اور مجموعوں پر تنقیدی نوٹس، تحسینی تجزیئے وغیرہ وغیرہ۔

☆

# ''خودآگہی کا وقار''

**فاری شا**

(اسلام آباد)

۸ستمبر۲۰۱۰

دہلی، بھارت

مجی کرشن کمار طوصاحب۔

آپ کا خط مل گیا تھا ادھر لوٹنے کے بعد کچھ بیمار رہا اور بہت سے کام موخر ہوگئے۔سب سے پہلے تو اس بات کی معذرت کہ اب کے پوسٹ کارڈ پر ٹکٹ پورے نہ تھے۔میری بے خبری کہ ٹکٹ کا احتیاط کرنا چاہیے تھا۔ جو آپ نے ادا کیا وہ میرے ذمے تھا۔ دراصل خط لکھتے وقت لفافہ ہاتھ نہ آیا ہوگا اور جو چیز بھی سامنے آ گئی اصل مسئلہ آپ تک پہنچنا تھا۔ آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ غالب تو عمداً بیرنگ بھیجتے تھے تا کہ خط بہر وقت پہنچ جائے۔

معلوم نہیں میں نے فاروقی کے حوالے سے ایسا کیا لکھ دیا کہ آپ کو صفائی دینا پڑی۔ فاروقی لوگوں کا مسئلہ ہیں میرا نہیں۔ میں تو بخدا اُن کو عزیز رکھتا ہوں، الہٰ آباد جاتا ہوں تو ان کا فون آتا ہے اور میں ان سے ملنے کے لیے ضرور جاتا ہوں۔ ذاتی مراسم ایک چیز ہے اور ادبی موقف دوسری چیز۔ادبی معاملات کو ذاتیات کے حوالے سے دیکھنا ہی غلط ہے۔پندرہ برس سے میں جو تھیوری یا ادب ومعنی وزبان کے مسائل پر لکھتا ہوں تو وہ فاروقی کے خلاف نہیں ہے فلسفہ ادب کی نئی بصیرتوں کے حق میں ہے۔اردو والے غیبتوں میں ضرورت سے زیادہ فیاض ہیں اور فاروقی صاحب کی بھی زود حسی اگر وہ اُسے اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ترقی پسند بھلے زندہ ہیں، ترقی پسندی ساٹھ کے دہے میں دم توڑ گئی ہے جدیدیت والے بھی بھلے موجود ہوں، جدیدیت مدّت ہوئی اپنا الاؤ ٹھنڈا کر چکی۔حالات بدل گئے رویے بدل گئے۔ نیا دور شروع ہو گیا ہے، کوئی مانے نہ مانے جانتے سب ہیں۔

میں نہیں پوری اردو دنیا وہ کہتی ہے جو میں نے اب لکھا۔ کسی کو بُرا لگا تو آئندہ نہ لکھوں گا۔ پھر یہ کہ میری عدیم الفرصتی میری مجبوری ہے، کسی کو مجھ سے شکایت ہوسکتی ہے، معافی مانگ لوں گا۔ لیکن اگر آپ کے تئیں مخلصانہ جذبات رکھتا ہوں تو ان کو بدل نہیں سکتا۔ میرے پاس ہر ماہ ستر اسّی کتابیں آتی ہیں میری حالت خود میری نظروں میں لائق رحم ہے۔ کالیداس گپتا رضا کا اُٹھ

جانا ایسا گھاؤ ہے کہ بھرتے بھرے گا۔ صفیں کی صفیں خالی ہو رہی ہیں۔ آپ، آزاد گلاٹھی، پریم کمار نظر، پرتپال سنگھ بیتاب، عزیز پریہار، شین۔کاف۔نظام، ان علاقوں میں اردو اب آپ لوگوں کے دم سے ہے۔ خدا آپ کو خوش اور تندرست رکھے۔ آپ کا پتہ میرے پاس ہے، فون نمبر بھی لکھ دیں، رابطہ رکھنے میں آسانی رہے گی۔

ویسے بھی آپ پہاڑ کی بلندی ہی پر نہیں رہتے، غزل میں بھی ایک بلندی پر ملتے ہیں۔ شاعری میں شہرت کا کوئی آسان راستہ نہیں، یہ سفر بھی بہت دشوار گزار وادیوں اور گھاٹیوں سے گزرتا ہے۔ خدائے بخشندہ کی بخشش اپنی جگہ پر، اس راہ میں کڑی ریاضت اور عبادت کے بغیر گزر ممکن نہیں۔ شاعری روشنائی سے نہیں دل کی روشنائی سے لکھی جاتی ہے۔ آپ نے بھی اپنی منزل اپنے خونِ جگر سے پائی ہے۔ شاعری میں ایسوں کی کمی نہیں جو روایتاً چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر دنیا میں آتے ہیں لیکن ان لوگوں کو تو بہت کڑی جھیلنی پڑتی ہے جو غیر اردو علاقوں سے آتے ہیں یا جن کے خانوادوں میں شعر وسخن کی فضا نہیں رہی۔ بغیر ریاضیت اور جیون بھر کی لگن کے جوت نہیں جلتی۔ دوسروں کے لیے اس چیلنج کو سمجھنا آسان نہیں۔ لیکن ادب میں معیار اور قبولیت کی میزان ایک ہی ہے، دو نہیں۔ ہر فنکار کو خواہ وہ ''اندر'' کا ہو یا ''باہر'' کا اسی میزان پر کھرا اترنا پڑتا ہے۔ یہ میزان کسی نقاد کے فتووں سے نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں پڑھنے والوں کے دلوں میں اترنے سے عبارت ہے اور آپ نے اپنے تخلیقی سفر میں ان شرائط کو پورا کیا ہے۔ آپ کے دست ہنر مندر کی تخلیقیت آپ کے ہر لفظ پر ثبت ہے۔ آپ نے تغزل کے آداب بھی برتے ہیں اور معنی پاشی کا حق بھی ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں کئی دہائیوں سے ایک رسالے کو بھی ہرا بھرا رکھا ہوا ہے۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ میرے معاصرین میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس نے دل کے اندرون میں ''غرفۂ غیب'' کو کھلا رکھا ہے اور زمانے کے گرم وسرد سے بے نیاز وادیٔ شعر میں برابر مستِ سفر ہے۔

**گوپی چند نارنگ**

۱۵ستمبر۲۰۰۴ء

(لاہور، پاکستان)

مائی ڈیئر طور صاحب، آپ کا پرچہ مل گیا تھا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے اداریے میں غزل کو مطعون کرنے والے جن نقاد حضرات سے شکوہ کیا ہے، اگر جرائد میں ایسی ہی غزلیں شائع ہوتی رہیں گی جیسی کہ مذکورہ شمارے میں شامل کی گئی ہیں تو پھر شکوہ وشکایت کی صورتِ حال پیدا ہوتی ہی رہے گی کیونکہ جہاں عرفان صدیقی (مرحوم) کی غزلیں میں پہلے پڑھ چکا تھا، وہاں باقی سب کی غزلیں محض روٹین کی غزلیں ہیں، اور جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جہاں تہاں ایسی ہی غزل لکھی جارہی ہے۔ چنانچہ ان حالات میں ایڈیٹر حضرات بھی بری الذمہ نہیں ٹھہرتے۔

جیسی رُوح، ویسے فرشتے کے مصداق، غزل کو نقاد بھی اسی طرح کے میسر ہیں۔ جناب حبیب حق اور جناب جمال اویسی کے مضامین بھی ایک کارِ بے سود ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے جو بات گل آفتاب کے حوالے سے کہی تھی اُسے اب کم وبیش چالیس سال گزر چکے ہیں اور حبیب حق صاحب کو اب تک اس صدمے سے نکل آنا چاہیے تھا۔ پھر یہ بھی کیا ہے کہ وہ اور دوسرے خوف اور لحاظ سے کچھ نہ بولے۔ کیا اب وہ خوف اور لحاظ باقی نہیں کیا؟ دوسرے یہ کہ کسی مصلحت کے تحت آپ اپنی دیانتدارانہ رائے کو چالیس برس تک روکے بھی رکھ سکتے ہیں جدید غزل کی جو جو تعریفیں فرمائی گئی ہیں وہ بجائے خود فرسودہ اور ازکاررفتہ ہیں۔

جمال اویسی صاحب جو جدید غزل پر تنقید لکھنے بیٹھے ہیں تو انہیں یہ کم سے کم معلوم ہونا ہی چاہیے کہ جدید غزل ہوتی کیا ہے، جبکہ اشعار کے انتخاب سے ایسا ہرگز ظاہر نہیں ہوتا۔ مثلاً شہریار کے جو اشعار انہوں نے انتخاب کر کے درج کئے ہیں، کیا شہریار سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے منتخب یا نمائندہ اشعار ہو سکتے ہیں؟ اسی شمارے میں جمال اویسی صاحب کی اپنی غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہاں پر میں اپنی ہی کہی ہوئی ایک بات کو دہرانا چاہتا ہوں کہ جدید غزل کا نقاد اگر خود بھی غزل کہتا ہے تو اس کی اپنی غزل تو کم از کم جدید غزل کے تقاضوں پر پوری اترنی چاہیے۔ یہی حال ہمارے دوست اور مہربان ابرار احمد کا ہے۔ اُن کے جس مضمون کا حوالہ حبیب حق صاحب نے دیا ہے، اس میں موصوف نے 80ء کی دہائی کے جن پسندیدہ شعراء کے منتخب اشعار درج کئے ہیں، اُن میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اُن کے موقف کی تصدیق کر سکے۔ اور یہ بات میں نے ایک ملاقات میں اُن سے کہی بھی۔ نیز یہ بات نہیں ہے کہ اُن شعراء نے عمدہ شعر کہہ نہ رکھے ہوں۔

ایک بات یہ بھی محسوس کی جاتی ہے بعض بزعم خود جدید شعرا خود کو جدید شاعر منوانے کے لیے ساتھ ساتھ تنقید نگاری کا چابک بھی لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ ہم عصر غزل نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ایک کلیشے کی صورت اختیار کر رہی ہے جس کا اُن لوگوں کو ہرگز کوئی احساس نہیں ہے۔ اور جس میں یقیناً میرا بھی حصہ ضرور ہوگا۔ میرے نزدیک شاعری (غزل) کا ایک صحیح یا غلط معیار یہ بھی ہے کہ مثلاً کوئی مجموعہ غزل آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اگر اسے پڑھنے کے بعد آپ یہ سمجھیں کہ کلاسیکل غزل سے لے کر اب تک اسی طرح کی، یا اس سے بہتر شاعری تخلیق کی جا چکی ہے تو اس مجموعے یا اس اور ایسی شاعری کا پھر کوئی جواز نہیں ہے۔

آپ اپنا مجموعہ کلام ضرور بھجوائیں۔ مضمون لکھنے کا وعدہ نہیں کرتا۔ اگر اُس نے اس پر اُکسایا تو کچھ لکھ بھی سکتا ہوں۔ اور اس لکھے ہوئے کی کوئی ایسی اہمیت بھی نہیں ہوگی۔

آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر، لیکن میں پوری دیانتداری سے سمجھتا ہوں کہ آپ کو سرسبز کا مزاج، موسم اور ماحول برقرار رکھنا چاہیے۔ نیز یہ کہ مجھے سفید کوّا بنانے سے آپ کو کیا حاصل ہوگا۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

**انور سدید**

۳۰ جنوری ۲۰۰۳ء

(دہلی، بھارت)

برادرِ عزیز طور، سلام محبت

آپ کا خط ملا۔ اور اس کے ساتھ آپ کے کلام کا تازہ ترین مجموعہ۔ ان عنائتوں کے لیے تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ آپ کا کلام گہرے تہذیبی ردّعمل کی تجسیم کرتا ہے۔ کچھ ایسا اتفاق ہے کہ دیرینہ وابستگیوں کے باوجود میں آپ کی شاعری کے بارے میں (ماسوا انگریزی میں ایک مختصر تبصرے اور آپ کی ایک غزل کے انگریزی ترجمے کے) تفصیل سے کچھ نہیں لکھ سکا۔ بہر حال یہ محض اتفاق ہے ورنہ میں آپ کے کلام کی دل سے قدر کرتا ہوں اور یہ اعزاز میرے لئے باعث حسرت ہے۔ بعض مصروفیات۔ ادبی غیر ادبی۔ بیکار ناگزیر سب قسم کی صبر آزما مصروفیات میں گھرا رہتا ہوں۔

پچھلے چند برسوں میں لکھا بھی بہت کم ہے۔ سرسبز، ملتا ہے تو آپ سے انتہائی تحرک آمیز ملاقات کا احساس ہوتا ہے۔ تازہ شمارے سے پہلے کا شمارہ جب ملا تو میں نے ۳ جولائی ۲۰۰۲ء کو اپنے تاثرات کے اظہار کے طور پر ایک خط لکھا تھا۔ کچھ دن پہلے اپنے کاغذات کو ٹھیک ٹھاک کرتے ہوئے اچانک میری نظر اس خط پر پڑی۔ لکھا تو ۳ جولائی ۲۰۰۲ء کو تھا لیکن میری غفلت کے باعث پوسٹ نہیں ہوا ہے جبکہ میں سمجھتا رہا کہ خط پوسٹ ہو چکا تھا وہ خط اس خط کے ساتھ منسلک ہے۔ شرمندہ ہوں اور معذرت خواہ ہوں۔

موسم میں کچھ تمازت آجائے تو اطمینان سے بیٹھ کر آپ کی شاعری کے بارے لکھوں گا۔

**بلراج کومل**

۳۰ دسمبر ۲۰۰۵ء

(پشاور، پاکستان)

محترمی طور صاحب، آداب۔

''مشک منور'' کے خوبصورت تحفے کے لئے شکریہ۔ میں ایک طویل عرصے سے آپ کا کلام مختلف رسائل میں پڑھتا ہوں اور آپ کے فکر و فن کو سراہتا ہوں۔ آپ کی غزلیات کے تازہ مجموعے نے میرے شوق ملاقات میں اضافہ کر دیا ہے۔ میرے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ آپ کے دیگر مجموعے مل جائیں تو میرے لئے باعث افتخار ہوں گے۔ یہ چند باتیں جو شاید آپ کو پسند آجائیں۔

''شاعری شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مشک منور کا شاعر پاکیزہ

فکروخیال کا مالک اور شائستہ عادات واطوار کا حامل نظر آتا ہے۔آفاقی اور انسانی اقدار اور روایات پر اسکا پختہ یقین اسکی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اس کی غزل میں صاف ستھری اور عصری کثافتوں سے پاک فضا اسکے وسیع تر اُفق کی گواہی دیتی ہے۔اسکی فکر اور انداز بیان اس پُر آشوب دور کی بے سمتی اور بے ربطی کا آئینہ اٹھائے ہوئے ہم سب کو دعوت فکر دے رہی ہے۔ہمیں اس میں اپنی بگڑی ہوئی صورتیں دیکھ کر اپنی شناخت کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔اس کلام میں کوئی مصنوعی پیچیدگی اور زمانی الجھاؤ نہیں۔جذباتی تموج بھی اتنا متلاطم نہیں کہ خیال کو بہا کر لے جائے۔بس ایک ٹھہراؤ ہے جو قدم قدم سوچ کے لئے آمادہ کرتا ہے اور آدمی کو بہرصورت و بہرحال معتبر مقام پر دیکھنے کا آرزومند ہے۔

جذبے کی صداقت اور لب و لہجے کی توانائی نے غزل کو آبروبخشی ہے اور کرشن کمار طُور کی غزل اس آبرو کو بڑھاوا دینے کے لئے شہادت کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔''

محسن احسان

۲۸مئی ۱۹۹۴ء

(کوئٹہ' پاکستان)

طُور صاحب، آداب۔

کوئی القاب لکھنے سے قاصر ہوں اس لئے کہ ابتک اتنا بھی نہیں جانتا کہ برادرم لکھوں یا عزیزم۔بہرحال رابطوں کے لئے عمر کی قید تو ہوتی نہیں اظہر جاوید سے آپ کا پتہ لیا پھر خط لکھنے کی جسارت کی۔شاید میرے جیسے گمنام شاعر، صحافی اور مصنف سے آپ واقف ہوں۔نہ بھی ہوں تو کیا کیونکہ یہاں تو معاملہ قطعاً جذباتی ہے۔وہ اس حوالے سے کہ میری زندگی کے 15 برس شملہ میں گذرے۔سنجولی میں رہتا تھا۔میٹرک کا امتحان دیا تو ملک تقسیم ہوگیا۔مگر وہ یادیں اور وابستگی اپنی جگہ مسلّمہ۔جو اس بے نیاز اور بے فکر دور کا اثاثہ ہیں۔شملہ اور نواحی علاقوں کا ایک ایک راستہ آج بھی محبوب کی گلیوں کی طرح ازبر ہے۔ بس ازبر ہے۔اس کی مٹی سے لپٹ سکتا ہوں نہ اس کے درختوں کی چھاؤں میں سانس لے سکتا ہوں۔آپ بطور شاعر ان جذبوں کو بہتر طور پر جان سکتے ہیں۔ سمجھ سکتے ہیں۔

سرسبز نام کے حوالے سے تو اردو کا پرچہ ہی ہوگا۔کوئی شمارہ بھجوا دیں تو خوشی ہوگی۔آپ پہلے سے شملہ میں ہیں یا آپ بھی میری طرح شرنارتھی بن کر دھرم شالہ پہنچے۔دلّی میں ایک دوست منموہن شرما ہوا کرتے تھے۔ان دنوں ''تیج''میں تھے۔خدا جانے اب کہاں ہیں؟ ان سے رابطہ ٹوٹا تو آج تک دوبارہ قائم نہ ہوسکا۔اگر آپ اتفاقاً کچھ جانتے ہوں ان کے بارے میں تو ضرور لکھیں یعنی ان کا پتہ وغیرہ۔ممنوں ہوں گا۔

آپ کا شغل کیا ہے۔سرسبز سے ہٹ کر۔ملازمت یا کاروبار۔ اظہر جاوید شملہ گئے۔میں ان سے بھی بچھڑا ہوا ہوں۔اس حوالے سے کہ 26 برس لاہور میں گذارے، دن رات اٹھنا بیٹھنا۔پھر میں جنگ کراچی سے منسلک ہوگیا۔چند سال بعد کوئٹہ مشرق میں آ گیا۔ریٹائرمنٹ کے بعد اب پھر جنگ کوئٹہ میں ہوں۔باقی سلسلہ ریڈیو، ٹی وی کے ساتھ لکھنے لکھانے کا ہے۔

آپ کا مکمل تعارف چاہوں گا۔ایک ایسے خط کے جواب کی امید بھی رکھوں گا جو بے سروپا سا ہے۔شاید بے مقصد بھی۔رابطہ رہا تو بامقصد بھی ہو سکتا ہے۔

صلاح الدین ناسک

۱۳جنوری ۲۰۰۳

(ممبئی' بھارت)

ڈیئر طُور، محبتیں۔

''رفتہ رمز'' پا کر دلی خوشی ہوئی۔تمہاری شعری کی تصانیف کے نام بھی تمہارے کلام کی طرح انوکھے اور منفرد ہوتے ہیں اور تمہاری شاعری کی معنویت اور شعریت پر خوب چسپاں ہوتے ہیں۔

قاری کو شاعری سے مانوس ہونے میں خاصا وقت لگتا ہے۔میں تو تمہارا پرانا قاری ہوں۔اطمینان سے پڑھ کر، رفتہ رمز پر سحر حاصل تبصرہ کر کے بھیجوں گا۔

ان دنوں مصروفیتیں کچھ زیادہ ہیں ۔ مصروفیتوں سے زیادہ اُلجھنیں۔ادبی نہیں، سب دفتری اور کاروباری۔یکسوئی اور ارتکاز کے ساتھ نہ لکھا جارہا ہے نہ پڑھا جارہا ہے۔بس رسائل کی ورق گردانی ہورہی ہے۔ان دنوں سہہ ماہیوں اور کتابی سلسلوں کی بھرمار ہے اور کیا کیا رطب و یابس چھپ رہا ہے۔ ایسے میں'' سرسبز'' جیسے رسالے ہی زیادہ اہم ہیں جن کی ضخامت کم اور وقعت زیادہ ہوتی ہے۔

عبدالاحد سازؔ

۱۴جنوری ۲۰۰۶ء

(اوکاڑہ' پاکستان)

ترے دوام میں، ہر گام دلربائی ہو!
نئی کتاب، نئے سال کی بدھائی ہو!!

آپ کی کتاب سرنامہ گماں نظری، ہنگامہِ سپیدہِ سحری کی مانند میرے آنگن میں نمودار ہوئی، پورے سج سنگھار اور تخلیقی اظہار کے ساتھ، کرشن جی میں اس کتاب پر ضرور لکھوں گا۔عنقریب ہی۔۔۔آپ انتہائی مکمل اور اکمل شاعر ہیں۔آپ نے اپنی ان تھک تگ ودو کے ذریعہ سے اُردو غزل کو بڑے عظیم آفاق کا وفاق بخشا ہے، میں آپ کی غزل پڑھ کر، ہمیشہ ایک ابدی آنند سے دو چند ہوا ہوں، آپ مرے محبوب شعراء میں سے ہیں۔اُدھر ایک برس پہلے، مجھ پر روشنائی میں آپ کا ایک گیت چھپا تھا۔احساس تشکر سے دبا جارہا ہوں۔بڑا کرم کیا آپ نے۔

احمد آباد میں ہمارے ایک کرم فرما مصور و شاعر جینت پرمار سے رابطہ ہو تو اُنہیں میری طرف سے کہیں کہ میرے مجموعہ ''چاندنی کی پتیاں'' کے لئے مجھے ایک سرورق بنا کر، فوری روانہ کریں۔ میں اپنی نثری کتاب ''کون دیس گیئو'' بہت ہی جلد آپ کو روانہ کروں گا۔

ناصر شہزاد

۳۰ اپریل ۲۰۰۳ء
(پیلی بھیت، بھارت)

برادرم طور صاحب، آداب۔

آپ کا گزشتہ خط بھی مل گیا تھا۔ کل دوسرا محبت نامہ ملا۔ بھائی ''تنقید'' اگر سچائی پر مبنی ہے تو ناقد کے قلم و ذہن کو ذمہ داری کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اوّل یہ کہ یکسو ہو کر اُسے متن کی گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔ یعنی ناقد کو بھی مصنف کے اسلوب و لفظیات کی وہی حسی کیفیات کو خود پر طاری کرنا ہوتی ہیں جو مصنف کا منشا ہے۔ میں نے ''رفتہ رمز'' میں کلیدی تمام عناصر کی نشاندہی کی ہے جو آپ کے تمام کلام میں جاری و ساری ہے۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں نے آپ کی شاعری کو ''شعر شگفت'' اور ''عالم عین'' و دیگر پرچوں میں برابر لکھا ہے۔ اور پچیس، تیس اچھے شعراء کی فہرست میں آپ کا مقام میری نظر میں نمایاں ہے اور آپ ''غزل'' کے میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ پھر ''رفتہ رمز'' نے مجھے آپ کے متن میں جو کچھ ملا اس کا اظہار کیا گیا۔ اب میں آپ کے مجموعہ ''شعرِ شگفت'' کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے ساری باتیں، ساری کی ساری وہی نظر آ رہی ہیں جن کا اظہار ''رفتہ رمز'' میں ہوا ہے۔ فارسی تراکیب، ردیفوں کا خاص طور پر نیا انداز اور اکثر جگہ پرانا کا استعمال وغیرہ اور جمالیاتی خوبصورتیاں وغیرہ، سچا شاعر عمر کے فاصلوں کے بعد بدلتا نہیں۔ میں ''شعرِ شگفت'' پر بھی مطالعہ کے بعد تنقیدی مضمون انشاءاللہ بھیجوں گا۔

ذکاءالدین

۱۸ مئی ۲۰۰۳ء
(کراچی، پاکستان)

مکرمی طور صاحب، آداب۔

آپ کا خط اور رسالہ ملا میں اس رسالے سے واقف نہیں تھا۔ دیکھا تو جی چاہا کہ اس کے پچھلے شمارے بھی دیکھوں، خاص طور پر وہ شمارہ جس میں فاروقی صاحب کا مضمون چھپا ہے اور جس کا حوالہ اس شمارے کے خطوط میں موجود ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟

آپ کی کتاب مجھ تک نہیں پہنچی۔ ورنہ رسید ضرور دیتا۔ آپ کی شاعری کے بارے میں فاروقی صاحب اور وارث علوی کی رائے پڑھنے کے بعد، اس کتاب کو دیکھنے کا اشتیاق ہے۔

دنیا زاد آپ کو بھجواؤں گا۔ آپ نے اس کے لیے دو غزلیں بھیجی ہیں۔ اگر آپ دس، بارہ تازہ غزلیں بھیجیں تو ہم اس میں سے انتخاب کر لیں اور زیادہ غزلیں شاملِ اشاعت کریں۔ آپ کے کلام سے پاکستان میں ہم لوگ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ اس طرح تعارف کو مزید بہتر کرنے کا موقع مل جائے گا۔

آصف فرخی

۳۱ جولائی ۲۰۰۳ء
(حیدر آباد، دکن)

برادرم طور صاحب۔

''رفتہ رمز'' جیسے خوبصورت شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد قبول کیجیے، میں نے ابتداء کی کئی غزلیں پڑھ ڈالیں، ایک ساتھ انہیں پڑھتے ہوئے اس خوشگوار حیرت سے دوچار ہوا کہ آپ کے یہاں وہی فکر و اسلوب ہے جو نیئر مسعود کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ آپ بات سیدھی طرح نہ کہہ کر لفظوں کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ شعر ذرا سا مشکل ہو جاتا ہے اور کچھ دیر بعد ذہن کے اُفق پر اُس کی پرتیں کھلتی ہیں تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

لفظ کربلا، آپ کو بے حد عزیز ہے۔ اکثر شعروں میں اس کا استعمال ہوا ہے، اسطوری اور عصری دونوں حیثیتوں سے اس لفظ کے استعمال نے شعری معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ کربلا استعاریت، ظلم و جبر کا، حق و باطل کے تصادم کا آج اکیسویں صدی کا انسان، ملک، شہر، گاؤں اور گلیوں میں، خود کو کربلا میں پاتا ہے تو حساس فنکار اس کا اظہار کرنے سے خود کو کیسے روک پائے گا۔

آپ کی شاعری، ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی چیز ہے۔

شفق

۱۹ مارچ ۲۰۰۳ء
(حیدر آباد، دکن)

برادرم کرشن کمار طور، تسلیمات۔

آپ کا مجموعہ کلام ''رفتہ رمز'' مل گیا ہے۔ آپ کی شعر گوئی کا انداز دوسرے شعراء سے قطعی مختلف ہے۔ آپ کی لفظیات بھی ہم عصر شعراء سے قطعی جداگانہ ہیں۔ بہت سے شعر مجھے پسند آئے خاص طور پر یہ چند اشعار۔

رونے کی صدا کہیں نہیں ہے  اب روز جزا کہیں نہیں ہے
سنسان ہے رہ گزر جنوں کی  تیرا بھی خیال اب نہیں ہے
کنارِ دشت میں پہلے تو گھر نکلتا ہے  قدم اٹھاؤں تو تازہ سفر نکلتا ہے
ہوں سنگِ میل تو پھر فائدہ کیا  کہ قدموں کو سفر بھی ہے ضروری
ثبوت ایسے دیا جائے اپنے ہونے کا  دیا جلا کے کسی رہ گزر میں رکھا جائے
ہے مجھ سے اس کو میسر خود آگہی کا وقار  وہ آستانہ تھا میری جبیں سے پہلے کیا
پھر آئینے ہوئے محتاج تازہ چہروں کے  پھر آج قحط پڑا عشق کا زمانے میں

مغنی تبسم

# ''خودشناسی کی خوشبو''

(انتخاب اختصار)

ڈاکٹرسیدسعیدنقوی (نیویارک)

میں خودشناسی کی خوشبو پہ مرنے والا ہوں — انا کے اندھے کنویں میں اترنے والا ہوں
چھپا کے رکھو گے مجھ کو کہاں تک آنکھوں میں — میں خواب بن کے فضا میں بکھرنے والا ہوں
مزاج دہر کو دیتا ہوں دانش رگ عشق — سیاہ راتوں میں خورشید بھرنے والا ہوں
محیط ہو کے بھی پر چھائیوں کے صحرا میں — میں اپنی سانس کی مانند اترنے والا ہوں
لپیٹتا ہوں بدن سے نشاط زہر خودی — میں اپنی ذات سے انکار کرنے والا ہوں
ہر اک قدم پہ ابھرتا ہے نقش خواہش دل — حدود کرب سے شاید گزرنے والا ہوں
عدم وجود کے دشت سراب میں اے طوؔر — میں ایک لمحۂ موجود بھرنے والا ہوں

...... O ......

O

وہ آنکھ جاگ رہی ہو تو خواب رکھ آؤں
میں اس بدن میں ہوس کے گلاب رکھ آؤں
مرے وجود پہ چسپاں ہے اعتبار انا
اٹھوں دیار خودی میں سراب رکھ آؤں
حدود جاں میں تو ممکن نہیں ہے سیل نظر
کھلی فضا میں افق کا عذاب رکھ آؤں
ہر ایک آج ہے امکان منظر آئندہ
کہیں تو مرحلۂ انتخاب رکھ آؤں
امید نو کو نہ دوں کوئی لمحۂ رخصت
یہ شعلہ طوؔر چلوں سطح آب رکھ آؤں

☆

O

شعلۂ مرگ طلب راز نہاں تھا بھی بہت
اور نفی نقش ہر اک تازہ گماں تھا بھی بہت
ایک لمحے کو میسر نہ ہوئی خود سے نجات
مجھ کو احساس غم کون ومکاں تھا بھی بہت
خود ہے بے چہرہ تو ہے کتنے ہی آئینوں کی موت
ذرۂ خاک کہ سرگرم جہاں تھا بھی بہت
وسعت درد کو کیا دل میں مقید رکھتے
برگ غم شاخ تمنا پہ گراں تھا بھی بہت
ایک ہی لمس انا سے ہوئی تکمیل تمام
یہ بدن طوؔر کہ پابند نشاں تھا بھی بہت

☆

منزل ہے نقش قرب ہوا تم سے کیا کہیں
خود گمرہی کی نقد نوا تم سے کیا کہیں
ہم چپ ہیں تو ساعت دنیا پہ بار ہیں
بولیں تو انتشار صدا تم سے کیا کہیں
یہ لمحہ لمحہ ہوتا ہوا ذات کا زیاں
پل پل بکھرتی خاک انا تم سے کیا کہیں
کیسے کٹی ہلاک زدہ ساعتوں میں عمر
کیوں کر ہوئے ہیں اس سے جدا تم سے کیا کہیں
دشت بدن پہ لکھنے دیں کیا گرمئی ہوس
کس درجہ ہم ہیں آبلہ پا تم سے کیا کہیں
رکھی ہر اک چراغ کی لو اپنی زد پہ طوؔر
سفاکی سلوک ہوا تم سے کیا کہیں

...... O ......

مری آنکھوں میں گزراں جستجو سی
چمکتی ہے کوئی شے اب لہو سی
وفا ٹھہری اک اسم نامکمل
متاع قرب پر اسرار ہو سی
بدن صد سمت اظہار تعلق
اور آنکھیں اک مسلسل گفتگو سی
نشہ بجھتا ہوا امکاں جاں سا
رفاقت گرمئی موج لہو سی
جو تھی اک لمحۂ خندہ گمانی
وہی لذت ہے طوؔر اب روبرو سی

☆

نیزہ زنوں کی بھیڑ میں جو خود پسند تھا
سر اس کا اپنے دھڑ سے کئی گز بلند تھا
پیڑوں کو سنگ لمس سے آئینہ کر گیا
کس رو میں جانے آب رواں کا سمند تھا
جس کے گلے ملا اسے یک لخت ڈس لیا
مٹھی میں اس جہاں کی کوئی سانپ بند تھا
میں نے فصیل جسم میں آخر کیا شگاف
پیوست میرے خون میں تخم زقند تھا
خود کو چڑھا لیا کسی چپ کی صلیب پر
شاید تمہیں بھی طوؔر تماشا پسند تھا

...... O ......

کرب ذات دعا میں رکھ دیتا
یہ چراغ ہوا میں رکھ دیتا
کوئی حرف تعلق آب انگیز
اپنی لغزش پا میں رکھ دیتا
شاخ درد ہے پھر ثمر آور
زور اور صدا میں رکھ دیتا
چہرہ چہرہ کھلی کتاب سہی
کچھ تو دست دعا میں رکھ دیتا
طوؔر کھینچ کے منظر گل ریز
خشک پتے ہوا میں رکھ دیتا

☆

**شعرِ گفت**
۱۹۸۲

## براہِ راست

ایک مکتوب میں ممبئی سے جناب فضیل جعفری نے ادارہ چہارسوکواس امر پر مبارکباد کا مستحق ٹھہرایا کہ ادارہ پنجاب سے متعلق اہلِ قلم کو سج دھج کے ساتھ قرطاسِ اعزاز پیش کر رہا ہے۔حق بات مگر یہ ہے کہ سرزمینِ پنجاب کے اہلِ قلم نے نامساعد حالات کے باوجود ہر قسم کے تعصب اور تفریق سے بالاتر ہوکر جس ڈھب، ڈھنگ اور سلیقے سے اردو زبان وادب کی خدمت کی ہے وہ بجائے خود ایک درخشاں باب ہے۔آج کی محفل جعفری صاحب کی رائے کو تقویت بخشتے ہوئے پانچ دریاؤں کی سرزمین کے فرزند، اردو شاعری کی معتبر اور توانا آواز جناب **کرشن کمار طور** کے شخصیت وفن سے آراستہ و پیراستہ ہے۔طُور صاحب سے دیرینہ رفاقت، اُن کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں جذبات واحساسات کی ایک رو قلم کی نوک پر آنے کو بیتاب ہے۔مجبوری فقط یہ ہے کہ ناقدانِ طُور نے وہ سبھی جذبات واحساسات بڑی دانائی اور دیدہ وری سے ذیل کے مقالات میں درج کر دیئے ہیں جن کے مطالعے کی روشنی میں طُور صاحب کی بلند قامتی کو ماپنے کے لیے نئے پیمانے اور اوزان تراشنا ہونگے!!!

**گلزار جاوید**

☆ پہلا سوال دوحصوں میں تقسیم ہے۔اوّل آپ ہمیں ۱۹۳۳ سے ۱۹۴۷ کے لاہور کا منظر نامہ دکھایئے بھی اور سنایئے بھی جس میں آپ کا بچپن اور نوجوانی پروان چڑھے؟

☆☆ لاہور کی جو یاد اس وقت ذہن پر مرتسم ہے وہ کچھ یوں ہے کہ تقسیم ملک کے وقت میں سناتن دھرم ہائی سکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ سکول شاید اس سڑک پر واقع تھا جو لاہور ریلوے اسٹیشن سے پولیس لائن اور پھر شملہ پہاڑی کی طرف رواں رہتی ہے۔بچپن میں، میں اپنے والد اور ماں کے ساتھ ہر ہفتہ لارنس گارڈن جہاں چیل کے درختوں کی وافر مقدار موجود تھی، جایا کرتا تھا۔ وہاں جم خانہ کلب میں ہر سنیچروار کی شام پنجاب پولیس کا بینڈ بلکہ براس بینڈ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔لوگ باگ انگریزی دھنوں کو سننے اور ان سے حظ اٹھانے کے لئے جوق در جوق وہاں اکٹھا ہوا کرتے تھے۔لارنس باغ کے پھولوں بھرے کنج میں ایک آئس کریم کی چھوٹی سی دکان بھی موجود تھی جس میں سہارنپوری آموں کے ذائقے کی آئس کریم ملتی تھی جو میری کمزوری تھی۔ میں نے اس قدر لذیذ آئس کریم ابھی تک نہیں کھائی۔ایک اور یاد جو ذہن میں ابھی تک موجود ہے اور اسے آپ ایک طرح کی کمزوری بھی کہہ سکتے ہیں پتنگیں اڑانا تھی۔ڈور مجھے میرے والد صاحب شاہ عالمی دروازہ کے کھلے میدانوں سے، جہاں لوگ باگ مانجھا لگانے والوں کا کارنامہ دیکھتے تھے، لے کر دیا کرتے تھے اور پتنگیں تو قلعہ گوجر سنگھ میں جہاں ہم لوگوں کی رہائش تھی وافر مقدار میں ملتی تھیں۔لاہور سے ہجرت کے وقت ہم لوگ اور دوسرے افراد کے ساتھ ملٹری کے ٹرکوں میں لد کر اپنی پہلی منزل امرتسر پہنچے تھے۔

☆ ۱۹۴۷ کے بعد کس طرح کے حالات کا سامنا ہوا اور دھرم شالہ میں قیام کن مراحل سے گزر کر ہوا؟

☆☆ امرتسر سے میرے والد شملہ جو کہ مشرقی پنجاب کی جز وقتی راجدھانی تھی، ملازمت کے سلسلے میں پہنچے جہاں سے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ شملہ سے پہلے انبالہ اور پھر بعد میں پٹیالہ میں قیام رہا۔انبالہ میں کم اور پٹیالہ میں بہت زیادہ بی۔اے اور ایم اے وغیرہ پٹیالہ کے قیام کے دوران ہی پاس کئے۔ ملازمت کا آغاز بھی پٹیالہ کے قیام کے دوران ہوا۔ملازمت کے سلسلے میں کاسو اور منالی کے صحت افزا مقامات جو کہ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں میں مشہور زمانہ ہیں، پر بطور ٹورسٹ آفیسر میری تعیناتی رہی۔اس کے بعد شملہ اور آخر میں دھرم شالہ میں پوسٹنگ رہی جہاں سے میں آخر میں وظیفہ یاب ہوا۔دھرم شالہ میں ہی میں نے اپنے گھر اور ہوٹل کی تعمیر کی۔اگرچہ بچے اب دھرم شالہ میں نہیں رہتے، بیٹی چنڈی گڑھ اور بیٹا آسٹریلیا میں مقیم ہے لیکن ہم بوڑھے میاں بیوی ابھی تک دھرم شالہ میں قیام پذیر ہیں اور شاید موت کے آنے تک یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔آگے اللہ مالک ہے جو اسے منظور ہو۔

☆ کچھ معلومات دھرم شالہ کے محلِ وقوع موسم، مزاج اور بود وباش کی بابت بتلایئے؟

☆☆ دھرم شالہ شمال مغرب میں کوہ ہمالہ کی دامن گیر پہاڑی وسعت دھولا دھار، یعنی سفید کوہ یا پھر White Ranges پر اپنا پاؤں پھسلائے ہوئے ہے۔یہ ایک پہاڑی مقام ہے بالکل اسی طرح جس طرح پاکستان میں کوہ مری یا پھر آپ کا علاقہ راولپنڈی ہے۔آپ نے شاید پڑھا ہو کہ غیر منقسم ہندوستان میں یہاں، چراپونجی کے بعد سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔گرمیوں میں موسم بے حد معتدل رہتا ہے اور قرب وجوار کے لوگ یہاں جوق در جوق، سیاحوں کے روپ میں تشریف لاتے ہیں اور موسم کا لطف اٹھاتے ہیں۔دھرم شالہ آج کل تبتیوں کے گورو دلائی لامہ کے باعث بھی دنیا کے نقشہ پر نہایت مشہور اور اہم ہے۔دلائی لامہ کے تبت گورنمنٹ کا یہ دارالخلافہ ہے اور غیر ملکی سیاحوں کی

آماجگاہ۔

☆ لگے ہاتھوں اُس ہوٹل کی روداد بھی بیان فرما دیجیے جو ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے تعمیر کیا تھا؟

☆☆ بھائی آج سے دس سال قبل میرے نام سے ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا لیکن متواتر خسارے کے باعث بینک لون اور بیاج کے اضافہ کے کارن اسے گھاٹے پر بیچنا پڑا۔اس تمام Deal میں کوئی چالیس لاکھ روپے کا نقصان برداشت کرنا پڑا جو آجکل کے حساب سے قریب ستر لاکھ تک پہنچتا ہے۔ایک معمولی سا دو کمروں کا گھر ہے جسے بیچ کر مستقل طور پر چنڈی گڑھ ہجرت کرنے کا ارادہ ہے۔دھرم شالہ کی سردی اب اس عمر میں برداشت نہیں ہوتی۔

☆ شعروسخن سے آپ کا تعلق اور آپ کی بلند پرواز کی روداد بھی ہمارے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہونا چاہیے؟

☆☆ شعر کہنے کا آغاز انبالہ کے قیام کے دوران ہوا جہاں ادبی فضا اور ماحول شعری ہنگاموں کے لئے بے حد سازگار اور موزوں تھے۔ اگرچہ وقار انبالوی اور اقبال سحر انبالوی اور دیگر کئی شعراء پاکستان تشریف لے جا چکے تھے لیکن رام کشن تمنا انبالوی، کنول انبالوی، مشہور اور جدید طرز کے منفرد شاعر بمل کرشن اشک اور کئی دیگر شعرا انبالہ میں رونق افروز تھے، مہینے دو مہینے میں ابو الفصاحت جوش ملسیانی اور احسن مارہروی جانشین داغ کے مشہور شاگرد ابراحسنی گنوری، میلا رام وفا، جن کے بارے مولانا ظفر علی خان کا شعری قول ہے کہ ''شعر کہنے کا سلیقہ سیکھ میلا رام سے''۔ اکثر و بیشتر کسی مشاعرہ یا پھر ادبی محفل میں شرکت کے لئے تشریف لے آتے تھے اور ان سے تفصیلی گفتگو کے مواقع نصیب ہوتے تھے۔ کرپال سنگھ بیدجنہیں مولانا تاجور نجیب آبادی، اقبال ثانی کے نام سے پکارا کرتے تھے سے بھی ملاقات انبالہ کے ہی ایک مشاعرہ میں ہوئی تھی۔ بعد میں جب میں پٹیالہ میں نقل مکانی کر گیا تو یہ ربط زیادہ استوار اور محکم ہو گیا تو میں عرض کر رہا تھا کہ شعر کہنے کا آغاز انبالہ میں ہوا اور رفتہ رفتہ یہ شوق جنون کی حد اختیار کر گیا۔ ہندو پاک کے رسائل سے ملاقات بھی یہیں ہوئی۔انبالہ چھاؤنی میں ایک صاحب کی کتابوں کی دکان تھی جس میں اردو کی کتابیں اور رسائل، خاص طور پر پاکستانی کتابیں اور رسالے آتے تھے اور وہ صاحب چار آنے روزانہ کے عوض انہیں کرائے پر دیا کرتے تھے۔سو بہت سی کتابیں اور رسالے یہیں پہچان کا باعث بنے۔اسی دکان کی معرفت جو علم مجھے حاصل ہوا وہ میری شاعری کی اٹھان میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوا۔

☆ ہم نے اکثر دیکھا، سنا اور پڑھا ہے کہ بیشتر اہلِ قلم مغرب کے بڑے ناموں سے مرعوب یا متاثر نظر آتے ہیں آپ کے ہاں کیا صورت حال ہے؟

☆☆ مغرب کے بہت سے شعرا کا کلام چیدہ چیدہ ہی سہی، نظر سے گذرا ہے لیکن کسی شاعر نے میرے ذہن پر کوئی مستقل اور دیرپا اثر چھوڑا ہوا مجھے ایسا نہیں لگتا۔ ہاں غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ان کے افکار میرے کسی شعر میں ظاہر ہوئے ہوں تو میں کہہ نہیں سکتا۔ بہر حال غزل کے اشعار میں یہ کیفیت ممکن بھی نہیں۔

☆ آپ کی غزل میں ابہام واشارات کا دخل کب اور کیونکر ہوا؟

☆☆ ظاہر ہے کہ غزل میں ابہام شعری تخلیقات کی بلندی کی ایک وجہ ہے۔جب تک انسانی ذہن نفسیات کے زیر اثر ہے اس کی اعلیٰ ذوقی چراغ کی لو کی مانند ہے جو اپنے آپ میں روشنی کو جذب کر کے رکھتی۔ یہ روشنی ہی ابہام اور اشارات کا ایک سلسلہ ہے اور یہی سلسلہ ہے جو اپنے آپ کو منوانے پر بضد رہتا ہے ہمیشہ اور تواتر سے۔

☆ یہ تاثر کہاں تک درست ہے کہ آپ کے ہاں خیال کی شدت شعر کو سست رو بنا دیتی ہے؟

☆☆ یہ الزام اگر آپ اسے ایک نوع کا الزام کہیں حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔اگر خیال کی شدت ہی نہیں ہو گی تو شعر میں وقار کہاں سے آئے گا، اس میں جدت کہاں سے پیدا ہو گی۔خیال کی شدت شعر کی نمایاں خوبی ہے، سطحی اور سامنے کے اشعار میں یہ شدت کہاں وارد ہوتی ہے؟

☆ غزل کے لیے نئے مضامین کی تلاش کا شوق جنون کی حد تک کیونکر پہنچا اور اس سے آپ حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ یہ روشنی ہے کہ غزل میں نئے مضامین کی تلاش اپنے آپ میں ایک خصوصیت کی حامل ہے۔اپنی خصوصی واردات کا اطلاق اگر شعر میں نہیں ہے تو پھر شعر اُگلے ہوئے نوالوں کی مانند ہے۔ نئے مضامین کی تلاش شعر میں ذہنی پختگی کا بھی اعلانیہ ہے اور یہ خلش شعر کو پرکشش بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

☆ آپ اپنی شعری بوطیقا کی تدوین مخصوص الفاظ سے کیوں کیا کرتے ہیں؟

☆☆ ہر شاعر ظاہر ہے کہ مکمل لغت پر قادر نہیں ہوتا۔ اس کے شعر کی پہچان اس کی بوطیقا سے ہی ہوتی ہے، میر، غالب، داغ غرضیکہ ہر شاعر کا اپنا اپنا ایک مخصوص نظام شعر ہوتا ہے اور وہ اسی سے اپنی پہچان اور انفرادیت قائم کرتا ہے اور اسی سے اس کا شعر پرکشش بنتا ہے۔

☆ اوزان و بحور سے آپ کی محاذ آرائی، نئی ردیفوں کی دریافت اور نامانوس بحروں کا استعمال کن جزیروں کی تلاش میں کیا کرتے ہیں؟

☆☆ اگر شعر میں یہ سب چیزیں ممکن نہ ہوں تو شعر سپاٹ، غیر ترجیحی، غیر مکتوبی اور لسانی اور شعری مجبوریوں کا پلندہ بن جائے گا۔ اس میں ذہنی تشنگی کو مٹانے کی ہمت صفر کے برابر رہ جائے گی۔مکھی پر مکھی مارنے کا عمل ہمیشہ سے غیر پسندیدہ رہا ہے۔شعر میں متاثر کرنے کی جامع اور بلیغ حرکت ہی اس بات کے مثبت اور منفی رویوں کی مظہر ہوتی ہے کہ شاعر نے اپنی بات کو کس طرح سے قاری

کے سامنے پیش کیا ہے۔ انفرادی اظہار اسلوب شاعر، کی خودمیں ایک مضبوط اور تیز اثر پہچان ہے۔

☆ پیکر تراشی کے پیچھے اگر کچھ پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں تو اُنہیں کہاں اور کس طرح تلاش کیا جائے؟

☆☆ میرے شعری موضوعات میں پیکر تراشی اگرچہ بے حد نمایاں ہے لیکن اس میں اس لطیف اشارات کا فقدان جس کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ جہت اپنے آپ میں ایک ڈرامائی تجربہ ہے اور موہوم پر موجود کی فتح۔

☆ آپ کے بارے تقلید سے پرہیز کا کیا مطلب لیا جائے۔ ماں کے پیٹ سے کوئی سیکھ کر آتا نہیں؟

☆☆ تقلید کوئی اتنی بھی بری بات نہیں ہے۔ ہر شاعر اوائل میں اس کا شکار ہوتا ہے اور ایسا ہونا فطری بھی ہے لیکن رفتہ رفتہ ذہنی اور شعری پختگی کے باعث اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے۔ شعر کی انفرادیت اگر ذہن میں نہ ہو تو ظاہر ہے کہ تقلید کے گراں پنجوں سے بچنا بالکل ناممکن ہے۔

☆ فارسی زبان سے اپنے تعلق کی ابتداء نیز فارسی کی آمیزش سے اپنی شاعری کو ثقیل بنانے کا جواز بتلایئے؟

☆☆ یہ میں پہلی بار سن رہا ہوں کہ فارسی کے استعمال سے شعر ثقیل ہو جاتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ فارسی کا استعمال شعر کو حسن سے دوچار کر دیتا ہے۔ عام مشاہدہ بھی اس بات کا گواہ ہے لیکن کبھی کبھار مشکل، غیر مانوس اور پے چیدہ ردیفیں مرگ طلب بن کر شعر کے افہام وترسیل میں حارج ہوتی ہیں۔ لیکن سہل اور سہج ترکیبات اس کا واحد اور آسان رد ہیں میرا ایسا ماننا نہیں ہے۔ جواہر پر چاہے گرد پڑ جائے لیکن دیر سویر ان کا روشن ہونا اور چمکنا ایک لازمی امر ہے۔

☆ آپ روایت کا احترام بھی کرتے ہیں اور اُس میں اپنی سوچ کا تڑکا بھی لگانے سے باز نہیں آتے؟

☆☆ روایت میری نس نس میں رواں دواں ہے، چونکہ آدمی اپنے ماضی قریب اور حال سے غافل نہیں ہوسکتا اس لیے دونوں کا اتصال میری شاعری میں عود کر آیا ہے۔ روایتی شاعری میں نئی سوچ کا تڑکا اس کے لطف اور ترسیل کو دو آتشہ کر دیتا ہے۔ یہ ضروری بھی ہے۔

☆ فرائیڈ کے خیالات اکثر سنِ بلوغت اور نرگسیت کے ساتھ آیا کرتے ہیں۔ آپ پیرانہ سالی میں بھی اس مزاج اور میلان کو اپنائے ہوئے ہیں؟

☆☆ بھائی یہ آپ نے فرائڈ کا فلسفہ اور خیالات میری شاعری میں کہاں سے دریافت کر لئے۔ میں معاملات کو پیچیدگی سے حل کرنے کا متمنی ضرور رہتا ہوں لیکن یہ توفیق ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اب اللہ جسے چاہے اپنی اس دین سے نواز دے۔

☆ آپ کا شمار ترقی پسندوں میں کرنے والے آپ کی نظم سے بے نیاز کیوں ہیں؟

☆☆ یہ میرے لئے ایک خوش کن اطلاع ہے کہ میرا شمار ترقی پسندوں میں ہوتا رہا ہے اور میری نظمیں ان لوگوں کی بے نیازی کی حامل ہیں۔ میری جان گلزار جاوید میں تو نظموں کا شاعر ہی نہیں۔ تمام عمر میں شاید دو تین نظمیں مشکل سے کہی ہوں گی اور ان کے موضوعات بھی ترقی پسند شاعری سے مختلف رہے ہوں گے۔ بھلا ایسی نظمیں ترقی پسند شاعروں کی فہرست میں کہاں سے آئیں گی۔

☆ کچھ تفصیل ترقی پسندی سے اپنے رومانس کی بتلایئے؟

☆☆ اگرچہ میں نے ترقی پسند شعرا اور ادیبوں کو پڑھا ضرور ہے اور انہیں پسند بھی کیا ہے لیکن میرا رابطہ ترقی پسندوں سے کچھ یوں ہے جیسے سمندر کے کنارے پر بیٹھا ہوا انسان جو سمندر کی لہروں کو گن تو سکتا ہے لیکن ان میں ڈوب کر، جذب ہو کر ان لہروں کو اپنے بس میں نہیں کر سکتا۔

☆ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے ہی شدت اور جدت کی کشمکش کا ذکر ملتا ہے آپ کا شمار کن لوگوں میں کیا جانا چاہیے؟

☆☆ ظاہر ہے کہ ترقی پسند تحریک کے دوران جدت کی اکا دکا آواز، معروضیت اور غیر جانبداری کے باعث سنائی اور دکھائی دیتی ہے ایسا ہونا لازم بھی ہے کیونکہ ہر پرانی تحریک اپنے بطن میں سے ایک نئی تحریک کے وارد ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے اور یہی باعث ہے کہ جدید تحریک نے اپنے ہونے کا نشان ترقی پسند تحریک سے حاصل کیا اور یہ کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔

☆ کچھ عرصے سے آپ کے ہاں جدیدیت سے پہلوتہی کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے ہیں؟

☆☆ میں آپ کے اس حتمی نظریے سے کہ میری شعری تخلیق میں جدیدیت سے پہلوتہی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، اتفاق نہیں رکھتا۔ شعر کارگاہ میں کوئی شاعر اپنے سامنے کوئی مینوفیسٹو رکھ کر زندگی کا سراغ نہیں لگا سکتا۔ یہ انداز فطری اور قرینہ پر منحصر ہے۔ اجتماعی مقصدیت ہر شاعر کا لازمی اور فطری رویہ ہے اور اسے ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا مستحسن۔

☆ دنیا بھر کے وہ کون سے غم ہیں جنہیں برداشت کرنے کی صلاحیت پر آپ کو فخر ہے؟

☆☆ غموں کی تخصیص نہ ہوسکتی ہے اور نہ کی جانی چاہیے۔ زندگی کو محدود کرنا کہاں کی دانش مندی ہے اور غم کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے کہ اس سے حیات کا سراغ لگایا جاسکے۔ اپنی شخصیت کو اپنے سے نمایاں کرنا ہی واجب ہے۔

☆ ان غموں کی بابت فخر مستحسن اقدام سہی ان کے سدِ باب کے لیے عملی طور پر آپ نے کیا اقدامات کیے؟

☆☆ ہر شاعر کا ناقدانہ فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی کمی سے ذہانت کے باعث اجتناب برتے۔ اور پھر غم کا مداوا ہو ہی کیا سکتا ہے جو غم نشیب وفراز زندگی کے ساتھ داخل ہوتا ہے وہ شعر میں کہیں نہ کہیں بلواسطہ یا پھر بلاواسطہ موجود ہوتا ہے۔ آمد ہمیشہ آورد سے افضل اور احسن ہوتی ہے۔

☆ آپ کو فیض احمد فیض کا ہم خیال کن معنوں میں ٹھہرایا جاتا ہے؟

☆☆ بصیرت کی صنعت رکھنے والی نگاہ مجھے کم سے کم فیض کا ہم خیال نہیں ٹھہرا سکتی۔

☆ کچھ لوگ آپ کے گلے میں جدیدت کا طوق لٹکانے پر بھی مُصر ہیں؟

☆☆ بھائی نئے اور پرانے چراغ کی اپنی اپنی جگہ اہمیت مسلم ہے۔ شاعری شروع سے ہی کرب ذات کا موضوع رہی ہے۔ فرق صرف فن کارانہ اظہار کا ہے اور رہے گا۔

☆ ایک طبقہ آپ کو جدید غزل کا خواجہ میر درد بنانے پر تُلا ہوا ہے؟

☆☆ تنقید اور اس سے اخذ نظریہ اور کیفیت، ظاہر ہے ایک نادر دستاویز ہے۔ انکشاف ہر حالت میں اظہار ذات ہوتا ہے۔ اب اگر میرے شعر تجگوں کی نذر ہوتے ہیں اور ان میں تصورات اور محبت کی جھلک جوان ہوتی نظر آتی ہے تو یہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ گفتگو کبھی بھی گونگی نہیں ہوتی یہ ہمیشہ بلیغ اور جامع ہوتی ہے چاہے اس کا عنوان کسی طرف رجوع ہو۔ یہ میرے لئے خوشی کا مقام ہے کہ میں اپنے پیش روؤں کے قدموں میں ٹھہرتا ہوں۔ تشریح سے تفہیم کبھی بارآور نہیں ہوتی۔ یہ شعور اور آگہی کی صنعت ہے۔ بعض اوقات نئی توجیہہ بھی باعث افتخار ہوتی ہے۔

☆ اور جناب! کچھ لوگ آپ کو نظیر سے بھی مشابہہ قرار دیتے ہیں؟

☆☆ نظیر سے مشابہت بھی میرے لئے حیران کن ہے۔ میرے اشعار میں عوامی جبلت کہاں اثر پذیر ہے۔ وہ خواص میں بھی اتنے ہی مقبول ومشہور اور منفرد ہیں جتنے ایک عام قاری کے لئے اس ضمن میں، میں آپ کا دھیان میر کے شعر کی طرف دلانا ناگزیر سمجھتا ہوں جس میں کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

☆ انا کا ذکر بھی آپ کے ہاں کثرت سے ملتا ہے جس کی وضاحت ازبس ضروری ہے؟

☆☆ انا میرے تمام ضمنی اور فروعی خیالات کا ساختی اشاریہ ہے۔ انا کا تصور بڑا فکر انگیز ہے اور یہ ہمیشہ سے میری اعلیٰ قدروں کی ترجمانی رہی ہے یہ ایک ایسا سورج ہے جو ذات اور خودی کے نفی غاروں میں روشن انگیز ہے۔

☆ فنا کا خوف آپ کے ہاں کب اور کیونکر جاں گزیں ہوا اور اس کے سدِ باب کے لیے آپ نے کس طرح کے اقدامات کیے؟

☆☆ ہماری تمام مقدس کتابیں فنا کے موضوع سے پُر ہیں اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں، زیست میں فنا کی نشان دہی انسان کو راست قدم اختیار کرنے پر نادر کرتی ہے۔ فنا زندگی کے ایسے گوشوں کی نقاب دہی کرتی ہے جو عام طور پر اُلجھے دھاگوں کی طرح راست نہیں ہوتے۔ فنا دراصل صحت مند تنقیدی رویہ ہے جسے ہمیشہ نظر کے سامنے رکھنا لازمی ہے۔

☆ روحانیت کی جانب آپ کا رجحان پھر اُس سے بھٹک جانا ازاں بعد اُس کی تلافی کرنا کس امر کی طرف اشارے ہیں؟

☆☆ روحانیت مذہب سے اپنی برأت کا اعلان نہیں ہے۔ بلکہ یہ عقیدہ کے پختہ بلکہ بے حد پختہ ہونے کی دلیل ہے۔ روحانیت شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور نام نہاد جذبات میں بہہ جانے پر قادر روحانیت تو پتھر پر لکیر ہے اس کے مٹنے یا پھر گم ہو جانے کے آثار معدوم ہیں۔

☆ آپ کے ہاں بھگتی تحریک کے اثرات تلاش کرنے والے آپ کے کون سے روپ کی تلاش میں ہیں؟

☆☆ زندگی میں نبوت بیٹھے بٹھائے حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اس کے لئے لا یعنی کلام بھی معاون اور مددگار ثابت نہیں ہوتا۔ بھگتی رس شخصیت کا انکشاف ہے اور علامت کا اقتباس۔ میری تمام حیات روحانیت اور بھگتی رس کے ادھین ہے یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ میرا ذہن پختہ، بالغ اور تربیت یافتہ ہے۔

☆ قرآن کریم کا مطالعہ کب، کس تحریک اور کس زبان میں کیا اور اُس کے آپ کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

☆☆ قرآن کریم کا مطالعہ اردو اور انگریزی کی کتابوں اور ترجموں کی وساطت سے کیا۔ مجھے اس مطالعہ سے عمل صالح کی ترغیب اور توفیق حاصل ہوئی۔ دانش کے کئی راز مجھ پر آشکار ہوئے۔ اگرچہ مذہب وہ کوئی بھی ہو، صالح اقدار کا بنیادی محرک ہوتا ہے لیکن بعض اوقات کسی کتاب سے استفادزندگی کے معیار اور سند کی لازمی حقیقت بن جاتی ہے۔

☆ حمد، نعت اور سلام کی تحریک کس شخصیت سے اظہار عقیدت کا اعجاز ہے؟

☆☆ بھائی یہ سوال بالکل سامنے کا ہے اور اس کا جواب بھی آسانی میں پوشیدہ ہے۔ جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ میری حیات میں شیریں یقین کا باعث ہیں۔ خدا کے بارے میں بیان لاحاصل ہے وہ ہماری رگ رگ میں پیوست ہے اور مثالی انسان کا عظیم ترین کردار اور اکمل ترین نمونہ رسول اکرم کی ذات میں موجود ہے۔ حضرت حسینؓ کی شہادت انسانی تاریخ میں اپنا ایک انفرادی مقام رکھتی ہے۔ آج وہ جس مقام پر قائم ہیں وہ مقام لامثال ہے۔

☆ نظام کائنات اور اُس کی شانِ کریمی پر اپنے ایقان کے حوالے سے کچھ روشنی ڈالیے؟

☆☆ آپ کا یہ سوال محض ایک جملہ کا مرہون منت ہے۔ اگر اس کی نظر کرم نہ ہو تو انسان معراج کی بلندیوں تک قیام کرتا کہاں محسوس ہوتا ہے۔ انسان

کا ذہنی ارتقاع اس کی دین ہے۔ ہر شخص اپنی ذہنی کیفیت کے سبب کچھ نہ کچھ خدا کی لازوال عنایت سے بطور احسن اخذ کرسکتا ہے۔ خدا کی دین تو وہ بہشت ہے جس میں آزار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

☆ ''چشمۂ چشم'' کے پیش لفظ میں آپ نے تحریر کیا ہے ''اللہ تعالیٰ رجوع کرنے والوں کو بخشش عطا کرتا ہے'' ہر چند آپ کا فرمان صد فیصد درست مگر ایک غیر مسلم کی جانب سے یہ رائے جواب طلب بھی ہوسکتی ہے؟

☆☆ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ صوراسرافیل سے قیامت کے روز مردے زندہ ہو جائیں گے۔ مردوں کو زندہ کرنا اگر ایک معجزہ ہے تو اس کی طرف رجوع کرنے والوں کی بخشش ایک حقیقت۔ اکثر اوقات سطحی مادی فائدوں کی خاطر انسان اپنی روح شیطان کے سپرد کر دیتا ہے اور اگر خدا اس کی روحانی خوشیوں کی تلاش میں معاون ثابت نہ ہوتو ظاہر ہے اس کا یہ فقر یہ انبساط تخلیق کار کی ذات سے مطابقت نہیں رکھتا اور اس کے زوال کا باعث بنتا ہے۔

☆ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اردو زبان وادب سیکولر بھارت میں کب تک اور کس شکل میں اپنا آپ برقرار رکھ سکتے ہیں؟

☆☆ زبان وادب کی تخلیق تب تک کارگر ہے جب تک انسانی ذہن میں محبت کا عمل دخل ہے۔ ہر لکھنے والے پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے سلیقے سے محبت میں نبھائے۔ عملی طور پر ہر شخص پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان وادب کے لئے ماحول بنانے کے بہتر مواقع تلاش کرے لیکن اس میں شرط بلکہ بنیادی شرط وہی ہے کہ انسان مادی آسائش کو تج کر کے ایک بہتر خواب کو سامنے رکھے اور اپنے احساسات اور جذبات سے اس زبان میں خوشی حاصل کرے۔

☆ مستقبل میں انڈو پاک کے تعلقات آپ کے خیال میں کیا رُخ اختیار کرنے جا رہے ہیں اور اہلِ قلم کا اس میں کیا کردار ہونا چاہیے؟

☆☆ انڈو پاک تعلقات کی بحالی میں محبت اور یقین دو ایسے جزو ہیں جو غالباً دیوتاؤں کو بھی خوش کرنے کی بشارت ہیں اہل قلم کو اپنا اپنا یوگ دان مہیا کرنا ازبس ضروری ہے تاکہ آپسی تضادات، اگر کوئی ہیں تو وہ ختم ہو جائیں۔ امن اور محبت سے جو فضا تیار ہوتی ہے ادیب، شاعر اور اہلِ قلم اس کی بشارت دیتے ہیں۔

☆ گھر کی بلی شیر کے مصداق چند خوش فہم اردو زبان وادب کی نسبت عالمی معیار کے دعوے اکثر کیا کرتے ہیں آپ کے خیال میں ان دعووں کی حقیقت کیا ہے؟

☆☆ ہر مرحلۂ شوق کے بطن میں ایک خوش فہمی رقصاں کرتی ہے جس سے مراد اس کے سوائے کچھ نہیں کہ خود کو خوش کیا جائے اور دیگر لوگوں میں اس خوشی کو تقسیم کیا جائے۔ اور پھر ہر زبان کا ہر ادب کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ادبی فضا کو معطر اور خوشبو سے لطف انگیز کرتا رہے۔ اگر اس کی خوشبو دیگر مقامات تک ترسیل کی خوبی رکھتی ہے تو اس میں کیا قباحت ہے، ادب چاہے کہیں کا بھی ہو اپنی ایک خاص پہچان اور کیفیت رکھتا ہے اس سے دیگر قسم کے معنی اخذ کرنا نادانی ہے۔

☆ اہلِ قلم کی اکثریت ہمیشہ سے ناقدین کی بابت شاکی رہی ہے آپ اپنے بارے میں اس حوالے سے کیا کہنا پسند کریں گے؟

☆☆ اہل قلم آغاز سے ہی اس بات کے شاکی رہے ہیں کہ ان کی قدر کے لئے ناقدین کا گروہ میسر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ قدر دانی چاہے وہ قاری کے حوالے سے ہو یا پھر ناقد کی تحریروں کے ذریعے اس سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ مردوں کو زندہ کر دینے کا ہنر یا معجزہ نہیں ہوتا۔ ادب خود یہ معجزہ سرانجام دیتا ہے۔

☆ طُور صاحب! لگ بھگ ساٹھ سالوں پر محیط تخلیقی عمل سے آپ کو کس طرح کی توقعات ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب میں اقبال کے صرف ایک شعر سے دینا پسند کروں گا جو میرے جذبات کی درست عکاسی کرتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ہر لحظہ نیا طُور ، نئی برق تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

☆ آپ کے گھر میں اردو زبان وادب کا کیا مقام ہے یعنی آپ کے بعد آپ کے تخلیقی ورثے کا قدردان اور محافظ کون ہوگا؟

☆☆ میرے بچوں کے ذہنی ارتقا میں اردو کا کوئی ہاتھ نہیں ہے اور یہ میرے لئے باعث فخر نہیں ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس لازوال خوشی کا کوئی عنصر میرے بچوں کے نصیب میں بھی درآیا ہوتا لیکن افسوس اداسی اور ناکامی میرا مقدر ہے۔ مجھے یہ غم ذاتی ہی نہیں بلکہ آفاقی لگتا ہے کیونکہ ہندوستان میں بلکہ خاص طور پر شمالی ہندوستان میں اردو کے حوالے سے جو ماحول طاری ہے وہ میرے اس درد کی منہ بولتی تصویر ہے۔

☆ موجودہ عالمی منظرنامے میں جو بے چینی، کشاکش اور خونریزی پائی جاتی ہے اس کا آپ کے خیال میں جواز اور انجام کیا ہونا چاہیے نیز اردو زبان وادب پر اس کے کس طرح کے اثرات مرتب ہونے کے امکانات ہیں؟

☆☆ کسی بھی دور میں ادب کی اپنی اہمیت اور افادیت رہی ہے، یہی وہ بات ہے جو انسان کو ایک بہترین زندگی کا خواب دکھاتی ہے اور ان کے دلوں میں گل امید کی پیدائش کا باعث ہوتی ہے۔ باقی ہر دور میں انسانی جدوجہد قائم رہی ہے۔ روحانی تسکین کسی مخصوص دور پر منحصر نہیں ہے۔ ہمیں اپنی داخلیت کی فعالی پر پورا بھروسہ ہونا چاہیے۔

☆ طُور بھائی! آخری سوال ہمارا آپ سے یہ ہے کہ آپ اُس جذبے اور خواہش کی تفصیل بتلائیں جس کے زیرِ اثر پوری عمر آپ نے اردو زبان وادب کی خدمت میں صرف کی ہے؟

۴۰۔ میں اپنے اس مقطع سے آپ کی پوری گفتگو کو ختم کرنا پسند کروں گا۔

یہ اختیار کی صورت بہت عجیب ہے طُور
پرانا ڈالتا ہوں اور نیا نکالتا ہوں

# ''وادیٔ وحشت''

(انتخاب ِ اختصار)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

اپنی اپنی انا کے دونوں دم آثار — دیکھوں پہلے سر جھکتا ہے یا تلوار
اب ملنا کچھ کھیل نہیں ہے ندی ناؤ سنجوگ — میں ہوں اس پار تو وہ دریا کے اس پار
تازہ ہوگی پھر سے جاں میں لہو کی فصل — شب تاریک ہے اور دشمن لشکر تیار
وادیٔ وحشت میں قدم رکھنے سے کیا ڈرنا — مٹی تو ہونا ہے اس دل کو آخرکار
باہر کے منظر سب میلے ہو جائیں — کھولوں میں جو آنکھوں کے پوشیدہ اسرار
جان سے جانے پر ہی یہ کھل پائے گا — آویزاں ہے جو میرے سینے میں اظہار
اس کی انگوٹھی میں چمکوں میں نیلم سا — طوؔر اگر وہ دیکھ لے مجھ کو فقط اک بار

...... O ......

O

درد کی دھرتی میں سکھ بیج کا بونا کیا
اک جیسا ہے اب پانا کیا کھونا کیا
اس کی نظر سے ان کی قیمت ہے ورنہ
کایا کی چاندی کیا من کا سونا کیا
مٹھی کھلی ہو مٹھی بند ہو اک سی بات
مٹی کا ملنا کیا مٹی کا گم ہونا کیا
جان کے ٹھکرایا ہو جن کو اپنی انا میں
ان رشتوں پر آنکھیں بھر کر رونا کیا
دل پر دوئی کی کالی لکیر ہو طوؔر تو پھر
آنکھوں کا بجھنا کیا روشن ہونا کیا

☆

O

آنکھیں بھی آنکھوں کے منظر بھی مٹی
رہنے والے بھی مٹی گھر بھی مٹی
چمک رہی ہے ایک نگینے سی دل میں
کیا ہوگی اب اس سے بڑھ کر بھی مٹی
اک ساری پہچان لہو سے ہے ورنہ
اندر بھی مٹی اور باہر بھی مٹی
نقش کہاں تک ڈھونڈیں سبز مرادوں کا
اب تو ان آنکھوں میں سمندر بھی مٹی
دونوں کی تقدیر میں ویرانی ہے طوؔر
بستی بھی مٹی، حملہ آور بھی مٹی

☆

ایک دیا دہلیز پہ رکھا بھول گیا
گھر کو لوٹ کے آنے والا بھول گیا
یہ کیسی بے آب زمیں کا سامنا تھا
خود کو قطرہ ، قطرے کو دریا بھول گیا
میں تو تھا موجود کتاب کے لفظوں میں
وہ ہی شاید مجھ کو پڑھنا بھول گیا
کس کے جسم کی بارش نے سیراب کیا
کیوں اڑنا موسم کا پرندہ بھول گیا
آخر یہ ہونا تھا، آخر یہی ہوا
دنیا مجھ کو اور میں دنیا کو بھول گیا
میں بھی ہوں منسوب کسی کے قتل سے اب
سورج میری چھت پہ چمکنا بھول گیا
وفا کا کھوٹا سکہ کب تک چلتا طورؔ
اچھا ہوا جو اپنا پرایا بھول گیا

...... O ......

عتاب خوردۂ رنج حساب تھا بھی کون
جو میں نہیں تھا تو میرا جواب تھا بھی کون
میں کس کو چُنتا کسے دشمنوں میں کرتا قتل
کہ اس قطار میں بے انتخاب تھا بھی کون
وقار لفظ کی میں کس سے گفتگو کرتا
جو مجھ کو پڑھتا وہ اہل کتاب تھا بھی کون
مجھے یہ فخر کہ مجھ سا ہے اس کے قدموں میں
اسے یہ زعم کہ اس کا جواب تھا بھی کون
حیات طورؔ تھی خود بند پانیوں کا سفر
ہوا پکڑتا تو زیر حباب تھا بھی کون

لذت آساں اور نہ ترک لذت مشکل
ہے طاق پر پڑی ہوئی یہ دولت مشکل
ہر آنے والا لمحہ یہی کہتا ہے
آنکھیں ہیں تو انکار حقیقت مشکل
ساری دنیا تیرے زیر قدم سہی
لیکن سائیں اک دل پہ حکومت مشکل
جب مٹی میں لہو کی تانیں اٹھتی ہیں
تب اک چلّو پانی پہ قناعت مشکل
کب تک سب کے ماتھے پہ سورج رکھو گے
اس اک کام میں ہوتی ہے برکت مشکل
اپنی ذات سے ہی انکار کئے جاتے ہو
پڑ گئی ہے طورؔ تمہیں یہ عادت مشکل

...... O ......

سرسبز بہت شاخ لہو سے نکلی
یہ فصل بھی امکان نمو سے نکلی
ہے چاروں طرف جیسے کہ اک چُپ کی نوا
کیا طرز تھی جو خیمۂ ہو سے نکلی
ہے دور تک اک تیز چمک کی بارش
کیا روشنی سی میرے لہو سے نکلی
اک موج زیادہ تھی فنا ہونے کو
اک عمر کہ کم لحۂ ہو سے نکلی
ظاہر میں ہی مہکانے مری جاں کو طورؔ
انجانی سی خوشبو لب جو سے نکلی

عالم عین
۱۹۸۸

# ''زمین وآسماں کیا کیا''

شمس الرحمان فاروقی
(الہ آباد،بھارت)

**ہمارے** زمانے میں کئی ادیبوں کے نام میں ''کمار'' کالفظ نظر آتا ہے،اورلطف یہ ہے کہ سب کے سب کامیاب ثابت ہوئے اورکچھ،بہت ہی کامیاب ہوئے۔اسے ''کمار'' کا فیض کہا جاسکتا ہے۔کچھ دن ہوئے میں نے کہیں لکھا تھا کہ ''عاصی''تخلص کے کئی شاعر ہمارے یہاں گذرے،لیکن شہرت کسی کونہ ملی۔جن عاصی کوسب سے زیادہ لوگ جانتے ہیں وہ گھنشیام لعل عاصی ہیں،اوران کے بارے میں بھی اتنا ہی جانتے ہیں کہ دلی کے جید شاعر تھے،شاہ نصیر کے شاگرد تھے اورکسی بات پر ان میں اور ذوق میں ان بن ہوئی تھی۔اور یہ ذراسی معلومات کچھ لوگوں کے ذہن میں اس لئے پڑی رہ گئیں کہ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں لکھی ہیں۔گویا انھوں نے گھنشیام لعل کےکلام کونہ سہی،ان کے نام کوزندۂ جاوید کردیا۔

اب ہمارے وقت کے کمار لوگوں کو دیکھئے:

| | |
|---|---|
| نریش کمارشاد | ۱۹۲۷۔۱۹۶۷ |
| شرون کمارورما | ۱۹۳۰۔ |
| پورن کمارہوش | ۱۹۳۵تا۱۹۶۷ |
| کمار پاشی | ۱۹۳۵۔۱۹۹۲ |
| پریم کمارنظر | ۱۹۳۶۔ |
| کرشن کمارطور | ۱۹۳۹۔ |
| پروین کماراشک | ۱۹۵۵(غالباً)۔ |

مجھے پوری طرح یقین ہے کہ جوحشر عاصی تخلص والوں کا زمانے نے کیا وہ ان ''کمار'' صاحبان کے ساتھ نہ کرے گا۔شاعر بے بدل کمار پاشی کی یاد ہمارے دلوں میں اب تک تازہ ہے۔نریش کمار شاد کوکون بھول سکتا ہے؟ آج کل کے بچے ان کا کلام شاید نہ پڑھتے ہوں لیکن ان کی شرح غالب سے تو واقف ہوں گے ہی۔اس فہرست میں مشہور ومعروف افسانہ نگار شرون کمار ورما سب سے معمر ہیں۔اللہ ان کوسلامت رکھے۔اوراگر پروین کماراشک کوچھوڑ دیں تو کرشن کمار طور سب سے کم عمر ہیں۔اللہ ان سب کوسلامت رکھے۔

کرشن کمار طور کو میں کب سے جانتا ہوں؟ میں اس باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔چالیس برس تو ہو ہی رہے ہوں گے،اوران کا کلام اس سے بھی کچھ پہلے سے پڑھتا آیا تھا۔ان کو میں اول اول ایک نہایت نئی طرز کا شاعر سمجھتا تھا،کہ جس طرح بانی اور ظفر اقبال اپنے اپنے طور پر نئی غزل کے خال وخط قائم کررہے تھے،اسی طرح کرشن کمار طوراپنی غزل میں فارسیت کا وہ رنگ لانے کی کوشش کررہے تھے ،نظم میں جس کے سب سے بڑے شاعر ن۔م۔راشد تھے۔پھر،غزل کے نئے مضامین کی تلاش ان کے یہاں ایک مشن،ایک جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اوراس تلاش میں وہ خود غزل کے شعر کو بھی پیچھے چھوڑ جانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ناسخ بچارے تو ہمارے زمانے کے بزرگوں کے وقت سے راندۂ درگاہ تھے،اس لئے ان کا نام کوئی لیتا نہ تھا۔لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ ناسخ،غالب،اقبال،ن۔م۔راشد،یہ سب کسی نہ کسی طرح ایک ہی جنگل کے شیر کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

غالب کا نام سب لیتے تھے،ناسخ کے نام پر سب ناک بھوں سکوڑتے تھے،کہ صاحب کسی اصلی شاعر کا تذکرہ کیجئے ،یہ پہلوان سخن امام بخش پہلوان کہاں سے آگئے؟لہٰذا ناسخ کا نام کوئی نہ لیتا تھا اور ہم لوگ کرشن کمار کوتجریدی غزل گو کہتے تھے۔میرا خیال تھا کہ وہ خاصے سنجیدہ، بھاری بھرکم،کم گو آدمی ہوں گے(یعنی وہ کچھ اس طرح کے ہوں گے جس طرح کے ناسخ محمد حسین آزاد کی کتاب میں جلوہ گر ہیں۔)لیکن جب میں ان سے ملا تو یک گونہ خوشی ہوئی۔کرشن کمار طور بذلہ سنج،محفلوں میں یار باشوں کا دم بھرنے والے،چونچال شخص نکلے۔خوشی کے علاوہ مجھے اطمینان بھی ہوا،کیونکہ ہمارے ہیروؤں بانی اور ظفر اقبال میں یہی ایک صورت مشترک نہ تھی۔ظفر اقبال ایک نمبر کے ہنسوڑ بلکہ جگت پھکڑ،بانی سراسر مقطع اور سنجیدہ۔ان کی غزل میں شاید ہی کوئی شعر ایسا ہو جس پرآپ کوطنز یا ظرافت کا شائبہ ہو۔ذوق اور ناسخ میں بھی یہ فرق تھا۔ناسخ بات بات پر ہنس دیتے تھے،لیکن اپنے استاد شاہ نصیر کے برعکس ذوق کے یہاں تفنن طبع والے شعر کم ہیں۔دور کی کوڑی لانے والے،یعنی دور کا مضمون یا تجریدی مضمون بیان کرنے والے میں ہنسنے کی طاقت ضرور ہونا چاہئے،خود پر بھی اور غیروں پر بھی۔

کرشن کمار طور کی چونچال طبیعت،اور ہر محفل میں جان محفل بن جانے کی صلاحیت شعر کے میدان میں بھی ان کے ساتھ رہتی ہے۔فارسیت کا ذکر میں اوپر کرچکا ہوں،اب ذرا ندرت خیال اور جدید استعارے کی یلغار کا عالم ان چند شعروں میں دیکھئے جوموجودہ مجموعۂ کلام سے پہلے کے ہیں۔ان اشعار میں تجرید اس قدر ہے کہ معنی کے تانے بانے اکھڑنے کا خوف ہونے لگتا ہے۔جو چیز انھیں بچائے رکھتی ہے وہ خیال کی نزاکت ہے،ورنہ غالب کی طرح صہبائے آبگینہ گداز والی بات پیدا ہوسکتی تھی۔

بریدہ ارض وفا اسم زردی زرخیز
حصار مرگ طلب ابجد آسماں بانی
دلوں پہ نرم نظر عکس پارۂ امید
چراغ آئینہ ہر صورت زیاں بانی
اک تو کہ تمام جہان سے ہے تیرا ظہور وجود
اور اک اپنے آپ کو آئینہ دکھانے والا میں

کچھ بھی تو اک سانہیں ہے تیرے میرے بیچ
تو ہے ہمیشہ تیرا ہونا ذرا سی دیر
کوئی جگہ مرے دل کے سوا تھی کب محفوظ
میں دہر میں ترے درد کا خزانہ رکھتا کہاں
مری جبیں کوضرورت تھی اس کے گھر کی طُور
میں اس سے بڑھ کے کوئی اور ٹھکانہ رکھتا کہاں

جیسا کہ ان اشعار کے سرسری مطالعے سے ظاہر ہی ہو گیا ہوگا، شاعر کی استعاراتی تلاش اسے کہیں کہیں زبان اور کبھی کبھی بحر تک کا سانچا توڑنے کے جوکھم تک لے آتی ہے۔الفاظ کا استعمال بے تکلف ہے، ان میں معنی سے زیادہ وہ انسلاکات اہم ہیں جو شاعر کے تخیل میں روشن تھے لیکن الفاظ کے جامے میں (یا الفاظ کی نقاب میں) کچھ دھندلے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بقول بیدل ؎

اے بسا معنی کہ از نامحرمی ہائے زباں
با ہمہ شوخی مقیم پردہ ہائے راز ماند

معنی اور لفظ کے درمیان یہی کشمکش کرشن کمار طُور کی غزل کو ایک خوشگوار لیکن اجنبی وقوعہ بنا دیتی ہے۔ ان کا ہر مجموعہ گذشتہ سے بڑھ کر بلند کوش اور حیرت خیز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دن پہلے ان کے دو مجموعے میرے ہاتھ آئے تو میں نے سمجھا کہ نئی دولت ہاتھ آئی۔ غزلوں کا مجموعہ ''غرفۂ غیب'' کوئی ڈیڑھ سو غزلوں کا مختصر مجموعہ ہے۔ مختصر اس لئے کہ ہر غزل میں شعروں کی تعداد سات سے متجاوز نہیں۔ یہ مجموعہ مختصر اس لئے بھی لگتا ہے کہ کرشن کمار طور اب تک جیسے تجریدی اور فارسیت سے باوزن شعر کہتے آئے تھے، اس طرح کے شعروں کو انھوں نے فی الحال ایک طرف رکھ دیا ہے اور ایک نئی راہ اختیار کی ہے۔ ممکن ہے یہ بڑھتی ہوئی عمر کا اثر ہو، یا ممکن ہے عمر کی پختگی کے ساتھ اب ان کی نگاہ روزمرہ کی چیزوں پر پڑنے لگی ہے اور وہ ان باتوں کو روزمرہ، بلکہ بول چال کی زبان میں بیان کرنے لگے ہیں۔ یہ غزل جسے میں درج ذیل کر رہا ہوں، ڈرامائی بیان، خود کلامی، اور زبان کی بے تکلفی بنا پر ایک شاہکار بن گئی ہے۔ لگتا ہے اس غزل کے شاعر کو اب کوئی مضمون، کوئی کیفیت، روک نہیں سکتی ؎

بہت کہا تھا سخنوروں میں گذر نہ کرنا
بہت کہا تھا کہ بات سننا مگر نہ کرنا
بہت کہا تھا کہ ڈوبنے کا ہے ڈر زیادہ
بہت کہا تھا کہ پانیوں کا سفر نہ کرنا
بہت کہا تھا کہ تم اکیلے نہ رہ سکوگے
بہت کہا تھا کہ ہم کو یوں دربدر نہ کرنا
بہت کہا تھا وہ تم کو پہچانتا نہیں ہے
بہت کہا تھا تم اس کو اپنی خبر نہ کرنا
بہت کہا تھا کہ رابطوں کو دراز رکھنا
بہت کہا تھا محبتیں مختصر نہ کرنا
بہت کہا تھا کہ اجنبی تو پھر اجنبی ہیں
بہت کہا تھا کہ اوروں کو ہم سفر نہ کرنا
بہت کہا تھا زمیں سے رشتہ نہ طُور ٹوٹے
بہت کہا تھا فلک کو زیر اثر نہ کرنا

یہ غزل اپنے لہجے، زبان کی صفائی، روانی اور معنی کے ابہام کے سبب سے رنگ وسنگ میں شاہکار ہے۔ لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے۔ ہر مصرع ''بہت کہا تھا'' سے شروع ہوتا ہے، لیکن ہر مصرعے میں نئی بات کہی گئی ہے۔ ایسی قدرت کلام اس زمانے میں کم دیکھی گئی ہے۔ بادی النظر میں یہ غزل مسلسل معلوم ہوتی ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ یہ مسلسل نہیں ہے۔ ہر شعر میں زندگی کے کسی نئے، کسی بدلے ہوئے ہوئے منظر کا بیان ہے۔ تخاطب، اور مخاطب، اور خطاب کرنے والا، تینوں مل کر تقریباً ہر شعر میں نیا منظر نامہ اور معنی کے نئے امکانات پیدا کرتے ہیں۔ اس غزل میں انسانی حیات اور انسانی المیے کے کئی پہلو منعکس ہو رہے ہیں۔

کرشن کمار طُور کے یہاں خیال کی شدت اکثر ان کے شعر کو صرف مشکل ہی نہیں، سست رو کر دیتی تھی۔ شروع شروع میں زیب غوری کا بھی یہی انداز تھا۔ بانی کے بعد زیب غوری ہی وہ شاعر ہیں جو پیکر تراشی اور خیال کی بے لگام بلندی کے باعث کرشن کمار طور سے کچھ مشابہ نظر آتے ہیں۔ اسی زمانے میں صلاح الدین محمود کی کچھ نظموں میں الفاظ کی وہی ندرت نظر آتی تھی۔ بعد کے لوگوں میں افضال احمد سید کی غزل میں کرشن کمار طُور کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی: وہی فارسیت، وہی تجرید، رنگوں اور کیفیتوں پر وہی زور۔ لیکن کرشن کمار طور کے یہاں آہنگ کا تنوع بہت تھا (اور اب بھی ہے)۔ وہ کبھی کبھی تو لفظوں سے زیادہ بحروں سے نبرد آزما لگنے لگتے تھے۔ ان غزلوں میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعر نے آہنگ سے زیادہ بات کو متنوع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اب کی غزلوں میں خاص کر گفتگو، یا خود معشوق سے بھی ذرا کھل کر بات کر لینے کا حوصلہ نظر آتا ہے ؎

جو اماں جان کی پاؤں تو یہ پوچھوں اس سے
وقت اور کتنا لگے لگا تری دلداری میں
اک فقط تم پہ ہی موقوف نہیں طُور یہاں
مبتلا اور بھی ہیں عشق کی بیماری میں
اک لمحے میں بس قفل لگا دل پہ ہمارے
اک لمحے میں ہم نرغۂ اغیار میں آئے
ہے یہ تو خبر ختم پہ ہے دشت ہوس طُور
تیزی بھی تو اب اس مری رفتار میں آئے
زندہ رکھنا ہے تو پھر زندہ رکھے
اک یہی بات خدا سے پوچھیں
یہی دنیا ہے تو کیا دنیا ہے

خود سے پوچھیں کہ خدا سے پوچھیں

ان اشعار میں کرشن کمار طُور کا اسلوب غزل ایک نیا، طنزیہ، پہلے سے زیادہ خود آگاہ رنگ کا اظہار کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ رنگ بدلنے کی یہ کوشش شعوری ہو، لیکن میرا خیال ہے کہ جس طرح کی غزل کرشن کمار طور اب تک کہتے آئے تھے، اس میں بات کی صفائی اور لہجے کی بے تکلفی کا امکان پہلے سے تھا۔ یہ امکان اب بروئے کار آنے لگا ہے۔ ان اشعار کی تشکیل میں طباعی اور تھوڑی شگفتہ مزاجی بھی شامل ہوگئی ہے۔

اسے تو اور طریقے سے ہے وفا مطلوب
ہم اپنا یار کسی اور طرح چاہتے ہیں
خدا کے نام پہ حسن بتاں سے کیا حاصل
نہ کام آئے تو رطل گراں سے کیا حاصل
ہیں آنکھیں خشک مگر خون رونا چاہتے ہیں
جہاں میں میری طرح سارے ہونا چاہتے ہیں
تلاش اس کی ہے جو اپنی دسترس میں نہیں
ہمارے پاس ہے جو اس کو کھونا چاہتے ہیں
اب اس پہ ہے موقوف نظر ڈالے نہ ڈالے
اک رقعۂ پر آب اسے بھیجا ہوا ہے
دل کی سر سبزی پر یقین آیا
دیکھا طوطوں کو اک قطار میں جب
جان مانگی ہے اس نے عشق میں طُور
کچھ نہیں میرے اختیار میں جب
خود اپنے آپ کو ہم نے دیئے دُکھ
وہ کیا رسی تھی جو زنجیر کردی
وہ دیکھتا ہوں جسے دیکھنے کی خواہش ہے
میں اپنی آنکھ سے اس ہجر کو وصالتا ہوں

ان اشعار کی خوبی محض ان کے مضمون میں نہیں۔ ان کی اصل خوبی لہجے کی لطافت اور بے تکلفی ہے۔ شروع کے کرشن کمار طور کے کلام میں ایک تناؤ، ایک کھنچاؤ کا احساس ہوتا تھا۔ اب اس کی جگہ ایک آزادی، ایک روانی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زبان کے ساتھ بعض ایسی بے تکلفیاں وہ اب بھی روا رکھتے ہیں جن کی ان جیسے مشّاق سے توقع نہیں ہوسکتی۔ مثلاً اس غزل میں ''قابو، ہو، جو'' جیسے قافیوں میں واؤ کا سقوط روانی کو اس درجہ مجروح کر دیتا ہے کہ شعر کو آسانی سے پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بہت دنوں پہ یہ موج قابو آتی ہے
نفی نوید میں کیا لذت ہو آتی ہے

''نفی'' کو ''نظر'' کے وزن پر موزوں کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بے تکلفی اور آزادی کا یہ اسلوب کچھ بہت پسندیدہ نہیں۔

کرشن کمار کی دوسری کتاب جس کے بارے میں چند لفظ کہنا چاہتا ہوں، حمد اور نعت اور سلام کا چھوٹا سا مجموعہ ہے۔ کرشن کمار طور کے دل کا خلوص اور مزاج کی وسعت اور ان کی سلامتی طبع اسی بات سے نمایاں ہے کہ وہ اپنے پیش لفظ میں کہتے ہیں: ''زیر نظر میری حمدیں، نعتیں اور سلام اس بات کی عین گواہ ہیں کہ میرا باطن رب العزت کے حکم سے روشن ہے۔'' یعنی یہ شعر محض اس لئے نہیں کہے گئے کہ اردو میں پرانا دستور رہا ہے (اور یہ اب بھی باقی ہے) کہ ہم لوگ مذہب اور پیدائشی عقیدے کی پروا کئے بغیر آپس میں محبت کے ثبوت کے طور پر اور کائنات میں ایک ہی خدا کے وجود کے اعتراف کے طور ایک دوسرے کے بزرگوں، محترم اور مقدس ہستیوں کی شان میں نثر و نظم لکھتے رہے ہیں۔ یہ رسم صرف صوفیوں میں نہیں ہے، اگر چہ صوفی اس کے سب سے نمایاں علم بردار رہے ہیں۔ مجھے حضرت شاہ نیاز بریلوی اور شیخ غلام حسین ایلچ پوری کے یہ شعر کبھی نہیں بھولتے۔ شاہ نیاز فرماتے ہیں۔

گہ شعلۂ نورے شدہ بر طور بر افتاد
تا خلق بترسد
گہ نار شدہ صورت گلزار بر آمد
بشگفت وریاں شد
گہ مصحف وقرآن گہے بید پران است
گہ دانۂ تسبیح
گہ تار شدہ صورت زنار بر آمد
از کفر نشاں شد

شیخ غلام حسین ایلچ پوری کہتے ہیں۔

تو کر آرام من کے رام سوں ہو رام رم مت کر
رما اس ایک کوں مالا سو ہر ہر رام بھجنا کیا
کعبے میں وہ روضے میں و زمزم میں و کوثر میں و
کاسی میں کیا تیرتھ میں کیا گنگا میں کیا جمنا میں کیا
کہیں دیول کہیں پوجا کہیں تیرتھ کہیں گنگا
کہیں مالا کہیں دھوتی کہیں زنار پرگھٹ ہے

(مثنوی ''یک رنگ نامہ'' کے دو اشعار)

یو دونوں جھنے ایک جاگہ سوں آئے
جگت میں مسلمان ہندو کہائے
گھڑا ہے کمھار ایک ماٹی کے بھانڈے
ہوا کون ملاں ہوا کون پانڈے

ان باتوں کو دیکھتے ہوئے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوتی جب میں کثرت سے غیر مسلم مصنفوں کو اسلامی بزرگوں اور نفوس قدسیہ کی توصیف وثنا، اور

مسلمان مصنفوں کو ہندو نفوس قدسیہ کی توصیف وثنا کرتے دیکھتا ہوں۔ حیرت تو تب ہوتی ہے جب میں کرشن کمار طور کو سلام کے آداب نبھاتا دیکھتا ہوں۔ ہر صنف کی طرح سلام کے کے بھی تقاضے، قاعدے، اور اصول ہیں۔ ان سے جب تک واقفیت نہ ہو، شاعر کو سلام کہنا درست نہیں، کیونکہ کئی طرح کے سہو کا امکان رہتا ہے۔ مدت ہوئی میں نے لکھنو کی ایک محفل سلام کے لئے مصرع طرح پر ایک چھوٹا سا سلام کہا تھا۔ میری تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں سلام، نوحہ وغیرہ بالکل نہ تھے۔ لہٰذا میں نے جو سلام کہنا شروع کیا تو ایک شعر یہ بھی کہہ ڈالا۔

کربلا تو ہے وہ زمین شوم
خون خورشید جس کی خاک میں ہے

نیر مسعود نے مجھ سے کہا کہ کربلا کی زمین تو مقدس ہے، اسے ''شوم'' کہنا ٹھیک نہیں۔ میں اپنی غلطی پر متنبہ ہوا اور میں نے مصرع یوں بدل دیا۔

کربلا تو ہے وہ زمین پاک

سلام سنانے سے پہلے میں نے اپنی اصلاح کر لی تھی، ورنہ بھری محفل میں لوگ خدا جانے کیا تاثر میرے بارے میں قائم کرتے۔

کرشن کمار طور کا معاملہ یہ ہے کہ وہ سلام کے آداب سے واقف ہیں۔ ان کی زبان اور لہجے میں جدیدیت کے تمام تقاضوں کا خیال رکھا گیا ہے، لیکن مضمون کے لحاظ سے انھیں خوب معلوم ہے کہ کون سے مضمون باندھنا چاہیئے۔ اس لحاظ سے وہ مجھے عرفان صدیقی کی یاد دلاتے ہیں کہ اس زمانے میں حضرت علی کی سب سے اچھی منقبتیں، یا حضرت علی پر سب سے اچھی نظمیں، عرفان صدیقی نے لکھی ہیں۔ اب چند شعر کرشن کمار طور کے سلاموں سے سنا کر آپ سے رخصت لیتا ہوں۔

اس کے حوالے سے ہے فقط میری پہچان
کاتب جو بھی ہو میری تقدیر حسین
صف در صف ہے چہرہ روشن لالہ صفت
دل کے داغوں کی ہے اک جاگیر حسین
برے کو جو ہے نسبت تو شمر سے
جو اچھا ہے وہی اچھا حسینی
چھپائے پھرتے ہیں اب اپنے اندر
زمین و آسماں کیا کیا حسینی
یہ اختیار ودیعت انھیں خدا نے کیا
متاع عشق جبیں در جبیں حسین حسین

اگر چہ ان سلاموں میں سلام کی ایک شرط نہیں پوری ہوئی ہے، کہ کسی شعر میں، یا شروع میں لفظ ''سلام'' یا لفظ ''مجرئی'' آنا چاہیئے، لیکن اب اس شرط کی تکمیل پر کچھ ایسی سختی بھی نہیں کی جاتی۔ میں کرشن کمار کے ان سلاموں کو جدید صنف سلام میں ایک اہم اضافہ قرار دیتا ہوں۔

## ''غیبی آواز''

مختلف مذاہب کے مطالعات کی روشنی میں جب ہم فلسفہ حیات اور حقائق حیات کی تفہیم و تعبیر کی کوشش کرتے ہیں تو شعور ہمیں ایک ایسی دنیا کی طرف لے جاتا ہے جو ہمارے فہم و ادراک کی وسعت سے بہت دور کہیں ایک گہری دھند میں واقع ہے۔ اس روئے زمین پر ہر زمانے میں عوام الناس سے الگ کچھ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنہیں اس دنیا کی فریب کاری اپنے حصار میں نہیں لے پائی۔ یہ لوگ اس زندگی سے پہلے کی زندگی اور یہاں کے بعد کی زندگی سے آشنا تھے۔ ظاہری دنیا کے سفر کے دوران یہ باطنی دنیا سے ہمہ وقت وابستہ رہے۔ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ دریچہ غیب ان کے ادراک پر کھل گیا تھا۔ کرشن کمار طور کی شعری کائنات غیبی تجلیات سے معمور ہے۔ شاعری کے تعلق سے آفاقی شہرت یافتہ فلسفی اور مفکر افلاطون کا کہنا ہے کہ شاعر کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ گردوپیش میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات وحادثات کو شعری قالب میں ڈھال کر شاعر دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ کرشن کمار طور کے ساتھ بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ کوئی غیبی دریچہ اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ چنانچہ اپنے قرب وجوار کی دنیا سے بے نیاز ہو کر وہ اس نورانی آواز کو شعور کی آنکھ سے دیکھ بھی رہا ہے اور محسوس بھی کر رہا ہے۔ بلا اشتباہ ان کے اشعار میں فنی کشش بھی ہے اور تخلیقی عمیقیت بھی۔

**مراق مرزا** (ممبئی، بھارت)

## ''جدید طرزِ احساس''

کرشن کمار طور کا مزاج ہم عصر شعراء سے کچھ مختلف ہے، وہ بلا شبہ غلامی کے دور میں تولد فرما ہوئے لیکن انہیں جوانی کے آغاز میں ہی آزادی کی نعمتوں کو پھلتے پھولتے دیکھنے کی سعادت میسر آئی، اسی لیے ان کی غزل میں زندگی سے ان کا فکری اور شعوری سلوک اور ذہنی رویہ اوروں سے کچھ مختلف ہے۔ غزل کرشن صاحب کی پسندیدہ صنف ہے اس میں وہ روایت سے جڑے ہوئے تو ہیں مگر ان کا طرز احساس جدید ہے۔ وہ اپنی تخلیقی ندرت وجدت نمایاں کرنے کے لیے شعر میں کلیدی الفاظ کو سمونے اور برتنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ عامی انداز رکھنے والی باتیں بھی اُن کی غزل میں اتنے سلیقے سے موزوں ہو جاتی ہیں کہ قاری کو تازہ خبر معلوم ہوتی ہے۔

**رومانہ رومی** (کراچی)

# ''وہ کیسے رشتے تھے''

اسلم حنیف

(بدایوں، بھارت)

آج کی اردو شاعری میں تین رجحانات نمایاں صورت میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ پہلا روایت پسندی کا رجحان جس میں عروض و بلاغت اور ماضی کی فنی قدروں کے تسلسل و تحفظ پر اصرار ملتا ہے۔ دوسرا رجحان قدیم شعریات سے انحراف اور جدیدیت کے ضابطوں اور دانش حاضر کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کو اپنا منتہا و مقصود تصور کرتا ہے۔ تیسرا رجحان اعتدال پسندی کی راہ پر گامزن ہے جس کی شاعری فنی پہلوؤں اور روایتی خوبیوں کے احترام کے ساتھ جدیدیت کے عناصر کو بھی اہمیت عطا کرتی ہے۔

ہم عصر اردو شعراء میں جناب کرشن کمار طورؔ کو اگرچہ جدیدیت کی تحریک کے اہم اور قدآور شعراء میں شامل کیا جاتا ہے لیکن حقیقتہً وہ متذکرہ تیسرے رجحان کے نمائندہ فنکار ہیں۔ وہ بحر و آہنگ اور عروض و فن کے مسائل سے گہرا شغف رکھتے ہیں، کلاسیکی شعری نزاکتوں سے آگاہ ہیں۔ جدیدیت کی تحریک سے وابستگی کی بناء پر شاعری کے عالمی رجحان سے ہم آہنگی کا جذبہ فزوں تر ہے اس لئے روایتی ورثے پر اعتماد اور فن کے تجرباتی پہلوؤں اور حسیاتی تجربات کے اشتراک نے ان کی غزل کو فکر و فن کے اعتبار سے پختہ اور اسلوبیاتی سطح پر جدیدیت کی حامل بنا دیا ہے۔

قدیم شاعری میں مسلسل استعمال ہونے والے استعارات، علامات، الفاظ و تراکیب معنیاتی سطح پر تاثر و نفوذ کی کیفیت کھو چکے ہیں اس کی اہم وجہ یک رُخے پن کی تکرار اور نسبیت کے عمومی رنگ کی بازگشت سوا اور کچھ نہیں۔ جناب طورؔ نے قدیم لفظیات و موضوعات کو محدود دائروں سے نکال کر معانی و مفاہیم کی نئی نئی جہات سے روشناس کرانے میں جس بلند کردار کو نمایاں کیا ہے اس کی چند مثالیں ان کے زیر بحث تازہ مجموعۂ غزلیات ''رفتہ رمز'' سے پیش کی جا رہی ہیں۔

اک اس کے چہرے کے آگے ہے زرد ماہ مبیں
اور اس کی زلفوں کے پیچھے ہے رنگِ شام تمام

یقیں کے پردے میں اک احتمال خلق کیا
وہ کون شخص تھا جس نے وصال خلق کیا

بس اک جنوں ہی انالحق کی دیتا ہے آواز
یہ موجِ عشق بھلا ہے کہاں زمیں پیوند

میں کیسے بندِ قبا کھولوں اس کے، وحشت میں
کہ دل کی آگ یہاں کم وہاں زیادہ ہے

بدن کو کاٹتی ہے لحہ لحہ
بلا کا زور ہے موجِ ہوس میں

ناکام عشق ہوتے بھی ہیں کیا شفق جبیں
راہِ وفا میں کھینچا ہے یہ انتظار کیا

جو چاہو سمجھو اسے رشتہ وفا کہ گماں
مرا بہار میں آمادۂ سفر ہونا

ہمارے خون سے اس کی ہتھیلی لال ہے طورؔ
اڑا رہا ہے جو رنگِ حنا ہر اک جانب

ہوں جانے کون سی منزل پہ تابِ دید کی میں
کہیں جھکاتا ہوں آنکھیں کہیں اٹھاتا ہوں

یہ اس کی تمکنت اس نے سنا نہیں کچھ بھی
یہ میرا عجز کہ میں نے اسے کہا سب کچھ

ان اشعار میں ماہ جبیں، زلف، چہرہ، وصال، جنوں، اناالحق، عشق، بندِ قبا، وحشت، ہوس، جبیں، راہِ وفا، ہتھیلی، رنگِ حنا، تابِ دید، تمکنت اور عجز جیسے الفاظ اور تراکیب قدیم شاعری سے ماخوذ ہیں مخصوص موضوعات و محدود تصورات و معاملات کے مظہر یہ تخلیقی استعارے مشینی پُرزے نہیں ہیں بلکہ ان کے پس منظر میں انفرادی اور اجتماعی احساسات اور تہذیب و نفسیات کے حوالے بھی سانسیں لیتے ہیں۔ بیسویں صدی کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات نے زندگی اور معاشرے کے تمام منظر نامے کو بدل کر رکھ دیا ہے جس کے واضح اثرات تخلیقی و تنقیدی ادب پر بھی پڑے ہیں اور ترسیل و اظہار میں جو نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان میں مروّج شعری زبان کے نت نئے امکانات کی تلاش کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ ظفر اقبالؔ نے اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی آزاد روی کا ثبوت دیا ہے انہوں نے لسانی اور فنی اصولوں کے خلاف جس اجتہادی رویے کو پروان چڑھایا ہے، اس سے زبان و محاورہ اور الفاظ و تراکیب میں

وسعت وکشادگی کے احساس کے باوجود بہت سے مقامات پر شدید حبس کا شکار بھی ہونا پڑتا ہے۔اس عمل کو جن دوسرے شعراء نے زیادہ محتاط رہ کر انجام دیا ہے ان میں جناب فضا ابن فیضی اور کرشن کمار طور کے نام کافی اہم ہیں۔ان شعراء نے اپنی شعری بوطیقا کی تدوین کے لئے جہاں قدیم وتکراری الفاظ وتراکیب کو معانی کے نئے پیرہن عطا کئے ہیں وہیں نئی لفظیات کے استعمال پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اس طرح نئی شاعری میں اشتراک وامتزاج کا تخلیقی عمل صرف زبان کی نامیاتی حقیقت کے اظہار تک محدود نہیں رہتا بلکہ اپنے عہد کی تبدیلیوں اور تبدیلیوں کے محرکات کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

متذکرہ تمام اشعار کا مطالعہ جہاں ''رفتہ رمز'' کی غزلیات میں فکرو فن کی پختگی، روایت سے استفادے اور قدرتِ بیان کو سحر آفریں فضا میں داخل کر دیتا ہے وہیں آج کے کربناک ماحول سے دوچار انسان کے ذوقِ جمال کو متحرک کر کے کچھ دیر کے لئے حظ ومسرت کے لمحات سے ہم رشتہ بھی بنا دیتا ہے۔عشقیہ اور رومانی اندازِ فکر کے حامل ان اشعار کا دوسرا معنوی پہلو طالب ومطلوب کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات، وارداتِ قلب کے متصوفانہ اظہار اور شاعر کی بعض نفسیاتی گرہوں کا بھی نقیب نظر آتا ہے اس سلسلے میں چوتھا شعر پھر سے مطالعہ کیجیے جس میں لفظ وحشت کو اساسی اہمیت حاصل ہے جس کے معنی دیوانگی، پاگل پن، اور انتہائے عشق ومحبت کے بھی ہیں۔اردو غزل میں اس کا استعمال عشقیہ موضوعات سے مختص رہا ہے لیکن آتش نے اسے حب الوطنی کے موضوع سے متعلق کر کے اپنی جودتِ طبع کو مظاہرہ کیا ہے۔

رگڑوائیں یہ مجھ سے ایڑیاں غربت میں وحشت نے
ہوا مسدود رستہ، جادۂ راہِ وطن بگڑا

اور لفظ وحشی کو ''بوئے گل'' کی تشبیہ سے وابستہ کر کے نئے معنی کے بازیافتی عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

پہلے شعر میں ایڑیاں رگڑنے کی مناسبت سے وحشت کا لفظ معنی خیز ہے۔وطن لفظ قافیہ ہے اور اس کی رعایت سے پہلے مصرع میں غربت کا لفظ لایا گیا ہے۔ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شعر کا معنوی پہلو تراکیب کی خوبی، بندش کی چستی اور لفظی صنعت گری تک محدود رہ جاتا ہے لیکن انہیں محاسن کی سطح سے نیچے اترنے پر معنی ومفہوم کی ایک نئی کائنات آباد نظر آتی ہے۔اس کیلئے ہمیں ''جادۂ راہِ وطن'' کی ترکیب پر غور کرنا چاہیے۔اساتذۂ فن شعر کی تعمیر وتشکیل کے لئے کسی بھی لفظ کے بے محل یا بے وجہ استعمال کے قائل نہیں تھے اس لئے ہم آتش سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ انہوں نے مصرع ثانی کی تخلیق میں ''جادہ'' کا لفظ صرف وزن کی خانہ پوری کے لئے استعمال کیا ہے۔اگرچہ شاعری میں ''جادہ'' اور ''راہ'' کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جادہ کے معنی پگڈنڈی کے ہیں جو راستے یا سڑک کی نسبت پتلی بھی ہوتی ہیں اور انہیں سے پھوٹ کر دیہات کی جانب مڑ جاتی ہیں۔اس تناظر میں ''جادہ راہِ وطن'' کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔اب شعر میں راستہ کو شہر اور جادہ کو گاؤں یا بستی کا استعارہ قرار دیا جائے تو وحشت کے معنی ''جذبہ حب الوطنی'' کی انتہائی ''کیفیت'' کے اور کیا ہوں گے؟ شاعر جو معاش کے سلسلے میں بستی چھوڑ کر شہر میں زندگی گزار رہا ہے۔عالم غربت میں جذبہ حُب الوطنی کی انتہائی کیفیت نے اسے ایسی نزعی حالت میں مبتلا کر دیا ہے کہ وطن کی طرف جانے والی شاہراہ مسدود اور اہم ومخصوص راہ سے پھوٹنے والی وہ پگڈنڈی جو وطن (بستی) کی طرف جاتی ہے ملیا میٹ ہو کر رہ گئی ہے۔وطن سے مہاجرت، مہاجرت کی لاحاصلی اور وطن پرستی کے حوالے سے یہ شعر آج کی شاعری سے مختلف نہیں ہے۔

دوسرا شعر بھی کم وبیش اسی مفہوم کی عکاسی کرتا ہے مگر شعر کی معنوی روح مماثلتی تمثال کاری میں سمٹ آئی ہے۔وحشت کے مختلف معانی میں انتہا کا عنصر ضرور پوشیدہ رہتا ہے جبکہ آتش نے وحشی کو بوئے گل کے مشابہ قرار دیکر وحشت میں شدت کے عنصر کی جگہ قدرت وملائمیت کے عناصر کو عطا کر دی ہے جس کے پیش نظر اس شعر کو اردو شاعری میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے۔قطع نظر اس کے اب طور صاحب کا شعر پڑھئے

میں کیسے بند قبا کھولوں اس کے، وحشت میں
کہ دل کی آگ یہاں کم وہاں زیادہ ہے

یہاں وحشت کا لفظ ایک ایسے مقام پر وارد ہوا ہے کہ اگرچہ جذبۂ وصل میں انتہا کے عنصر کو شامل کر دیا جائے تو دل کی آگ کی زیادتی کی مناسبت سے مراد محبوب کی وحشت ہوگی اور اگر کیف آمیز جذباتی کیفیت کو وحشت کا مترادف قرار دیا جائے تو خود شاعر اس لفظ کے دائرے میں سمٹ آتا ہے۔محبوب پر وحشت کے اطلاق سے عورت کے جذبۂ وصال کی اُس نفسیاتی حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے جو ایسے لمحات میں شعور وحیا کی تمام حدوں کو منہدم کر دیتی ہے۔اس کے برخلاف شعر کے دوسرے معنی شاعر کے وصل کے پہلے تجربے کی نشاندہی کرتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وصل کے حقیقی مفہوم کی ادائیگی کے وقت شاعر کے لاشعور میں چھپا خوف عود کر آیا ہے اور وہ سرور وخوف کی کشمکش کا شکار ہو کر پکار اُٹھتا ہے ''میں کیسے بند قبا کھولوں اس کے وحشت میں؟'' اسے ہم عشق حقیقی سے پیدا ہونے والے بانجھ پن سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔طور صاحب کے پیش کردہ دیگر تمام اشعار کی تشریح میرا مقصود نہیں ہے۔البتہ ان کے ایک شعر کے تعلق سے یہاں صرف اس بات کا اظہار ضروری تھا کہ انہوں نے روایت کے احترام کے ساتھ اپنی انفرادی سوچ سے شاعری میں خوشگوار توسیع کے رویے کو بھی پروان چڑھایا ہے۔

جناب کرشن کمار طور نے فکری اور تخلیقی سطح پر جدیدیت کو ایک حاوی

عنصر کے طور پر قبول کیا ہے اس لئے ان کے یہاں اس تحریک کے نمایاں اثرات موجود ہیں۔

وہ آستاں ہو کہ میری جبیں یہ دونوں ہی
بہت دنوں سے ہیں تنگِ یقیں یہ دونوں ہی

جب کسی سے نہ ہو لگاؤ نہ لاگ
اپنے گھر کو مکان جانیے گا

اور کسی کی خود کے سوا پہچان نہیں ہے
یہ کیسا سودا ہے میرے سر کے اندر

مرے سپرد ہوا ہے بس ایک کارِ زیاں
مری نظر میں کفِ خاک جاں زیادہ ہے

موجود ہوں خواب سے بنا ہوں
اک عکس سراب سے بنا ہوں

میں زندگی میں کہاں تک لہو کروں دل کو
کہ میری جان کی ہے یہ ''الم سرا'' بنیاد

وہی ہے حاصلِ عمر اب کہ جو ہے لاحاصل
میں زیست بس اسی تقسیم میں گزارتا ہوں

کنارِ دشت میں پہلے تو گھر نکلتا ہے
قدم اٹھاؤں تو تازہ سفر نکلتا ہے

ردائے شب میں ہے صفر آفتاب بود نبود
وہی ہے شرحِ نمودِ کتاب بود نبود

میں خود ہی جادۂ ختم سفر میں حائل ہوں
اتر بھی جائے کہیں اب یہ راستہ چپ چاپ

مہر و وفا کے فقدان، خود غرضی سے رشتوں کی قلبِ ماہیت، انا پرستی، زندگی کی لایعنیت، اردگرد پھیلی ہوئی شیطانیت، جستجو کی لاحاصلی، فریب ہستی، منزل کی رسائی کا دھوکا اور منزل تک رسائی میں اپنے ہی وجود کا حائل ہونا فنکار کے ایسے جنسی تجربات ہیں جو زوالِ عصر کی جزئیاتی نقش گری کرتے ہیں اور ان جزئیات کو یکجا کرنے پر آج کے اجتماعی شعور پر پڑنے والے اذیت ناک خراشوں سے اور آج کے ماحول کی ایک واضح شکل مرتب کی جاسکتی ہے۔

اسلوبیاتی سطح پر یاسیت، تشکیک اور خوف و ہراس کی لے میں طوؔر صاحب کی ہجرت کا وہ تلخ تجربہ بھی شامل ہے جسکی کسک اس شعر کی سطح پر موجود معنی ادراک سے ممکن نہیں۔

خدا ان کو سلامت طوؔر رکھے
ہیں کچھ لاہور میں دلدار میرے

بلکہ مذکورہ شعر کو ذیل کے شعر کے ساتھ پڑھنے پر ہند و پاک کی تقسیم اور تقسیم سے پیدا ہونے والے انسانیت سوز واقعات کے ساتھ ان پر طاری وطن اور اہلِ وطن کے چھوٹ جانے کا شدید احساس بھی پوری شدت کے ساتھ ابھر آتا ہے۔

وہ کیسے رشتے تھے ہم نے جنہیں مٹا ڈالا
تھے کیسے لوگ جنہیں ایک پل میں خواب کیا

گزشتہ صدی کی ابتدا ہی جنگ عظیم سے ہوئی تھی، جنگ عظیم سے برصغیر کے دو حصّوں میں بٹنے تک کی انسانی تاریخ کا ہر لحہ طاقت کے جبر اور استحصال و خونریزی کے مسلسل واقعات سے سیاہ نظر آتا ہے بات اگرچہ یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ نئے میلینم کی ابتداء بھی طاقت کے مظاہروں کے احیاء اور ظلم و تشدد کے سفر کی کہانی کو آگے بڑھانے میں مصروف ہے لیکن قطع نظر اس کے ان حالات واقعات نے عالمی سطح پر اقدار و روایات، تہذیب و ثقافت، سیاست وتمدن، معاشرت ونفسیات پر جو بُرے اثرات مرتسم کئے ہیں وہ کسی باشعور اور حساس ذہن کے لئے قابلِ تسلیم وفخر نہیں ہیں۔ شاید انہیں حالات وواقعات نے وجودی فلسفے کے منفی پہلوؤں کو بہت طاقتور انداز فکر اور پختہ تصور کے روپ میں جدیدیت کے علمبرداروں کی طرف منتقل کر دیا تھا اور نتیجۂ حیات و کائنات اور طبیعات و مابعد طبیعات کے رشتوں اور ان کے مثبت پہلوؤں پر نفی وتشکیک کے عناصر کا غلبہ فطری امر تھا۔

میں لکھ چکا ہوں کہ اگرچہ طوؔر صاحب جدیدیت کی تحریک سے زبردست ذہنی وابستگی رکھتے ہیں لیکن وہ اس ادبی دھارے سے شعوری یا لاشعوری طور پر جڑے نظر آتے ہیں جسے امتزاجی دھارا قرار دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان کا شعری رویہ انہیں جہاں سے خالص جدیدیت پسند ہونے سے بچالیتا ہے وہ ہے زندگی اور مابعد الطبیعاتی مسائل نیز معاشرتی سطح پر انکا مثبت ذہنی و تخلیقی انداز فکر ونظر۔ اس سلسلے میں ''رفتہ رمز'' سے اگرچہ بے شمار اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں مگر یہاں صرف چند شعر ہی پیش کر دینا کافی ہیں۔

حصولِ شوق جہاں میں اگر سلامت ہے
تو پھر یہ بازو نہیں، آستیں نہیں نہ سہی

یہاں فزوں غم و آلام ہیں جہاں بھر کے
ہمارے دل کا یہ آنگن بہت کشادہ ہے

نہیں تھا سامنے میرے مگر رہا موجود
تمام دنیا تھی غائب بس ایک خدا موجود

نوید دیتا ہوں دنیا کو اپنے ہونے کی
زمیں کی خاک سے سورج جبین نکالتا ہوں

اٹھ رہے ہیں قدم یہ کس جانب
سر بسر خاک زیرِ پا روشن

تمام کون ومکاں میری دسترس میں ہیں
ہے میرے واسطے اب تو مرا خدا سب کچھ

ہے میرے ماتھے کی تقدیس میرے سجدوں سے
چمکتا رہتا ہے میرا خدا مرے اندر

چلو پھر آج صدا دیں ہم اس کی رحمت کو
چلو! پھر آج سفینہ بھنور میں رکھا جائے

میں لب دعا کو ستارہ شمار کرتا ہوا
چلا ہوں خود پہ جہاں آشکار کرتا ہوا

اب اتنا خوش بھی نہ ہو کیا تجھے خبر بھی ہے
کہ اس سفر سے پرے اور اک سفر بھی ہے

پھول سے پیارے ننھے بچو! ہنستے رہو
تم کو دیکھ کے جینے کو دل کرتا ہے

اے دوست وفا کے راستوں میں
لگتا ہے کہیں کہیں پہ تو ہے

دیگر ہم عصر شعراء کی طرح طوؔر صاحب نے بھی ذات کے حوالے سے انفرادی اور اجتماعی زندگی اور اردگرد سے پھیلے ہوئے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اس حقیقت کا اقرار کرنا چاہیے کہ ماحول کی ہیبت ناکی، مسائل کے بے جا دباؤ، وسائل کی محدودیت، اخوت کے فقدان، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، جرائم کی فراوانی تعصّبات اور لاقانونیت کے شدید احساس نے انسان کو اندر کی طرف دھکیل دیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ صرف اپنے ماحول ہی سے نہیں بلکہ ذات سے بھی مشکوک ومنحرف ہوکر رہ گیا ہے۔ طبیعاتی اور مابعد الطبیعاتی خیالات وافکار سے اس کا یقین اس قدر ہٹ گیا ہے کہ بہت سے روحانی مسائل کی تفہیم سائنٹفک اور منطقی دلائل سے بھی ممکن نظر نہیں آتی ایسی صورت میں اگر فنکاروں نے معاشرے کے عام افراد کی بہ نسبت حالات کے اثرات کو شدت سے محسوس کیا ہے اور ان کو اپنی تخلیقات کا اہم موضوع بھی بنایا ہے تو ایک فطری اور ذہنی عمل ہے لیکن جدیدیت کی تحریک نے متذکرہ محدود ومخصوص عناصر ہی کو تخلیقی ادب کا بنیادی مقصد قرار دے کر دیگر ہمہ جہت اظہاری راستوں کو بُری طرح مجروح کیا ہے۔

کسی بھی جینوئن فنکار کا کسی تحریک سے وابستہ ہونا اس کا انفرادی عمل ہو سکتا ہے لیکن اس عمل میں اس طرح کی شدت کا در آنا کہ اس سے انفرادی افکار اور دیگر تخلیقی احساسات بھی پائمال ہو کر رہ جائیں ادب کی وسعت کے لئے بذاتِ خود نقصان دہ طریقۂ کار سے کم نہیں۔ جناب کرشن کمار طوؔر نے وابستگی کے ساتھ تقلیدی رویے کو حاوی نہیں آنے دیا ہے اسی لئے متذکرہ اشعار ان کی طرزِ احساس کی اُس نئی جہت سے روشناس کراتے ہیں جو تحریکی ضابطوں کی چھاپ سے لاتعلق ہیں۔ یاسیت کی عمومی رویّے کے خلاف عزم وحوصلہ پر تکیہ، دنیا بھر کے غموں کو برداشت کرنے کی قلبی صلاحیتوں پر فخر، ناظمِ کائنات کی موجودگی اور کریمانہ شان کا اقرار، ارتفاعِ ذات اور انسانی ذہن کے ارتقاء کی نقش گری، دعا کی حقیقت وتاثیر پر یقین، مستقل جدوجہد کی ضرورت، اپنی نسل کی مسرتوں کو دیکھ کر زندہ رہنے کی تمنا اور اخلاق وکردار کے مکمل فقدان کی نفی وغیرہ وغیرہ کے عناصر ماضی وحال کی ایسی کریہہ تصویر پیش نہیں کرتے جن سے انسانی وجود کے حامل سیارے کو ویسٹ لینڈ میں تبدیل ہو جانے پر کامل یقین کیا جا سکے اور اس بحران زدہ زندگی کے ہر لمحۂ آئندہ کو بہتر تعبیر سے محروم سمجھ لیا جائے۔

جناب طوؔر کا شعری رویہ جن مختلف جہات کا آئینہ دار ہے ہو سکتا ہے کہ کوئی نظریہ بند ناقد اس سے اتفاق نہ کرے یا نظریے کے تحت ان کی غزل کے صرف انہیں پہلوؤں کو قابلِ اعتناء قرار دے جو اسکی نظر میں کھرے اتریں۔ اردو میں تعصب اور جذباتی اندازِ فکر کی حامل تنقیدوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس طرح کے انتقادی پیمانے فن اور فنکار کے مقام ومنصب کے صحیح تعین میں ناکام ہی رہے ہیں سو طوؔر صاحب کے حوالے سے بھی کسی محدود رجحان کا ناقد ان کے تخلیقی کاموں کا صحیح تجزیہ کر سکے یہ ممکن نہیں ہے۔

میں اپنے کئی مضامین میں اردو ادب میں موجود اس رجحان کی نشاندہی کر چکا ہوں جس کا تخلیقی وتنقیدی نظریہ کسی بھی تحریک کے متعینہ اور جامد اصولوں کے مقابل بے حد وسیع اور آفاقی رہا ہے۔ اس رجحان کو میں نے

لاتحریک کے نام سے موسوم کیا ہے، ترقی پسند تحریک کے وجود میں آتے ہیں وہ فنکار جو مخصوص وضائف کو تخلیقی ادب کے لئے نقصان رساں تصور کرتے تھے تحریک میں شامل نہیں ہوئے بلکہ خود کو لاتحریک یا اُس بے نام رجحان سے وابستہ کئے رہے جس کی داغ بیل نظیر اکبرآبادی، سرسید، آزاد، شبلی، حالی، غالب اور اقبال جیسے فنکار ڈال چکے تھے اس ادبی رجحان کی اہم اور نمایاں خصوصیات میں اسلاف واقدار سے وابستگی کے باوجود ذہنی آزادی کے ساتھ ادب کی تخلیق کو اہمیت حاصل تھی، کوئی جامد نظریہ یا کوئی اصول ان کے کشادہ انفرادی تخلیقی رویے میں نہ سرراہ تھا اور نہ سنگِ میل۔ ترقی پسند تحریک کے ردِّ عمل کی صورت میں جب جدیدیت کی تحریک ابھر کر سامنے آتی ہے تب بھی چند لاتحریک کے نوجوان ہی اس کی آبیاری میں شدت کے ساتھ مصروف کار نظر آتے ہیں لیکن وہ کثیر تعداد جو اپنے قدموں پر جمی کھڑی رہی اس نے اپنی بھیڑ سے چھلانگ مارنے والوں کے شناخت نامے کو قبول نہیں کیا۔ یہ سفر ۳۶ء سے سن ۸۰ء تک جاری رہا بالآخر ۸۰ء کی نسل نے نظریاتی ادب کو بالکل مسترد کر دیا اور اپنے لاتحریکی مشن کو آگے بڑھانے میں مصروف عمل ہوگئی۔ آج اردو ادب کے پورے منظر نامے پر نئی نسل پھیلی ہوئی ہے اور یہ وہی دور ہے جو ترقی پسندوں سے قبل کا دور تھا۔

ترقی پسندوں کے دور میں بہت سے فنکار جہاں پوری شدت سے اس کے مخالف تھے وہیں ان کے گروہ کے بہت سے فنکار بعض نظریات سے استفادے کے عمل کو فروغ بھی دے رہے تھے اسی طرح خود تحریک کے بعض فنکار ایسے بھی تھے جنہوں نے بالخصوص غزل اور اس کے تخلیقی امکانات کو بے نور نہیں ہونے دیا ہر چند یہ کہ صنف اور اس کے موضوعات تحریک کے اصولوں کے اعتبار سے اچھوت قرار دئے جا چکے تھے۔ اس سلسلے میں فیض کی جرأتِ رندانہ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

جدیدیت کی تحریک میں جناب کرشن کمار طورؔ، فیضؔ کے ہم خیال نظر آتے ہیں انہوں نے اس صنف کے مواد وموضوعات کے مخصوص ومحدود دائروں سے نکال کر بے حد کشادہ اور ہمہ جہت اسلوب کا حامل بنا دیا ہے۔ ان کی غزل اپنے عہد کی تہذیب وثقافت سے نمو پاتی ہے وار اس میں ماضی بعید کی لہروں کو سمیٹنے اور ماضی قریب وحال کے متنوع حسی تجربات کے پہلو بہ پہلو فکر وتخیل کے ان تابناک عناصر کو ابھارنے کی ایسی بھرپور صلاحیت موجود ہے جو حال ومستقبل کی تاریکیوں کی تاراجی کا احساس بیدار کرتی ہے۔

جناب کرشن کمار طورؔ کا مجموعۂ غزلیات ''رفتہ رمز'' کا تجزیہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کے بطون کی مختلف تہوں کا ادراک نہ کیا جا سکے۔ آج جب کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے امتزاجی تنقید کے حوالے سے معنی کی تکثیریت کا جواز رکھنے والی تخلیقات کے انشراح ونقد کا بہت کشادہ راستہ ہموار کر دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شہہ پارہ جن تنقیدی زاویوں کو بروئے کار لانے کی دعوت دے، ہم بغیر کسی مکتبی فکر کے مختلف زاویوں سے فن پارے کا تجزیہ کرنے کے رجحان کو عام کریں کہ یہی تنقیدی عمل ہر بڑے فنکار کی تعبیر وتفہیم کے لئے ایک غیر متنازعہ اور وسیع تر پیمانے کے مترادف ہے۔

☆

## ''تازہ ترین طلسم''

کرشن کمار طور اس نئی غزل کے شہسواروں میں ہیں جس کا پرچم آج سے چالیس قبل بھی بلند تھا آج بھی ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔ کرشن کمار طور کے چار شعری مجموعے شعر گفت، عالم عین، مشک منور اور رفتِ رمز میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان مجموعوں میں طور نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ناقدین نے بھی طور کے فن پر بہت کم لکھا ہے حالانکہ جدیدیت نے جہاں ممتاز تخلیق کار پیدا کیے وہیں اہم تنقید نگار بھی پیدا کیے ہیں۔ یوں تو ان لکھنے والوں نے بارہا تعریف وتوصیف کے دریا بہائے مگر حقیقی فنکاروں کی طرف اُن کی توجہ کم کم ہی رہی ہے۔ طور کی شاعری خاص طور غزل سے میری ذہنی وابستگی کو کم وبیش چار دہائیاں گزر گئی ہیں۔ ان کی غزل کی جہات اور امکانات پر بات کرنا اس لیے بھی زیادہ مشکل ہے کہ ان کے یہاں دنیا کے اندر ایک اور عظیم الشان دنیا آباد ہے۔ ان کی غزل کے خطے شاداب ہیں، ان کا سبزہ فکر خوش رنگ طائروں کی طرح چہچہا رہا ہے، ان کے تخیلات کی پرواز بلند، مملکت احساس بے حد وسیع وبسیط اور ذوفشاں ہے۔ ان کی غزل میں حافظ، رومی، سرمد، عرفی، نظری اور مرزا بیدل کے افکار کا گہرا پرتو ہے۔ ان کی غزل کا خمیر بنیادی طور پر فارسی کے مابعد الطبیعاتی شعراء کے یہاں سے اُٹھا ہے مگر رفتہ رفتہ وہ تصوف کی شاہراہ سے گزرتا ہوا عرفانِ ذات کے روشن مناروں تک پہنچتا ہے۔ مگر کبھی بھی عصری کروٹوں سے تغافل کی ادا اختیار نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عظیم الشان دنیا میں نئی نئی جہتوں کے دروازے کھلتے ہیں، تازہ ترین طلسم مفتوح ہونے کی خواہش میں سرشار نظر آتے ہیں۔

عشرت ظفر (کانپور، بھارت)

# ''جنوں جو سر میں تھا''

(انتخاب اختصار)

ڈاکٹر رینو بہل (چنڈی گڑھ بھارت)

جنوں جو سر میں تھا ترک انا تو کرنا تھا ۔۔۔ پرائی چیز کو آخر جدا تو کرنا تھا
اسے جو پوچھا تو اس میں عجیب بات ہے کیا ۔۔۔ کہ اس نظر نے کسی کو خدا تو کرنا تھا
کواڑ بند کئے جانے کب سے بیٹھا ہوں ۔۔۔ مرے وجود کو خود آشنا تو کرنا تھا
مرے نمو میں مری اپنی مٹی مانع تھی ۔۔۔ مرے خدا نے مجھے بے صدا تو کرنا تھا
تھا میرا ہاتھ مرے اپنے قتل میں شامل ۔۔۔ یہ خشک پتہ تھا اک دن ہرا تو کرنا تھا
زمین تنگ تھی جس پر اور آسمان خلاف ۔۔۔ وہ شخص اب بھی ہو زندہ پتا تو کرنا تھا
وہ آنکھ کھولے نہ کھولے وہ اب سنے نہ سنے ۔۔۔ بلند طورؔ یہ دست دعا تو کرنا تھا

...... O ......

O

گھاؤ کا گلشن ہرا سمجھے تھے ہم
کھوٹا سکہ تھا کھرا سمجھے تھے ہم
انفرادیت کی حد بھی ہے کوئی
خود تھے لیکن دوسرا سمجھے تھے ہم
ہر طرف آنکھوں کے ویراں دشت پائے
ان کٹوروں کو بھرا سمجھے تھے ہم
ہلکی سی آہٹ بھی ہو تو چونک اٹھیں
خود کو کب اتنا ڈرا سمجھے تھے ہم
دیدنی ہے دل کا ہنگامہ بھی طورؔ
کب اسے وحشت سرا سمجھے تھے ہم

☆

O

راہ سفر سے جیسے کوئی ہم سفر گیا
سایہ بدن کی قید سے نکلا تو مر گیا
تھی گرمئی لہو کی امید ایسے شخص سے
اک برف کی جو سِل مرے پہلو میں دھر گیا
انسان بس یہ کہیے کہ اک زندہ لاش ہے
ہر چیز مر گئی اگر احساس مر گیا
کچھ تھی کچھ اور شکل ہی آئی نظر مجھے
کل آئینہ جو دیکھا تو میں خود سے ڈر گیا
اس خواہش بدن نے نہ رکھا کہیں کا طورؔ
اک سایہ میرے ساتھ چلا میں جدھر گیا

☆

دیارِ غیر میں شبہ سے سیاہ مانگتی ہے
حسین سے بھی یہ خلقت گواہ مانگتی ہے
عجب ہے کیا جو یہاں تیرا اعتبار نہیں
منافقوں سے تو دنیا پناہ مانگتی ہے
طلوعِ مہر درخشاں ہو ہر لہو کی بوند
تمہارے ہونے کا مٹی گواہ مانگتی ہے
یہ تیرے آنکھ کے آنسو صدف مراد نہیں
یقین خوشبو کوئی اشتباہ مانگتی ہے
تو اپنے حسنِ طلب کو نہ طوؔر ارزاں کر
یہ بُرجی رہنے کو گردش پناہ مانگتی ہے

...... ○ ......

اس دنیا میں خود کو ایسے مثال کیا
چاند اِدھر ڈوبا اُدھر ہم نے زوال کیا
سارے بدن میں اک بجلی سی کوند گئی
اس نے آنکھیں کھولیں دل نے وصال کیا
لب پر لفظ کی خوشبو کب تک رکھو گے
ہم نے اس سے اکثر یہی سوال کیا
اک کندن سا سارا جسم دمکتا ہے
اس کے ہجر نے میرا یہ کیا حال کیا
اپنے آپ کو زندہ رکھا ہر صورت
ہم نے اس سے بچھڑ کر یہ بھی کمال کیا
میں قطرے سے بحر ہوا ذرّے سے سورج
اس دنیا نے جینا جب بھی محال کیا
اک گلزار کھلایا اپنے ہی اندر
میری انا نے طوؔر یہ کیسا کمال کیا

ہیں لفظ سبز کی سعی بیاں بہت کم ہے
اب اس کے وصف کو میری زباں بہت کم ہے
سما سکے تو سما میرے دل کی وسعت میں
یوں اپنے آپ میں تو یہ جہاں بہت کم ہے
توقع رکھنی ہے تو رکھ وفا کی مٹی سے
یہ جنس وہ ہے کہ جو رائگاں بہت کم ہے
کچھ اور کا میں سوالی ہوں تیری آنکھوں سے
کہ زندگی کا تو یہ امتحاں بہت کم ہے
عذاب زیست گوارا کرو بہ خندہ لب
کہ طوؔر اب یہ تماشا گراں بہت کم ہے

...... ○ ......

وہ اور کرتا بھی کیا میرے مقابل
رہا رنجِ وفا میرے مقابل
وہی سر جو کہیں جھکتا نہیں ہے
وہی میری انا میرے مقابل
ہوں عکس آئینہ بھی، آئینہ بھی
ہے سب اچھا برا میرے مقابل
ہے پھر چاروں طرف اک روشنی سی
ہے پھر میرا خدا میرے مقابل
مرا انجام میرے سامنے ہے
دیا ہوں اور ہوا میرے مقابل
ہیں سارے دوست دشمن محوِ حیرت
اب ایسا بھی ہے کیا میرے مقابل
یہ کچھ کم تو نہیں زندہ ہوں اب تک
زمانہ طوؔر تھا میرے مقابل

# ''سینہ ہوا روشن''

عشرت رومانی
(کراچی)

عہدِ حاضر کی غزلیہ شاعری اپنے منفرد لب و لہجے کے اعتبار سے معنیٰ خیز نظر آتی ہے جس کے ارتقائی دھاروں میں جذب وکشش کے بے شمار نمونے ہیں جو فکری اور داخلی اعتبار سے جُدا گانہ سہی مگر مجموعی طور پر زندگی کا شعور جگانے اور ضمیر کو روشن کرنے میں پیش پیش ہیں۔ یہ سلسلہ نظیرا کبرآبادی سے ہوتا ہُوا بیسوی صدی کے آخیر کے کئی شعرا تک پہنچا ہے جس میں کرشن کمار طور بھی شامل ہیں جو اس عہد زرّیں سے وابستہ ہیں یہ وہ عہد ہے کہ انسانی قدروں کی مختلف شکلیں سامنے آرہی ہیں۔ نظیرا کبرآبادی جب 1830ء میں اس جہان آب و گِل سے رخصت ہوئے تو بیسوی صدی کے وسط میں ان کے تصورِ حیات ، واقعیت رجائیت اور آگہی اجتہاد کی شکل میں رونما اور عمل پذیر ہوئے۔ ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی ارتقائی منزل کی آشکار گی ظاہر ہو رہی ہے جس کا ثبوت آج کی شاعری ہے مجموعی طور پر جس طرح نظیرا کبرآبادی نے اپنی شاعری میں زندگی کی مصوّری کرتے ہوئے اسے اجاگر کرنے کے ساتھ اسکا دم بھرا۔ اس سے ان کا تصوّرِ حیات خارجی بن کر زندگی کا جز بن گیا' اس طرح انہوں نے معاشرے سے عوامی سطح پر رابطہ رکھنا ضروری سمجھا اور فطرت شناسی کی اہمیت کو مقدم سمجھا۔ عہد حاضر کے شاعر کرشن کمار طور کے شعری مجموعہ ''عالم عین'' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے نظیرا کبرآبادی کے شعری موڈ نظر آئے۔ اس طرح بیسوی صدی کے اختتام سے قریب کرشن کمار طور کی غزلیہ شاعری میں صوری حدود کی وسعت، صناعی اور مینا کاری نظر آئی جس کے سبب انکے یہاں حیات و کائنات کی عظیم حقیقتیں بہت قریب ہو کر زندگی کے حقائق کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے اشعار زندگی کے گراں قدر حقائق کے ساتھ قطار در قطار نظر آتے ہیں۔ نظیر کی طرح ان کے یہاں بھی تصوف کی لہریں ہیں جو ان کی داخلی کیفیتوں کا بخوبی احاطہ کرتی ہیں۔

پاؤں لگا تو چشم زدن میں ریت ہوا
میرے گلے سے بھلا سمندر ملتا کیا
دنیا خود کو جاننے کا ایک لمحہ خدا
ڈھونڈھنے والوں کو کیا کیا کچھ ملتا ہے
نہ خاکِ عالم ہو اور نہ خیمۂ خوشبو
اک اسکی روشنی سے آئینہ ہی میں اور تو

نئے سرے سے خود اپنے کو پہچان
طاق پر رکھا ہوا دِیا روشن کر

کرشن کمار طُور کے یہاں غنائیت کے مختلف انداز ہیں جو زندگی کا پیغام دیتے ہوئے فکر کے دریچے کھولتے ہیں۔ نظیر کی فکرِ رسا جو انکی نظم بنجارے نامہ کے توسط سے جسم اور روح دونوں کو ساتھ لے کر چلتی ہے وہی کیفیت جناب کرشن کمار طور کی غزلیہ شاعری میں ملتی ہے وہ فنا اور بقا کی سرحد پر زندگی کی نقش گری کرتے ہوئے ہمارے قلب کو گدگدا کر بیدار کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر انکے اشعار نفس کے ارتفاع کی تصدیق کرتے ہوئے نظریۂ حیات وسیع کر دیتے ہیں۔

زیست کی ساری آن بان فنا آمادہ
یہ درودیوار مکان فنا آمادہ
اک یہی زنجیر تعلّق کی قائم
تیرے میرے درمیان فنا آمادہ
میری ذات کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں
میرے اندر کوئی تماشا اور ہے اب
دل کو کیا دیکھتے ہو اے دیکھنے والو
باہر خشکی اور اندر گہرا پانی

کرشن کمار طُور کی شاعری کے جمالیاتی اور نفسیاتی پہلو زندگی سے ان کے لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں حقیقت نگاری کا سبب ان کا زاویۂ نگاہ ہے وہ سب کچھ دیکھنے پر قادر ہیں جسے عام لوگ نہیں دیکھ سکتے۔ ہم اسے بالواسطہ صوفیانہ رجحان تو نہیں کہہ سکتے ہیں مگر وہ اس کے بہت قریب ہیں۔ اس کا تعلق انکے وجدان سے ہے، ان کے مشاہدے اور الہام ہر لحہ انکی رہبری کرتے ہیں وہ مستور حقیقتوں کو نمایاں کر کے وقیع نگاری کرتے ہوئے صنّاعانہ انداز میں زندگی کی جزئیات واضح کرتے ہیں۔

آخر ہے پُتلیوں کا تماشا ذرا سی دیر
سامنے ہے آنکھوں کے دنیا ذرا سی دیر
کبھی کبھی میرے دل کو بہلانے کو
آ ہی جاتی ہے اک چڑیا ذرا سی دیر
جیسے لوٹ کے آئے اک گنبد کی صدا
آئینہ دیکھ کے مجھ کو خود حیرانی ہے
جی خوش ہو تو لگتا ہے آباد جہاں
ہے سرسبز آنکھ تو ہر موسم دھانی ہے

کرشن کمار طُور کی غزل اپنے لہجے اور پیکر کے اعتبار سے ان کی قوّتِ نمو آشکار کرتی ہے۔ ان کے یہاں موضوع اور پیکر کی جدّت ہے۔ وہ نفس کی کیفیتیں بخوبی سمجھتے ہیں، وہ حیاتِ انسانی کے اسباب ومحرکات کے سرچشموں تک پہنچ کر ان میں ڈوب کر اُبھرنا بھی جانتے ہیں، انکے نزدیک زندگی ایک لمحۂ

شوق اور عشق ایک قطرۂ سیماب ہے جس سے حُسن کی ادائے دلبری نکھرتی ہے۔

کانٹوں کو گلاب دے رہا ہوں
دنیا کو کتاب دے رہا ہوں
سجدے میں جھکا رہا ہوں سر کو
سورج کو جواب دے رہا ہوں
زندگی جیسے ہر اک لمحہ اک داؤ پہ تھی
دنیا میں رہنا تو اک سوئمبر نکلا
مجھے بھی اس سر کی آرائش لازم تھی
وہ بھی پھول پھینکنے میں برابر نکلا
میں تو اک پتھر ہوں اپنے آنگن میں
اور وہ کھلتا ہے اک پھول سا گلشن میں
اتنی نشانی ہی کافی ہے اس کے لئے
اک گلاب کا پودا ہے میرے آنگن میں

کرشن کمار طُور کے نظریۂ زندگی میں ارتقائی دھارے شامل ہیں۔ وحدت اور حیات کی درمیانی حدیں عبور کرتے ہوئے سفر کرتے رہتے ہیں۔ یہ وہ سفر ہے جو ازل سے طے ہو رہا ہے جس کا کوئی اختتام نہیں۔ انسان کی مجبوری یہی ہے کہ ہر لمحہ اسکی آنکھوں کے سامنے اک طلسم چھایا رہتا ہے، وہ کس طرح سب کچھ صاف و شفاف دیکھے لیکن اسی میں سب کچھ پوشیدہ ہے یہ وہ راز ہے جو آشکار نہیں ہوسکا ہے۔

سامنے آتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے
دور سے بس اک شور سنائی دیتا ہے
جانے کیا لکھتا ہے موج آب سے اب
پانی میں اک ہاتھ دکھائی دیتا ہے
ہر لحہ اک موجِ سراب ہے آنکھوں میں
آدمی شاید جیتا ہے مرنے کے لئے
لوگوں سے اس دل کا لگانا کیا معنی
یہ دنیا ہے اک رات ٹھہرنے کے لئے
دیتی ہے کیوں دل پہ صدا یہاں کوئی نہیں
جا اب اے سر پھری ہوا یہاں کوئی نہیں
اک اجڑتا باغ ہے نقشِ طلسمِ ذات
لمس کی لو تاز ہوا یہاں کوئی نہیں

جناب طُور کی غزلیہ شاعری ان کے مشاہدوں اور قوّت کے مظاہرو مفاہیم کا اس طرح احاطہ کرتی ہے کہ ان کے حیاتی اور کائناتی نظریات واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ خیال ونظر کی آفاقیت، سادگی اور مفکرانہ گہرائی، جب ان سبھوں کی یکجائی ہوتی ہے تو جدید احساسِ انبساط کی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ اس طرح روایت کی پہلو بہ پہلو حقیقت خود ہی پردے اٹھا کر جزبوں اور تخیل کی آمیزش سے شاعری کو عکسِ زندگی بنا کر حدیثِ دل بنا دیتی ہے۔

فریاد کہ جو ہے خواب ہم پر
موسم ہے وہی جناب ہم پر
ہے شاخِ امید بار آور
ہے سنگ بھی اب گلاب ہم پر
سینہ ہوا روشن تو ہو جاتا ہے کیا سے کیا
تم کو نہیں اس کا اندازہ آؤ چلیں
تم تو پہلی بار ملے ہو تم کو کیا
ہجر کی راتوں کا اندازہ آؤ چلیں
پاس پاس ہیں پھر بھی کتنا فرق ہے طُور
میرا اور اس کا دروازہ آؤ چلیں
سیہ زمیں آسماں زوال آمادہ
میں ہی کیا گُل جہاں زوال آمادہ
چاہے دل ہو کہ تتلیاں کہ پھول رُتیں
جو کچھ بھی ہے یہاں زوال آمادہ

جناب طُور کی انفرادی فکر اور فکر رسی اُنہیں جذبۂ شوق سے کائنات اور ماورائے کائنات تک لے جاتی ہے اس لئے ان کے یہاں نفسیاتی اور فطری صداقتوں کی جانب واضح اشارے ملتے ہیں جو ان کے صوفیانہ خلوص اور سوزِ عشق سے مربوط ہیں۔ ان کی شاعری زندگی سے رابطہ برقرار رکھنے کی وہ کڑی ہے جو بہت مضبوط ہے۔ وہ لفظوں کی رفاقت کے ساتھ اس عالمِ رنگ و بو میں ہر لمحہ سفر کرتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ذات کا سفر ہو جس میں آسمانی صداقتیں بھی ہمراہ ہوں۔ یہ وہ صداقتیں ہیں جو شب و روز خارجی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو کر زندگی کی تصاویر میں رنگ بھرتی ہیں۔ یہ وہ رنگ ہے جو الفاظ کے پیراہن بن کر فکر کے گہرے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کی جمالیاتی توسیع کرتے ہوئے کرشن کمار طُور نے اجتماعی مسرت کے لیے سوچ و فکر کے بے شمار دریچے وا کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں کہیں بھی نقطۂ وداع (Departure Point) نہیں ہے بلکہ وہ نقطۂ اتصال (Meeting Point) ہے جو نظیرا کبر آبادی سے ہوتا ہُوا عہدِ حاضر میں کرشن کمار طُور تک پہنچا ہے۔

O

خواب دیکھنا اور خواہشیں پالنا زندہ دلی کی نشانی ہے۔ فرق یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے خواب بلّی کے خواب کی مانند ہوتے ہیں اور زندہ دل لوگ شیر کے خواب کی مانند خواب دیکھا کرتے ہیں۔

OOO

# ''دل کے چمکتے آئینے''

ظہیرغازی پوری
(غازی پور،بھارت)

**شاعری** ذہن زرخیز کی کشت راز میں اُگتی ہے، رنگ برنگے پھولوں کی طرح کھلتی ہے اور خوشبوؤں کی مانند دائرہ در دائرہ پھیلتی ہے۔اس کے رنگ وخوشبو سے دل و دماغ ہی نہیں روح بھی سرشار ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت سے جاری ہے جب انسان نے جنت ارضی پر اپنا پہلا نقشِ پا مرتسم کیا،شعور کی بلوغیت سے واقف ہوا اور اس نے وہ قسم سنبھالا جو سب سے پہلے خلق ہوا تھا اور تاقیامت اس کے ذریعہ اسرار کائنات سے پردہ اٹھنا تھا۔یہی سبب ہے کہ دنیا کے ہر خطے کی زبان سے شعر گوئی کا رواج ہے۔شاعری عوام وخواص میں مقبول ہوتی ہے، پڑھی سنی جاتی ہے،لوگ اس سے لطف اندوز اور متاثر ہوتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ نقد و تاثرات شاعری پر لکھے گئے ہیں۔ بلا شبہ تمام اصنافِ ادب پرشاعری کو برتری حاصل ہے۔

اردو شاعری کا ایک بڑا ذخیرہ قصیدہ ،مثنوی اور مرثیہ کی شکل میں محفوظ ہے۔یہ اصناف ایک طویل مدت تک بے حد مقبول رہیں۔نظم، رباعی اور غزل نے گزشتہ دو سو سال میں خوب ارتقا کیا۔اردو شاعری کم عمر ہونے کے باوجود عالمی شاعری کی مختلف سطحوں سے بالاتر بھی ہے اور معیاری بھی مگر اسے دنیا کی بڑی زبانوں میں منتقل نہیں کیا جا سکا۔اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اردو شاعری کے پسِ پشت عربی اور فارسی شاعری کا گراں قدر سرمایہ مرکز نگاہ رہا ہے اور ایک تلخ سچائی یہ بھی ہے کہ معیار رسیدگی کی کوئی مخصوص سطح نہ تو پہلے موجود تھی اور نہ اب ہے۔رہی بات مغربی شعروادب سے متاثر ہونے کی تو فیشن پرست انگریزی داں تو وہاں کی جنس زدہ اور ننگی تہذیب پر بھی فدا ہوتے رہے ہیں۔البتہ تو یہ ہے کہ کلیم الدین احمد جیسا دراز قد ناقد بھی صرف اردو شاعری کی بیخ کنی ہی کرتا رہ گیا اور لیوس کے دبستان میں بھی اپنی شناخت قائم نہ کر سکا۔کلیم الدین احمد نے تو نظم غزل کو بھی نہیں بخشا جسے عربی سے زیادہ فارسی زبان میں فروغ حاصل ہوا اور اردو میں غزل کی عشوہ پاپی کو وہ معراج ملی کہ اس کے ہر نفس میں ایک بسیط کائنات سمٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ولی کے عہد سے موجودہ عہد تک غزل کا جائزہ لیجے تو علم ہوگا کہ غزل نہ تو وحشیانہ شعری صنف ہے اور نہ کاوشوں سے عبارت ہے۔غزل تمنا کے دوسرے قدم سے آگے کی دنیا ہے جہاں قطرے میں سمندر اور ذرّے میں آفتاب جلوہ گر نظر آتا ہے۔تحیّر اور سرشاری کی اس دنیا سے وہی فنکار واقف ہوتا ہے جو غزل کی زیبائی اور رعنائی نہیں بلکہ اس کے ہر جائی انداز کو حرف وصوت کا لباس فاخرہ عطا کرتا ہے۔

غزل ہر شاعر کے مزاج، طبیعت، رجحان، جذبہ اور جمالیاتی تجربوں کی عکاس ہوتی ہے۔اسی لئے صنفی اعتبار سے یکساں نظر آنے کے باوجود وہ نئی فکری جہات اور معنوی کیفیات کا ابلاغ کراتی ہے۔کرشن کمار طور ایسے ہی شعراء میں سے ایک ہیں جن کی غزل اسلوب و معنیٰ اور لب ولہجہ کے اعتبار سے مختلف ہے اور ناآفریدہ جذبوں کو نیا اتا پتا دیتی ہے، نئی شکل وشباہت سے نوازتی ہے اور بصیرت افروز وسیلوں سے آشنا کراتی ہے۔ان کی غزل میں بظاہر بے جان بہم اور پامال الفاظ بھی شعری تلازمات سے آراستہ نظر آتے ہیں کیونکہ لفظ ہی پیکر تراشتے ہیں، استعارہ سازی کے متحمل ہوتے ہیں اور علامتی طریقۂ اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔کرشن کمار طور خود آگاہ بھی ہیں اور روحِ عصر کو شعری ارتکازات سے ہم کنار کرنے کا حسن کا راز آرٹ بھی جانتے ہیں۔لہٰذا وہ اس بات کا ادراک کراتے ہیں کہ

کسی وحی کی طرح لفظ لفظ اترتا ہے
نشاطِ غم کا ہے شاید خمیر سب سے الگ
اتر رہا ہوں دلوں پر میں اک وحی کی طرح
ہے میری دور بہت دور تک صدا روشن
اب وقت ہے خود کو جاننے کا
اب اترے کوئی کتاب ہم پر
میں تو تھا موجود کتاب کے لفظوں میں
وہ ہی شاید مجھ کو پڑھنا بھول گیا
وقارلفظ کی میں کس سے گفتگو کرتا
جو مجھ کو پڑھتا وہ اہلِ کتاب تھا بھی کون

مشکلیں اسی لئے حد سے گزر کر آسان ہو جاتی ہیں کہ نشاطِ غم کا خمیر مثال ہوتا ہے اور اس کی نظر کم یاب ہوتی ہے۔واقعیت کی اس منزل سے گزرنے کا سلیقہ آجائے اور الہامی و وجدانی کیفیت،شعور وادراک کا حصہ بن جائے تو لفظ وحی کی طرح اترتے ہیں اور اپنی صدا دور دور تک روشن نظر آتی ہے۔خود کو جاننے پہچاننے کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے، صاحبِ کتاب ہونے کی تمنا شدت اختیار کر لیتی ہے اور بسیط دشتِ حرف ونوا کی سیاحی کے بعد فطری طور پر یہ احساس بھی جاگ اٹھتا ہے کہ شاعر کتاب کے لفظوں میں عکس ریز تو ہے لیکن کوئی اسے پڑھنا بھول گیا ہے اور شاید وقارِ لفظ پر سیر حاصل گفتگو کرنے والا ابھی موجود نہیں ہے تو اسے کون پڑھے گا اور سمجھے گا۔فی زمانہ یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جارہا ہے کہ گہرائی تک اتر کر پڑھنے والے مفقود ہوتے جارہے ہیں اور دادِ ہنر دینے والے اہلِ کتاب تو تحسین و آفریں کے سارے کلمات خود اپنی ذاتِ گرامی کے لئے وقف کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

میرا تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی کہ وہی شاعر قابلِ ذکر ہوتا ہے جو

لفظ کو وقار بخشتا ہے لفظ کی قدر و قیمت سے آشنا ہوتا ہے اور لفظ کو جس رنگ میں چاہے ڈھال دینے پر قدرت رکھتا ہے۔ یہی فن کاری شاعر کو انفرادی شان اور دوسروں سے الگ پہچان عطا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ کرشن کمار طور اس راہ پر گامزن ہوئے تو انھوں نے بعض سامنے کے الفاظ سے بے حد دل آویز پیکر، امیج اور وژن خلق کیے جن میں ایک بسیط وعریض جہانِ معنیٰ سمٹا دکھائی دیتا ہے اور ان کی وسعتِ نظر کا درک کراتا ہے۔ ایسے کچھ الفاظ وصل آئینہ، انا اور زمین و آسماں وغیرہ ہیں۔ وصل ایک بہت ہی عام فہم لفظ ہے جو فرقت یا ہجر کی ضد ہے اور بیشتر محبوب سے ملاقات کے معنی میں مستعمل رہا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ کرشن کمار طور نے اسے کیسی کیسی معنوی جہات سے ہم رکاب کیا ہے۔

یقیں کے پردے میں اک احتمال خلق کیا
وہ کون شخص تھا جس نے وصال خلق کیا

ہے معجزہ کہ انا کا کمال دیکھتا ہوں
میں زندہ ہجر میں ہوں اور وصال دیکھتا ہوں

وصل اس کا رقم ہے پانی پر
اس یقیں کو گمان جانئے گا

نشاطِ وصل بھی میں شعلگیٔ درد بھی میں
ہوں برگِ سبز بھی میں اور شاخِ زرد بھی میں

دیکھو تو نصیب میں کیا لکھا ہے
یہ حرف وصال کہاں سے آیا

میں وہم ہوں کہ حقیقت یہ حال دیکھنے کو
گرفت ہوتا ہوں اپنا وصال دیکھنے کو

اس کے وصل نے یہ کیسی حالت کر دی
آنکھیں بند ہیں اور نظارہ باقی ہے

کرنا ہے تو میں خود کو زنجیر کروں
وصل کی شب تو کم ہے اسے منانے میں

وصال خلق ہونا، ہجر میں زندہ رہ کر وصال دیکھنا، کسی کا وصل پانی پر رقم ہونا، خود نشاطِ وصل ہونا، حرفِ وصال کا آنا، اپنا وصال دیکھنے کو گرفت میں ہونا وغیرہ ایسے معنی خیز اور وجد آفریں شعری انسلاکات ہیں جو چونکانے کی بجائے ایک وسیع اور بلیغ تناظر میں شعروں کو پڑھنے اور غور وخوض کو مطالبہ کرتے ہیں۔ یہی وہ تخلیقی بصیرت ہے جو شاعری کو آفاقی قدروں سے ہم کنار کرتی ہے۔ بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ:

> ''شاعری میں تازہ کاری اور روح پروری معنوی قدروں کے فروغ سے آتی ہے۔۔۔غزل کی زبان رمزوایماں ہے۔ اس میں کسی قسم کی تفصیل اور تشریح کی گنجائش نہیں۔ وہ فکری نظریات کو بھی تاثرات کے پیرائے میں بیان کرتی ہے''۔

(''اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب'')

کرشن کمار طور استعارے کی زبان، معنوی قدروں کے فروغ اور رمزوایماء کی اہمیت سے واقف ہیں۔ انھوں نے لفظ و زبان کے تخلیقی استعمال کے غزل کے اشعار کو معنویت انگیز تابناکی بخشی ہے۔ اردو شاعری میں خودی کی طرح لفظ انا بھی اس قدر مستعمل رہا ہے کہ اب متروکہ، فرسودہ یا پامال لفظوں کی قطار شمار میں رکھا جانے لگا ہے لیکن اس لفظ کو بھی کرشن کمار طور نے اس طرح برتا ہے کہ اس کے معنوی سحر انگیزی حد درجہ تابناک ہوگئی ہے۔ چند اشعار کے مطالعہ سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

جانے کون سے اسمِ انا کے ہم زندانی تھے
تیرے نام کو لے کر ہم نے خود کو چاہا بہت

یہ سرشاری تھی یا رنجِ انا تھا طور
میں نے اپنے آپ کو زندا کم دیکھا

دیکھوں وہ کب کرتا ہے زنگِ انا کا فور
دیکھوں کب وہ مرا اندر چمکاتا ہے

اب تو یہی اک جائے اماں باقی ہے
آنکھیں کھول طلسمِ انا روشن کر

میں آنکھ رکھتا ہوں اپنے وجود پہ طور
میں آسمان سے عکسِ زمیں اٹھاتا ہوں

تھی جو کہ رشکِ انا وہ جبیں ندارد ہے
ہے آسمان تو قائم زمیں ندارد ہے

ان اشعار میں تصنع اور ابتذال نہیں ہے۔ خوامخواہ کی جذباتیت اور گھن گرج بھی نہیں ہے اور نئے عہد کا احساسِ محرومی یا اکیلے پن کی شکوہ طرازی بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس فکری دبازت، فنی رچاؤ اور معنوی حدود زیادہ وسیع وبالیدہ ہیں۔ یہ سب اس لئے ممکن ہوا کہ اسمِ انا، رنجِ انا، رشکِ انا، رنگِ انا، طلسمِ انا اور انا وجود کی ترکیبی صورت استعمال نے معنی ومطالب کے سارے عقب در و در پیچے کھول دیئے ہیں۔ غزل شعریت، اشارت اور رمزیت سے عبارت ہوتی ہے۔ ایسی تمام تر خوبیاں زبان اور لفظ سے پیدا کی جاتی ہیں۔ بقول عبد الرحمٰن بجنوری ''جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے، وہاں نئے الفاظ کا وجود ضروری ہوتا ہے''۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی کا خیال ہے کہ ''شاعری ایک سحر ہے اور سحر انہیں الفاظ میں ہوتا ہے جو شاعر استعمال کرتا ہے''۔ عزیز احسن نے اپنا تجربہ بیان کیا ہے کہ ''لفظ جب احساس سے ہم آہنگ ہو جائے اور اظہار میں گلاب کی مہک آنے لگے تو سمجھے کہ شاعر اپنے احساس کی صحیح ترجمانی کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے''۔ ملارمے نے بھی اسی سچائی کا اعتراف کیا ہے کہ ''شاعری خیالات سے نہیں لکھی جاتی 'الفاظ سے کی جاتی ہے''۔ کرشن کمار طور نئے نئے الفاظ کی قوس قزح ترتیب دینے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے چند اشعار میں الفاظ کی جلوہ

سامانیوں سے لطف اندوز ہوں۔

بہت گراں ہے دلِ غم زدہ پہ آج کی شب
کہاں خرام چراغِ حنا نکل آیا
سر کو اندازۂ اسرار انا دینے میں
ہو گئے خاک یہ اک بات بتا دینے میں
زمین کس کو وفا کا خراج دینے لگی
کس لمسِ موسمِ مقتل ہے آسماں پیدا
دلوں پہ لفظ گریزاں کتاب رکھ دوں پھر
وہ چاہتا ہے تو عکسِ عتاب رکھ دوں پھر
میں تو ایک بنجر زمیں ہوں بے متاعِ نخلِ سبز
مجھ میں میرے خوں بہا کا دیکھنے والا ہے کون
ہماری آنکھ جسے چوم لینا چاہتی تھی
جو دیکھتے تو خوش امکاں سراب تھا وہ بھی
خود تو ہوں عکسِ شیشۂ نازک لیکن
کتنا سفاک ہوں اوروں کو سزا دینے میں
آخر ان کچے رنگوں کی بساط بھی کیا
اتنی زعفران لمسِ احتیاط بھی کیا

یہ اشعار بغیر کدوکاوش میں نے ان کے شعری مجموعوں سے اٹھائے ہیں۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ ''خرام چراغ حنا''۔ ''اندازۂ اسرار انا''۔ ''لمس موسم قتل''۔ ''لفظ گریزاں کتاب''۔ ''عکس عتاب''۔ ''بے متاع نخل سبز''۔ ''خوش امکاں سراب''۔ ''عکس شیشۂ نازک'' اور ''زعفران لمسِ احتیاط'' وغیرہ نے منضبط ہو کر ایک کیف افزا، اسراری اور تشکیلیت افروز معنوی فضا بندی کی ہے۔ لفظوں کا پیکر تراش اور استعارہ باز عملی ہی غزل کو وسیع امکانات کا حامل بناتا ہے۔ غالبؔ کی ایسی ہی جدت طرازی نے ذوقؔ کی مضمون آفرینی پر سبقت حاصل کی تھی۔

کرشن کمار طورؔ نے جب ابتداء میں غزل کو اپنی فکر و اظہار کا ذریعہ بنایا تو ترقی پسندانہ لبھاتی تہذیب کا بول بالا تھا۔ اس غالب رجحان سے وابستگی بہرحال ضروری تھی۔ اس سے کنارہ کشی یا بغاوت دقیانوسیت اور رجعت پسندی کا باعث سمجھی جاتی تھی مگر پانچویں دہائی ختم ہوتے ہوئے دانش ور نقادوں اور باشعور شاعروں نے اس نہج پر سوچنا شروع کیا کہ اکہری معنویت والی بیانیہ جذباتی شاعری اپنا کام کر چکی اور اس میں فکری اور معنوی دونوں لحاظ سے فروغ و ارتقا کے امکانات باقی نہیں رہ گئے ہیں لہٰذا میرؔ و غالبؔ کے معنیاتی نظام اور اقبالؔ و یگانہؔ کے فکری نظام کی بازیافت لازمی ہو گئی اور چھٹویں دہائی کے فوراً بعد ذہنی رجحان بدلا، فکری رویوں نے نئی کروٹ لی اور نظریاتی اعتبار سے لفظ و معنی کی تشکیلی جہات میں گویا انقلاب آ گیا۔ دنیائے ادب میں موسم بدلے یا فیشن، ایک طرف حسن خیزی جنم لیتی ہے تو دوسری جانب تکدر اور ابتری بھی کسی بدعت کی طرح پھیل جاتی ہے۔ سنجیدہ مزاج بالغ نظر شعراء نے خلیل الرحمٰن اعظمی، عمیقؔ حنفی، بلراجؔ کومل، فضا ابن فیضی، عشرتؔ ظفر اور غلام مرتضیٰ راہیؔ کی طرح جدیدیت کی جانب مراجعت تو کی مگر ادبی اور فنّی قدروں کا بہر لحاظ احترام کیا اور چند ہی برسوں میں نئے شعری رویہ کو اپنی پہچان بنالیا۔ ان میں کرشن کمار طورؔ نے اپنی غزلیہ وجدان کی منفرد جمالیاتی تخلیقی بصیرت کے باعث اپنی جگہ مستحکم اور محفوظ کر لی۔ آج وہ اردو دنیا کے گوشے گوشے میں نہ صرف اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں بلکہ قارئین ادب کے پسندیدہ شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

غزل طربیہ، حزنیہ اور رجزیہ جذبے کی غماز ہو یا عصری مسائل، احتجاج و مزاحمت اور استحصال و فسادات کا لب و گویا ہو یہ ہر طرح کی نشاط انگیزی اور خوں چکانی کو تمام تر جمال و کمال کے ساتھ بیان کرتی ہے اور اس طرح عالمی ماس میڈیا کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ کرشن کمار طورؔ کی غزل پر اس زاویے سے نظر ڈالیں تو انکشاف ہوگا کہ بین الاقوامی افکار و تجسس اور تہذیب و تفکر کو بھی اس نے نشان زد کیا ہے، بیان کیا ہے اور حرف و صوت میں سمیٹا ہے۔ اس لئے ان کی غزل زیادہ باوقار اور قابلِ توجہ ہے۔ میں کرشن کمار طورؔ کی عہد حاضر کا اہم اور معتبر شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ انھوں نے جب سے قلم سنبھالا متواتر کشتِ غزل کو ذہن کے تازہ لہو سے جلنار کرنے میں منہمک ہیں۔ ان کے اشعار خود اس کے گواہ ہیں۔

اک مشعل سی میرے لہو میں جلتی ہے
میں پیشانی پر اندیشہ رکھتا ہوں
کبھی تو میرے لہو کے نشاں بنیں گے پھول
میں غم کے دشت میں گزرا برہنہ پا ہر بار

پہلے شعر میں مشعل سی جلنا اور اپنی پیشانی پر اندیشہ رکھنا وہ المیہ ہے جسے دنیا کا ہر آدمی جھیلنے پر مجبور ہے۔ استعارے کی زبان نے اس شعر کو آفاقیت بخش دی ہے۔ دوسرے شعر میں لہو کے نشان کبھی تو پھول بنیں گے، اسی امید میں وہ دشتِ غم میں برہنہ پا گزرتے ہیں۔ یہ کیفیت بھی آپ بیتی کی شکل میں نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی مسائل حیات کی جانب بھی انگشت نمائی کرتی ہے۔ ایسی توقعات کے سہارے کتنے ہی لوگ پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ آئینہ اور زمین و آسماں کے استعاروں نے بھی کرشن کمار طورؔ کی غزلوں میں معنویت کی دلفریب نگینوی رنگارنگی پیدا کی ہے۔ چند شعر مندرج ہیں۔

ستارہ سمت یقیں کو گماں ضروری ہے
مری زمیں کے لئے آسماں ضروری ہے
عذابِ عشق در دوستاں پہ کیا رکھنا
زمیں کی جنس کو اس آسماں پہ کیا رکھنا
نظر جو آتا ہے شاید نہاں زیادہ ہے
کہ یہ اب زمیں تو ہے کم آسماں زیادہ ہے

دل کے چمکتے آئینے پر راکھ ملی
دیکھا ہم نے خود کو کیا کم دیکھا
جتنی پہچان ہےاب اس کےحوالےسے ہے
آئینہ مجھ کو جو ہے روز دکھانے والا
مرا وجود کہ دنیا کو آئینہ ہے طوؔر
جوہو کتاب میں رکھا وہ برگِ زرد ہوں میں

کرشن کمار طوؔر کی غزل پرناقدین وشعراء نے مضامین، تاثرات اور تبصروں کی شکل میں بہت کچھ لکھا ہے مگر ان کی معنی خیز استعارات و رمزیت پر بالخصوص شمس الرحمٰن فاروقی کی نگاہ نقد مرکوز ہوئی۔انھوں نے اظہار خیال کیا ہے کہ:

''کرشن کمار طوؔر کی غزل کی تخلیق میں غیر معمولی شعری قوت اور تخیل کارفرما ہے جوایسی استعارتی مماثلتیں دیکھ لیتاہے جن کا تصور بھی عام طور پر ممکن نہیں۔''

ڈاکٹر وارث علوی ان کی غزل کے ایک خاص نکتہ مضمون آفرینی سے متاثر اور لطف اندوز ہوئے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید نے ان کے دعائیہ لہجہ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ''وہ جدید غزل کے خواجہ میر دردؔ ہیں اور ہمیں کائنات دیگر سے متعارف کرارہے ہیں''۔ڈاکٹر عتیق اللہ کا خیال ہے کہ جاؔنی کے بعد جن ناموں نے اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں کرشن کمار طور کا بھی شمار ہے''۔

مضمون آفرینی غزل کا جزو لاینفک ہے لیکن فکر آفرینی کے بغیر شاعری برگِ خشک سے زیادہ کچھ نہیں رہتی۔خواجہ میر درد کے یہاں بقول گوپی چند نارنگ''عشقِ حقیقی کی سچی زمزمہ سنجیاں ملتی ہیں اور وہ اس رنگ کہ امام ہیں۔'' کرشن کمار طوؔر کے یہاں یہ حسیت کہیں واضح ہے تو کہیں انڈر کرنٹ کی طرح موجود ہے۔اس نوعیت کے اشعار میں بھی نئی فکری تب وتاب نظر آتی ہے۔مثلاً

سمٹ رہے ہیں یہ ارض و سما مرے اندر
دکھائی دیتا ہے مجھ کو خدا مرے اندر
ہر ایک حرف ہے روشن ضمیر سب سے الگ
مری دعا ہے ستارہ نظیر سب سے الگ
ہیں اک جوہر سے دونوں فصل آسا
میں تیرا عکس ہوں تو آئینا سا
اگر وہ ہے تو مجھے بھی کہیں دکھائی دے
میں ڈھونڈوں طور کہاں اب خدا زمانے میں
ہے ساتھ دعا حصار مرے
خوشبو ہوں گلاب سے بنا ہوں
دے شادابی دل سے نکلی دعاؤں کو
بند صدف سی اسی مٹھی کو گوہر دے

اس مختصر جائزہ کی روشنی میں بلا مبالغہ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ناصؔر کاظمی اور جاؔنی کے بعد لب ولہجہ کے اعتبار سے بجا طور پر، بہت سارے شعراء نے اپنی انفرادی شناخت قائم کی تھی مگر موضوعات کی فراوانی اور معنیاتی تجربوں کے لحاظ سے کرشن کمار طوؔر نے غزل کو جو ندرت اور توانائی عطا کی ہے وہ نسبتاً زیادہ اہم اور بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے۔میرے خیال میں وہ عہد حاضر کے ایک ممتاز و معتبر غزل نگار ہیں۔جواز کے طور پر انہیں دو اشعار پیش کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

ہے آنکھ باقی تو قائم ہے رونق امکاں
ہیں ہاتھ زندہ تو پھر صورت ہنر ہے بہت
جو بات اترے دلوں میں وہ قدرے کم ہے طوؔر
تمہارے شعروں میں حسنِ بیاں زیادہ ہے

## ''شاعری کا شرارہ''

اسد بدایونی، بانی، زیب غوری، بمل کرشن اشک، عرفان صدیقی کے بعد اور عادل منصوری کے ساتھ ساتھ کرشن کمار طور کی تازہ کتاب''سرنامۂ گماں نظری''اندھیروں کو چیرتی ہوئی اُس روشنی کی مانند ہے جس نے برصغیر کی غزل پر پھیلی ہوئی دھند اور تیرگی سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔اس غزل پر اگر چھاپ ہے تو صرف اپنی اور یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کیونکہ فی زمانہ اپنا لہجہ استوار کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل سے مشکل تر ضرور ہوتا جارہا ہے۔ طور کا عیب و ہنر خالصتاً اُس کا اپنا ہے اور یہی اُس کی شعری اور فکری استقامت کی بنیادی وجہ بھی ہے۔وہ الفاظ کے ساتھ ہی نہیں شعر کے مضمون کے ساتھ کھُل کھیلنا بھی جانتا ہے اور جدید طرزِ احساس کے حوالے سے اپنے آپ کو اپ ڈیٹ بھی کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ مروّج بحروں کے ساتھ ایک دلنواز من مانی بھی اس نے روا رکھی ہے اور اس کی غزل پڑھ کر جس کھُلے پن کا احساس ہوتا ہے جدید غزل میں اُس کی جتنی ضرورت آج ہے پہلے کبھی نہ تھی۔یقیناً ایسے شعراء کا شمار اجتہادیوں میں ہونا چاہیے کہ ایسا کام بہت سے خطرات بھی مول لینے کا باعث بنتا ہے، اپنے لیے بھی اور اپنے معاصرین کے لیے بھی، کیونکہ ایسی شاعری جہاں تقلید طلب ہوتی ہے وہاں کم عیار مقلدوں کو گمراہ اور خراب بھی کرتی ہے۔کرشن کمار طور جن مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے وہ اسے آگے، مزید آگے بڑھانے کے لیے کافی ہیں جبکہ شاعری کا شرارہ اندر موجود اور باقی رہے تو ایسے شاعر سے کسی بھی معجزے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔میں اس کی مزید کامیابیوں اور کامرانیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

ظفر اقبال (لاہور)

# ''تیغِ انا''

(انتخاب اختصار)

اقبال بھٹی (یوکے)

قتیل نقش ہیں اہلِ نوا ہر اک جانب  چمکتی رہتی ہے تیغ انا ہر اک جانب
ہر ایک دل میں شگفتہ ہے اب لہو بن کر  عروج عین ہے نور دعا ہر اک جانب
وہ کون ہے کہ جو دہرا رہا ہے میرے لفظ  میں سُن رہاہوں کیوں اک ہی صدا ہر اک جانب
کھلا ہے کون سا گل باغِ بے ثبات میں اب  طواف کرتی ہے کس کا ہوا ہر اک جانب
یہ اوج موج نظر اب ہے کس بلندی پر  دکھائی دیتا ہے مجھ کو خدا ہر اک جانب
ہمارے خون سے اس کی ہتھیلی لال ہے طورؔ  اڑا رہا ہے جو رنگ حنا ہر اک جانب

...... O ......

O

نہیں ہے پھر بھی رنجِ زیاں زیادت باد
بہت دنوں سے ہے غم کی دکاں زیادت باد
کرے گا کون یہاں نرمئی سخن کی بات
کہاب ہے دہر میں شورِ سگاں زیادت باد
ہے خفتہ نقش محبت فزوں ہیں بغض وعناد
زمیں کہیں بھی نہیں، آسماں زیادت باد
میں تیری لو سے منور رہوں بھلا کب تک
یقین دل پہ ہے گردِ گماں زیادت باد
ہے لوحِ دل پہ رقم ایک بس نفی کی لکیر
طریقِ عشق بھلا ہے کہاں زیادت باد
جو کہہ رہا ہے سمجھتے ہیں اس کو ہم اے طورؔ
خدا کرے کہ ہو تیرا بیاں زیادت باد

☆

O

یقیں کے پردے میں اک احتمال خلق کیا
وہ کون شخص تھا جس نے وصال خلق کیا
سلوکِ اشک سے آنکھیں ہوئی ہیں مستعجاب
بہت کیا جو غمِ لازوال خلق کیا
ہر ایک داغ کو روشن کیا چراغ صفت
گرفتِ عشق نے کیسا کمال خلق کیا
تھی دسترس تو بس اتنی حیات گزراں پر
تمام عمر غمِ ماہ و سال خلق کیا
میں اپنے آپ کو پہچاننے میں صرف ہوا
جنوں نے کیسا یہ کارِ محال خلق کیا
کسے اذانِ انا سے کیا ہے بہرہ ور
تھا طورؔ کون جسے بے مثال خلق کیا

☆

اک آہ سرد کو موج ہوا نہ جانیۓ گا
جو میں کہوں اسے میرا کہا نہ جانیۓ گا
اسی سے دیدۂ حیراں ہے مثلِ عکسِ نفس
جو بے وفا ہو اسے بے وفا نہ جانیۓ گا
یہی بہت ہے شناسا ہیں خود پرستی سے
کبھی کچھ اور اب اس کے سوا نہ جانیۓ گا
کہیں ہے نقل مکاں بھی یقینِ ختم سفر
جو ہو چکا ہے اسے بھی ہوا نہ جانیۓ گا
ہو خشک آنکھوں سے ظاہر جہاں عذاب وجود
دلوں کے دکھ سے کوئی دکھ بڑا نہ جانیۓ گا
فلک زدوں کو یہ مٹی بھرم میں رکھتی ہے
جو در کھلا ہو اسے بھی کھلا نہ جانیۓ گا
جہاں میں رہیۓ گا جیسے بھی ہو سکے اے طوؔر
بس آدمی کو اک اپنا خدا نہ جانیۓ گا

...... O ......

نہ میں نہ میرا جہاں میں یقین ظفر امواج
جو ہو تو کیسے یہ جان حزیں ظفر امواج
ترا وجود ہے قائم کسی کے لاشے پر
ہے خوں میں تر یہ تری آستیں ظفر امواج
ہے تیرے نام سے روشن مرا یہ سب اندرون
ہے تیرے در سے نہایت جبیں ظفر امواج
مرے لہو سے ہے گل ریز اس کا ہر ذرّہ
بہت دنوں پہ ہوئی ہے زمیں ظفر امواج
یہ زندگی ہے اسے اس نظر سے دیکھیۓ طوؔر
شکست خوردہ کہیں پر کہیں ظفر امواج

خود سے بھی دور گئے ہو کیا
اتنے مشہور ہو گئے ہو کیا
اپنے ہونے سے اتنی بے خبری
مشک کافور ہو گئے ہو کیا
خاک پا ہو تو خاک پا ہی رہو
جلنے سے طور ہو گئے ہو کیا
ہے خدا سے فقط کلام تمہیں
تم بھی مغرور ہو گئے ہو کیا
نہیں لہراتے برق تک بھی اب
سب سے مستور ہو گئے ہو کیا
خود پہ اپنی نظر نہیں پڑتی
بین اسطور ہو گئے ہو کیا
چھوڑ ڈالا ہے طوؔر باغ ہوس
نار سے نور ہو گئے ہو کیا

...... O ......

ہے اک طلسم ندا میری جان آتش بار
سراغ رکھتا ہے کیا امتحان آتش بار
انا گزیدہ ہیں اپنے طریق سے دونوں
وہی جہاں وہی میری زبان آتش بار
جھکا سا رہتا ہے کیوں دور افق لکیر کے پاس
زمیں زدہ تو نہیں آسمان آتش بار
یہیں پہ ہے اسے سمجھو ہنر کہ بے ہنری
خود اپنی خاک سے پیدا جہاں آتش بار
بس اک فتیلۂ غم کی کسر ہے پیارے طوؔر
چمک رہی ہے دلوں سے دکان آتش بار

# ''کہیں گماں پر ہے ممکن''

ڈاکٹر رونق شہری
(جھریا، بہار)

کرشن کمار طُور کا تازہ ترین شعری مجموعہ سرنامۂ گماں نظری پیش نظر ہے۔ سرنامۂ گماں نظری تک کا شعری سفر طُور کے ذہن کے ایک بسیط اور حیرت انگیز فکری تعمق کا اشاریہ محض نہ ہو کر وسیع و بلیغ منظر نامہ ہے۔ دریافت، ترتیب، سیرسبزہ، شعر شگفت، عالم عین، مشکِ منور، رفتہ رمز کے بعد سرنامۂ گماں نظری تک آتے آتے ان کے ذہنی ارتقا کے مختلف مدارج سے قارئین وسامعین کو گذرنے میں جو معنوی دروبست کی خوشگوار فضا ملتی ہے اس میں تادیر قیام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ طُور کی غزلوں کا صوتی آہنگ تو ایسا ہے کہ اس کی قرات سے لفظ و معنیٰ کے بیچ جو تعلق قائم ہوتا ہے وہ نہ صرف انوکھا ہے بلکہ حیران کُن بھی ہے۔ اس سے پہلے ہمیں بڑے شعراء کے یہاں ڈکشن پیدا کرنے کی شعوری کوشش دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ پاکستان میں ظفر اقبال ہندوستان میں محمد علوی، عادل منصوری، مظفر حنفی اس کی مثال ہیں ان کے یہاں مخصوص الفاظ کے تئیں خوش رغبتی اور ان کے متواتر فروغ کے ایک نامانوس جہانِ معنی خلق ہونے سے عجیب و غریب تمسخر دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ زندگی کو ہمیشہ سنجیدہ رہ کر تلاش نہیں کیا جا سکتا اس کے ساتھ ناروا سلوک بھی ضروری ہے لیکن اس کج روی کو مستحسن قرار دینے کیلئے الفاظ کی صورت گری سے زیادہ معنوی تہہ داری کی ضرورت ہے۔ طُور نے ادھر یہ کام کیا ہے کہ الفاظ کی بازی گری سے لاشعوری طُور پر پرہیز کرنے کے باوجود مستحکم معنوی فضا خلق ہو۔ میں یہاں اس بات پر اصرار نہیں کروں گا کہ طُور کے یہاں معنوی فضا خلق کرنے میں سمت کا تعین ہوا ہے کہ نہیں۔ بشیر نواز نے جب یہ شعر کہا تھا:

بے سمت منزلوں کا سفر درمیان ہے
رستے کے سب نشان اڑا لے گئی ہوا

تو بیشتر جدیدیوں نے منزل کی گمراہی کیلئے بے سمت راستے کی تلاش میں سرگرداں نہ ہو کر منزل کی عدم فراہمی کیلئے ہوائے تیز کو ذمہ دار قرار دیا تھا۔ خارجی انسلاکات کی تعبیر وتشریح اس معنی میں مستحکم ٹھہری کہ وہ عہد غزل میں مشہور جدید رویوں کا بہترین مظہر تھا۔ طُور کے یہاں شروع سے ہی ان رویوں سمیت، جاری وساری عام رجحانات کی ردا اپنی جداگانہ تخلیقی بصیرت سے پیش کرتے رہے۔ اس ضمن میں طُور کے جو تین شعری مجموعے میرے مطالعے میں رہے ہیں ان کے دو دو اشعار اس مقصد کے لئے نقل کر رہا ہوں کہ طُور کا سفر مسلسل ہے یا پھر رُک رُک کر چلنے کیلئے تازہ دم ہوتے رہنے کا بہانہ ہو۔ اس کا انکشاف بہ آسانی ہو سکے گا۔

میں چاہتا تو ہر اک شئے مرے حصول میں تھی
مگر ہے لذتِ دنیا مجھے حرام تمام
کسی وحی کی طرح لفظ لفظ اترتا ہے
نشاطِ غم کا ہے شاید خمیر سب سے الگ
میں اپنے آپ کو پہچاننے سے قاصر ہوں
کہ میرے ذہن میں شاید گماں زیادہ نہیں
نوید دیتا ہوں دُنیا کو اپنے ہونے کی
زمیں کی خاک سے سورج جبیں نکالتا ہوں

محولہ چاروں اشعار رفتہ رمز سے ماخوذ ہیں جو مشکِ منور کی غزلوں کی تخلیقی رچاؤ کے بعد منظر عام پر آئے ہیں۔ مشکِ منوّر کی غزلوں کا فکری ومعنیاتی نظام اس معنی میں تفریق پیدا کرنے کا ہُنر رکھتا ہے کہ اس میں شامل غزلوں کا مزاج ''رفتہ رمز'' کی تخلیقی وحدت کا سراغ دیتا ہے۔ مثال کے طُور پر مشکِ منور کے درج ذیل اشعار پر آپ غور کرینگے تو طُور کی سابقہ ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی

میں دیکھتا ہوں یہ دنیا پرائی آنکھوں سے
مرا نہیں کوئی کردار اس کہانی میں
یہ کیسا پانی ہے جس نے نہ سطح چھونے دی
وہ کیا ستارہ تھا جو میرے روبرو چمکا
جہاز جاں ہے بس اب ڈوبنے کے ہی نزدیک
اگر ہے کوئی تو میرے سوا اُتر جائے

درج بالا اشعار نقل کرنے کا جواز یہ ہے کہ طُور کے مسلسل ذہنی سفر میں گزشتہ سے پیوستہ والا معاملہ کس حد تک مثبت تاریخی تناظر کے کینوس پر رنگا رنگی پیدا کرنے میں معاون ہے۔ سابقہ دونوں مجموعوں کے ورق در ورق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سرنامۂ گماں نظری کا خالق مشکِ منور کی غزلوں کے وسیع معنیاتی نظام کو اور بھی بڑے آکاش پر اس کا پرتو بکھیرنے کا متمنی نظر آتا ہے۔ پیش نظر مجموعے میں طُور نے لفظوں کے خلاقانہ استعمال میں قادر ہونے کی جس نوع سے شہادت پیش کی ہے وہ طُور کے شعری سفر پر سرسری گفتگو کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ تہہ شعر درویشی کی کیفیت سے روبرو ہونے کی کئی مثالیں اردو شاعری کے حوالے سے دی جا سکتی ہیں۔ ایک مثال منتہی کی صورت میں خواجہ میر درد کے پاس جا کر لوٹ آنے کی بھی ہے۔ معاملہ ایسا بھی ہے تصوفانہ کلام کی

نازکی سے بہرہ ور ہونے میں ہی اتنا زیادہ وقت نکل جاتا ہے کہ ذاتِ وحدہ لا شریک کی طرف مراجعت کا باب کھلنے کی منتظر آنکھیں لہولہو ہو کر اندھی ہو جاتی ہیں۔ چراغِ دل و جاں چونکہ روشن ہوتا ہے اس لئے دنیا صفت سیاہ بلی جہاں بھی ہو نظر آ جاتی ہے جن میں طُور کے ساتھ معاملہ حسّیاتی لمس کا ہے

ذرا سا ہاتھ لگائیں تو کشف قلب کریں
چھپا ہے راکھ کی ڈھیری میں کیا خدا معلوم

کشفِ قلب کے بعد گماں نظری اپنی انتہا کو پہنچ کر اب کریم کے قرب کو حاصل کرنے میں دعا کے موتی چمکتے رہنے کی التجا کر کے شاعر نے اپنی ادائے خاص سے سپردگی اسطرح پیش کی ہے

میرے لبوں پہ دمکتا رہے دعا موتی
سدا ہو سبز یہ پودا مرے خدا مرے رب

دُنیا کی بے وقعتی و بے بضاعتی کو طُور دبے لفظوں میں نہیں بلکہ ''صفر'' سے موسوم کر کے گماں نظری کو آئینۂ حقائق میں ڈال دیا ہے

ہے صفر سارا زمانہ مری نگاہوں میں
کہیں تو کوئی ہو مجھ سا مرے خدا مرے رب

شیشے میں زنگ لگنے کی ترکیب پیدا کر کے طُور بجا طُور پر ''سرنامۂ گماں نظری'' کی تخلیق کا جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ خود کو آئینے کے سامنے سے ہٹانے کی درخواست میں عاجزی ضرور ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مخاطب کون ہے۔ یہی حیرت کی معنویت اکائی کی صورت میں ہر شعر میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس سے قبل کے مجموعے میں، سمتِ فنائیت دھندلکے کی کیفیت پیدا کر کے آنکھوں کو مکمل طُور پر ثبت کرنے کا اشاریہ مل چکا تھا لیکن اس شعری مجموعے میں انتہائی پختہ کاری کے ساتھ طُور Perfection کی طرف بڑھ چکے ہیں۔ کسی بھی دانشور میں جب تکمیلیت کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو اس کی قوتِ گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ اس کے روز و شب کے لمحات میں زیادہ تر اوقات اشیاء کے مشاہدے میں گذرتے ہیں۔ چونکہ زبان و بیان پر اسے قدرت حاصل ہوتی ہے اس لئے جب وہ اپنی قوتِ گویائی کو لباسِ تحریر عطا کرتا ہے تو اس کی قرارت کی لذت سے نطق زبان کے بوسے لینے لگتے ہیں۔ مخصوص طُور پر اس اثناء میں جب طُور جیسے قادر الکلام شاعر کے شعری دروبست میں خاک، مٹی، زمین، نفس، دل، جان وصل، پانی، قرب، ہوس، انا، ستارہ، شام، فضا، کیف، فلک، جنوں کی مسلسل آمد، آمدِ شعر کیلئے تخلیقی اور تعمیری امکانات کے مبادیات جہاں بنتے ہوں اس شاعر کی ذہنی ذرخیزی کے کیا کہنے۔ شاعر نے جہاں یقین کا بھرم رکھا ہے وہاں امکانات و آثار کی نفی نہیں کی ہے بلکہ ان کے بیچ ''گماں نظری'' کو بھی سلیقے سے داخلِ جزئیات قرار دیا ہے۔ اس طرح طُور نے

ہوا اس کا طرزِ تغافل کہ حرفِ وصل و نشاط
سمجھ رہے یقیں ہم جسے گماں ہے وہ شئے

یقین اور گماں کے باب اس مجموعے کے مختلف اشعار کی کیفیت جداگانہ سہی لیکن مجموعی طُور پر گماں نظری کا ہی اطلاق ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں زمانہ سازی کا اصل واقعہ درد سے پُر ہے۔

مجھ ایک ذرّے کو روشن کہیں تو اس نے کیا
زمانہ درد کی تقسیم میں غنی ہے بہت

طُور نے پہلے مصرعے میں ذرّے کو روشن کرنے کی بات کہی۔ ذرّے کے روشن ہونے کے قبل کے دلدوز مراحل سے جب تک ہم گذر نہیں جاتے شعر کا لطف باقی نہیں رہ پاتا۔ طُور یہاں غیر براہ راست طُور پر جلنے، سُلگنے، دہکنے کی واردات کو نا قابلِ بیان بنا کر براہِ راست روشن ہونے کا جواز پیدا کر دیا۔ اس طرح کے اشعار میں طُور اکثر لفظ کی معنوی دروبست کو بدلنے کی حکمتِ عملی پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں گماں نظری کی معنوی فضا درج ذیل اشعار میں بھی مشکل پسند اسلوب میں منور ہے۔

نکالتا ہوں میں خود کو خود اپنے اندر سے
کہیں کچھ اور ہے ظاہر ہے گماں سے الگ
نظر جو آتا ہے وہ بھی نظر نہیں
میں دیکھتا ہوں جسے وہ تو ہے یہاں سے الگ
بہت اگرچہ ہے موجود آئینہ امکاں
غلط نگاہ ذرا کم اسے سمجھتے ہیں
زمانہ کہتا ہے جس کو جہاں سے بے خبری
فقیر وصل کا عالم اسے سمجھتے ہیں
وہ کوئی اور ہی ہوتا ہے میں نہیں ہوتا
جسے میں اپنے ہی جیسا نکال دیتا ہوں
سراغ اس کا خدائی میں کچھ نہیں موجود
گرفتِ شب میں ہے کیوں کاسۂ سحر ہر روز
نہ اس کی آنکھ لشکارہ اور نہ مرغ کی بانگ
یقیں زیادہ ہے میرا گماں مگر کس وقت
میں ایک غیر یقیں شئے کا نقشہ کیا کھینچوں
کہیں گماں یہ ہے ممکن طوافِ ہجر و وصال

طُور نے غیر محسوس طُور پر بھی ''سرنامۂ گماں نظری'' میں لطف امکان کو زندہ رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ طُور کی باطنی آنکھ ظاہری مرگ پر ماتم کناں نہ ہو کر متعجب صورت حال کا مظہر ہے۔ درج ذیل شعر طُور کے فکری دروبست کی حتمی صورت گری کہی جا سکتی ہے

میں مر چکا ہوں مگر اب بھی ہیں کھُلی آنکھیں
یہ کیسی منزلِ مقصود مرے سامنے ہے

☆

# ''اس دل کا اجڑنا دیکھا''

حامدیؔ کاشمیری
(سری نگر' کشمیر)

کرشن کمار طورؔ کا نیا شعری مجموعہ ''مشکِ منوّر'' اُن کی تخلیقی شخصیت کے ایک بنیادی، حاوی اور معجزہ کار پہلو یعنی انانیت کی نو بہ نو پیکر تراشی کرتا ہے، یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اُن کے اشعار میں جو شعری کردار اُبھرتا ہے وہ عافیت دشمن، حیات شکن، انتشار ساماں اور تاریک ماحول میں سانس لیتے ہوئے اور ویرانی کے احساس (ہم نے اِس دل کا اجڑنا دیکھا) سے دو چار ہوتے ہوئے بھی، اپنی اعتماد، سچائی، ایقان اور بقا کا تحفظ کرنے کا آرزومند ہے، اور اس کی آرزومندی محض خوش گمانی یا خیال آرائی ہو کر نہیں رہ جاتی، بلکہ زبان کے توسط سے ثقافتی اور ارضی جڑوں سے پیوست ہو کر اور ان سے اخذ نمو کر کے شعری سیاق میں اتنا اثر انگیز ہو جاتی ہے کہ قاری کے دل میں رچ بس جاتی ہے اور خود شاعر کی آواز بن جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے مقطعوں میں حیرت انگیز طریقے سے اُن کا تخلص طُور کرشن کمار کی نمائندگی کرتے ہوئے بھی شعری کردار کی رمز یہ پہچان بن جاتا ہے۔

ان کی غزلوں میں شعری کردار کی انانیت کی اثباتی مضمرات چند در چند ہیں، اور مختلف رنگوں میں نمود کرتے ہیں اور اس کی سانسوں کے مشک منور کی طرح حیاتی نشاط کا ساماں کرتے ہیں، فرائیڈ نے انسانی زندگی کے نفسیاتی رموز کو منکشف کرتے ہوئے عنفوان شباب میں نرگسیت کے رجحان کی نشاہدی کی ہے یہ گویا شعور کی بیداری کی اولیں کروٹ ہے، اور اس کے نتیجے میں انسان خارجی کائنات سے مراجعت کر کے اپنے داخلی وجود کی جانب رجوع کرتا ہے اور اپنی ذات کو محبوبیت، دل پذیری اور جمال کا مرکز تصور کرتا ہے، داخلیت پسندی کے سفر میں یہ اس کا پہلا پڑاؤ ہے جو ذات گزینی کو راہ دیتا ہے۔ یہ رجحان بقول فرائیڈ لبیڈو، جو جنسی اور جبلی قوتوں کا خزانہ ہے سے اکتساب فیض کر کے، مختلف شکلیں بدلتا ہوا، مختلف جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کو جنم دیتا ہے انسان خارج کی بے رنگی سے اکتا کر اپنی ذات میں مگن رہتا ہے اور اپنی ذات کو مرکز کائنات گردانتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا اسکے خلاف معاندانہ رویہ رکھتی ہے اور اسکی تباہی کے درپے ہے اور وہ خود حفاظتی کے لیے اپنی ذات کو حصار بناتا ہے، بلکہ خودنگری اور خود پسندی کی انتہاؤں کو بھی چھو لیتا ہے اور بعض صورتوں میں یہ شعور کے نقد و احتساب کو نظر انداز کر کے نفسیاتی عارضے مثلاً احساس برتری میں بھی تبدیل ہوتا ہے، اس کے علی الرغم شعوری نظم وضبط کے تحت یہ خودی میں ڈھل جاتا ہے اور شخصیت میں مضمر تخلیقی توانائیوں تک رسائی کو ممکن بناتا ہے یہ تولد دیگرے کا عمل ہے جو بصیرت اور روحانی بیداری پر منتج ہوتا ہے، اور حیات و کائنات اور موت کی اصلیت منکشف ہوتی ہے۔ کرشن کمار طورؔ کی شاعری میں شعور ذات کے یہ سارے رنگ اپنی بہار دکھاتے ہیں، اس سے اُن کی شعری تنوع کاری اور نفسیاتی تہہ داری کی توثیق ہو جاتی ہے اُن کے اشعار میں لفظ ''انا'' متعدد بار در آیا ہے یہاں تک کہ یہ ایک کلیدی لفظ بن گیا ہے، اور یہ اُن کے اس نفسیاتی رجحان کی غمازی کرتا ہے جو اُن کی شخصیت میں مضمر پیچیدگیوں کو محیط ہے اور جو اُن کی شعری حسیّت کی پیکریت میں قابل شناخت ہو جاتا ہے۔ انانیت کا اتنا گہرا شعور طور کی شاعری کے انفرادی کردار کو مستحکم کرتا ہے اور معاصر شعراء میں اُن کی شناخت کا تعین کرتا ہے۔

اُن کے یہاں ''دلآویزی انا''، ''ہر آئینے میں رہنا'' ''اپنے اندر گلزار کھلانا'' ''ایک آدمی کو سب کچھ سمجھنا'' اور ''خود کو دیکھنا'' اُن کے نرگسی رجحان کا غماز ہے، یہ ایک فطرح رجحان کے طور پر ابھرتا ہے، اور شعری حیرت کو بھی جگاتا ہے۔

ہوں کشتِ جاں میں دلآویزی انا میں بھی
ہر آئینے میں رہوں صورت صدا میں بھی

اک گلزار کھلایا اپنے ہی اندر
مری انا نے طُور یہ کیسا کمال کیا

جو میں دیکھوں تو بس دیکھوں اسی کو
وہی اک آدمی ہے طُور سب کچھ

اس کو سوچوں تو نظر آتی ہے دنیا روشن
خود کو دیکھوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ان کی نرگسیت خود بینی میں مبدل ہوتے ہوئے بھی ارضی رشتوں سے منحرف نہیں ہوتی، وہ جانتے ہیں کہ یہ ارضی خاصیت رکھتی ہے اور فطری اور جبلی ہے، اس کا تعلق مٹی سے ہے اور ''نشیبوں'' میں دیدنی ہے، اس سے اُسکی کسی نفسیاتی الجھن کا زائیدہ ہونے کا مفروضہ مسترد ہوتا ہے، اس کا رشتہ اُن کے توارث سے قائم ہو جاتا ہے جو زمینی اصل کو مزید مستحکم کرتا ہے اور ''فقیری'' یعنی خاکساری کے انداز رکھتا ہے:

میرے ہر پندار کو زندہ رکھتی ہے
مجھ پر یہ احسان ہے کیا کم مٹی کا

بلندیوں سے اسے میں نظر نہ آؤں گا
نشیب میں جو وہ اترے تو میں دکھائی دوں

ہم سے فقیر منش لوگوں سے ملنا تھا
دیکھے تو ہوں گے تم نے یوں انسان بہت

یہ روّیہ اُس کے احساس تفرد کو گہرا کرتا ہے اور وہ خود آشنائی کی آرزو کرتا ہے چنانچہ وہ ایک صوفی کی طرح ترک علائق کر کے کواڑ بند کرتا ہے تا کہ خود آشنا ہو جائے۔

کواڑ بند کئے جانے کب سے بیٹھا ہوں
مرے وجود کو خود آشنا تو کرنا تھا

خود آشنائی کا یہ عمل ایک منزل پر خود فراموشی میں ڈھل جاتا ہے، اور خارجی مظاہر معطل ہو جاتے ہیں:

سورج میرے کان میں کچھ کہتا ہی نہیں
دھیان مجھے کسی بات کا اب رہتا ہی نہیں

ہے خود پرستی کی جانے یہ کون سی منزل
دکھائی دیتا ہے مجھ کو جہاں بہت ہی کم

طُور کے یہاں خود شناسی کا رجحان گہرا ہو کر انا نیت کی شکل اختیار کرتا ہے اس کے کئی محرکات ہو سکتے ہیں، خارجی حقائق کا دباؤ، شناخت کی گمشدگی، ادارتی اور اجتماعی نظام میں فرد کی بے توقیری، مخلوط شہری تہذیب، آبادی کا دھماکہ وغیرہ ان محرکات کے علاوہ جو خاص محرک اُن کی انا نیت کو انگیز کرتا ہے، وہ اُن کی تخلیقی قوتوں کا شعور ہے، جو اُن کے نزدیک اُن کی شخصیت کی انفرادیت اور معجزہ کاری پر دلالت کرتا ہے:

ان کو بھی تلاش تھی اک معجزے کی
میں بھی اپنی ہتھیلی پر سر لے آیا

یہ کیا زمیں ہے جو ہے میرے خون سے گلنار
یہ کیسے میداں ہیں جن کو سر کرتا ہوں میں

اس کی محفل میں سرفرازی کو
طُور تم اپنا بیاں رکھ دینا

شعلہ سا ہر ایک دل میں ہوں نمایاں
اب درد کا حرف منتخب بھی میرا

یہی انا ان کی خود حفاظتی کا ساماں کرتی ہے، حالانکہ مخالف قوتیں جن میں زمانہ وقت اور موت پیش پیش ہیں۔اُن کے حصار انا کو مسمار کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اپنے آپ کو ''راندہ انا'' متصور کر کے اپنے وجود کے انتشار اور شکست کے المناک تجربوں سے آشنا ہوتے ہیں، شکستِ انا کے نتیجے میں اُن کے یہاں عدم تحفظیت، خوف، اجنبیت، گم گشتگی اور وحشت کے جذبات راہ پاتے ہیں اور اُن کی عصری حسیت کی گہرائی کا اثبات ہوتا ہے۔

وہ رنج دے گا مجھے میری خود پسندی پر
میں چپ رہوں گا کہ ہوں راندۂ انا میں بھی

نشان منزل تازہ نہ کوئی سمت سفر
یقیں گماں سے کہیں مات کھا گیا کب کا

مرا انجام میرے سامنے ہے
دیا ہوا اور ہوا میرے مقابل

ہلکی سی آہٹ بھی ہو تو چونک اُٹھیں
خود کو کب اتنا ڈرا سمجھے تھے ہم

دیدنی ہے دل کا ہنگامہ بھی طُور
کب اسے وحشت سرا سمجھے تھے ہم

کون کس کا ساتھ دیتا ہے یہاں
وہ جو تنہا آئے تھے، تنہا گئے

''مشکِ منور'' کی غزلیں طُور کی ابتدائی غزلوں کی فارسیت آمیز تراکیب کی گرانباری سے آزاد ہیں، ان میں اِن کا اسلوب سادگی اور فطری پن سے متصف ہے، اُن کا ذہن پروردۂ روایت ہے، اس لئے روایت کے اثرات اُن کے کلام میں جگہ جگہ ملتے ہیں، تاہم استعارہ سازی کی جدت بھی نمایاں ہے، یہ جدت کاری کئی جگہوں پر شعوری کاوش کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے اور چونکا دینے والے پیرایۂ اظہار کو وضع کرتی ہے لیکن قاری اس سے چونکتا نہیں، بلکہ تجربے کی سالمیت کی تلاش کرتا ہے، جن اشعار میں جدت کاری فطری ہے، ان میں تجربہ برگ و بار لے آتا ہے اور قاری کی جمالیاتی حس کی تشفی ہوتی ہے:

اس دنیا میں خود کو ایسے مثال کیا
چاند اُدھر ڈوبا اِدھر ہم نے زوال کیا

# ''درِالتجا''

(انتخاب اختصار)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

کھلا ہوا ہے در التجا خبر ہی نہ تھی — ہے میرے ساتھ یہ میرا خدا خبر ہی نہ تھی
زمین سنگ سے ظاہر ہے شاخ سبز نمو — ہے کتنے زور پہ دست دعا خبر ہی نہ تھی
جہاں پہ تکیہ کئے بیٹھا ہوں نہ تھا احساس — فلک مقام ہے میری دعا خبر ہی نہ تھی
لگے تو ہاتھوں کی قسمت بدل بھی سکتا ہے — لہو سے بڑھ کے ہے رنگ حنا خبر ہی نہ تھی
بس ایک لمس پہ ٹھہرا رہا سکون دل — رواں ہے باغ بدن میں ہوا خبر ہی نہ تھی
میں خود ہی تنگ نفس ہوں جہاں حیرت میں — مجھی پہ بار ہے میری صدا خبر ہی نہ تھی
ہر اک کے واسطے ہے اس زباں پہ کلمۂ خیر — چمک رہی ہے لبوں پر دعا خبر ہی نہ تھی
سمجھ رہا تھا کہ پائندہ ہے یہ طور کلام — فنا پذیر ہے میرا کہا خبر ہی نہ تھی

...... ○ ......

چلے جہاں میں پھر ایسی ہوا دوبارہ کہاں
تمام ہوتا ہے کار فنا دوبارہ کہاں
بس ایک بار ہی ہوتا ہے فضل چشم کرم
چمکتا ہے سر دل یہ خدا دوبارہ کہاں
اسے جو دیکھا تو ساری ہوس ہوئی پوری
جنوں میں ملتی ہے اس کی رضا دوبارہ کہاں
پرانی چیزیں تو اکثر پرانی ہوتی ہیں
نیا ملے بھی تو اس میں نیا دوبارہ کہاں
چلو یہ آنکھیں کسی سرد روشنی پہ دھریں
کہ ایسی عالم ہو میں صدا دوبارہ کہا
میں اس کے سامنے کم یاب ہوں اگر اے طور
نظر مجھے بھی وہ آیا بھلا دوبارہ کہاں

مہک ہے یار کی کچھ اے ہوا بہت تحفہ
جولا سکے تو ادھر بھی تولا بہت تحفہ
ترے فریب میں آؤں گا میں نہ جیتے جی
دکھا رہا ہے جہاں تو یہ کیا بہت تحفہ
نہال رکھتی ہے ان کی ہمیشہ شاخ غنا
فقیر رکھتے ہیں کم میں سدا بہت تحفہ
ہمیں خبر ہے کہ اوقات کیا ہے مٹی کی
ہمیں یہ دہر دکھاتا ہے کیا بہت تحفہ
یہ اور بات ہے تو ہی تھا اس کے ناقابل
وہی ہوں میں وہی میری وفا بہت تحفہ
ہمارے ہونٹوں پہ خوشبو ہے ایک نام کی طور
ہمارے دل میں ہے روشن خدا بہت تحفہ

جوحرزِ جاں تھا ہےاب تو وہی یقیں موقوف
وہ آستاں تو ہے قائم مری جبیں موقوف
چمکتی رہتی ہےغم میں بھی اس کےلمس کی لو
وہ آفتاب نشاں ہوتا ہے، کہیں موقوف
بہت دنوں پہ کھلا شاید اپنے آپ پہ میں
بہت دنوں پہ ہوئی گردشِ حزیں موقوف
جو آنکھیں بند کروں تو یہ مجھ کو لگتا ہے
کہیں پہ دہر ہے موجود اور کہیں موقوف
وجود عشق ہے موجود، دہر ناموجود
امانت اس کی ہے روشن مگر امیں موقوف
مرا جنوں رہا اک دائرے کی قید میں طوؔر
تھا جس مقام پہ ظاہر ہوا وہیں موقوف

...... O ......

میں دیکھتا ہوں جسے ساعت گراں ہے وہ شئے
بس ایک مٹتی ہوئی صورت نشاں ہے وہ شئے
حرام رزق سے موت اچھی لوگ کہتے ہیں
اگر یہ سچ ہےتو پھر کس طرف رواں ہے وہ شئے
نمو وجود تھی پہلے رگوں میں خوں کی طرح
جو دیکھو غور سے اب نقشِ آسماں ہے وہ شئے
ہے سامنا تو ہمیں اپنی خوں چکانی کا
تمہارا لطف جسے کہتے ہیں کہاں ہے وہ شئے
ہواس کا طرزِ تغافل کہ حرفِ وصل ونشاط
سمجھ رہے ہیں یقیں ہم جسے گماں ہے وہ شئے
زمانے بھر میں جسے ڈھونڈتے رہے ہو طوؔر
تم اپنے دل کی طرف دیکھوتو یہاں ہے وہ شئے

وہی ہوں میں وہی لب پر مری دعا بھی صفر
یہ کفر ہے مگر اس دہر میں خدا بھی صفر
سکوت ریز ہے آواز بہرے کانوں میں
یہ سننے والے بھی صفر اور مرا کہا بھی صفر
ہیں دونوں ایک ہی رشتے سے منسلک شاید
جہاں میں تیرا کہا بھی مرا سنا بھی صفر
میں اس مقام پہ پہنچا ہوا ہوں اب کہ جہاں
مری نگاہ میں نقش رہ فنا بھی صفر
عدم وجود سے روشن ہے سب کی منزل طوؔر
کہ دشتِ عشق میں دل بھی صدائے پا بھی صفر

...... O ......

تکتا ہوں جس کو لطفِ گراں بار سے الگ
صورت ہے ایک وہ بھی تو انکار سے الگ
کچھ ایسے اس نے کر دیا مجھ کو مجھی سے دور
دیوار جیسے ہوتی ہے دیوار سے الگ
جو مٹ چکے ہیں کیسے بتائیں بھلا کہ ہے
یہ گردشِ جہاں تری رفتار سے الگ
دونوں طرف سے ایک ہی جذبہ ہے آشکار
ہم سے ہے یار، ہم ہیں اگر یار سے الگ
پورا نہیں اترتا جو میں اس کے قول پر
یہ دہر بھی تو ہے میرے معیار سے الگ
روشن اس اک خیال سے ہے دل کی واردات
ہے میری خامشی مرے اظہار سے الگ
اس کار زارِ زیست میں میری انا نے طوؔر
رکھا ہے خود کو رونقِ بازار سے الگ

# ""مشکلیں کر تُو سب آساں""

پروفیسر قیصر نجفی
(کراچی)

""چشمۂ چشم"" کرشن کمار طور کا ایک شعری مجموعہ ہے، جو حمد، نعت، سلام کے عنوانات سے تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ قبل ازیں طور صاحب ہم سے بحیثیت ایک غزل گو متعارف تھے۔ لیکن ""چشمۂ چشم"" میں وہ بیک وقت حمد، نعت، سلام تین اصناف سخن کے شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے کنج لب سے حمد خدا اور ثنائے رسولؐ خدا کے چشمے پھوٹتے نظر آتے ہیں اور گوشۂ چشم سے سیّد الشہداء حضرت امام حسینؑ کی یاد میں گوہر اشک نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بادی النظر میں حمد، نعت، سلام مسلم شعراء کا فکری وفنی ورثہ ہیں، بلکہ ان کے عقیدہ وعقیدت کا منظوم اظہار ہیں۔ لیکن دراصل یہ اصناف سخن ان مردان حق کے روشن باطن کا عکس جمیل ہیں۔ جن کے دل یادِ خدا سے معمور ہیں اور جن پر قرآن حکیم کے سورۂ کہف ۱۸: ۲۸ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

""جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل رکھا ہے، اس کی بات نہ مانو""

کرشن کمار طور نے ""چشمۂ چشم"" کے پیش لفظ بعنوان ""قبول نامہ"" میں اس آیت کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی یہ دعویٰ کیا ہے،

""میری زیر نظر حمدیں، نعتیں اور سلام اس بات کے عین گواہ ہیں کہ میرا باطن رب العزّت کے حکم سے روشن ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ رجوع کرنے والوں کو بخشش عطا کرتا ہے۔""

ہم کرشن کمار طور کے اس وعدے پر صاد کرتے ہیں، کیونکہ حمد، نعت، سلام ایسی روح پرور وبصیرت افروز اصناف سخن پر طبع آزمائی کی توفیقات ان کے روشن باطن پر دلالت کرتی ہیں۔

ہم نے اپنے نعتیہ مجموعے ""رب آشنا"" کے حرف آغاز میں حمد، نعت اور منقبت کے حوالے سے چند معروضات رقم کی ہیں، ان میں سے بعض کو یہاں نقل کرنا بے جواز نہ ہوگا۔ حمد، نعت، منقبت تینوں عربی کے الفاظ ہیں اور ہم معنی ہیں۔ ہر لفظ کے لغوی معنی ہیں مدح، ثنا، تعریف۔ لفظ حمد اللہ کی تعریف، لفظ نعت اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء جبکہ لفظ منقبت آئمہ طاہرین، صحابۂ کرام، بزرگان دین اور دیگر مقدس ہستیوں کی مدحت کے لیے مخصوص ہے۔ البتہ سلام کے ایک سے زیادہ معانی ہیں۔ جن میں سے ایک معنی ہیں غزل کے انداز پر وہ نظم جس میں واقعات کربلا کا ذکر ہو۔ حمد کا لفظ غیر اللہ کی مدح اور نعت کا لفظ بجز ثنائے محمدؐ کی تعریف وتوصیف کے لئے احتراماً جائز نہیں۔

کرشن کمار طور کا تعلق ہندومت سے ہے وہ پہلے غیر مسلم شاعر نہیں جنہوں نے مدحیہ شاعری میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد غیر مسلم شعراء نے حمد، نعت، سلام، منقبت وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ رسالہ ""جہانِ حمد"" کے مدیر کی مرتب کردہ کتاب ""اذان دیر"" میں غیر مسلم شعراء کے حمدیہ کلام کا انتخاب شائع ہوا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے روایتی اسلوب شعر اختیار کیا ہے اور مانوس مروج مضامین پر اشعار کہے ہیں۔ جبکہ کرشن کمار طور کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے روایتی مضامین کے پہلو بہ پہلو اپنی بات کہنے کی بھی کامگار کاوش کی ہے۔ ان کے بعض حمدیہ اشعار عمومی حمدیہ اسلوب سے یکسر جدا ایک نئے طرز کلام سے متعارف کراتے ہیں اور اسلوب بیان کے ساتھ ساتھ مضمون ومواد کے اعتبار سے بھی تازہ کاری کا احساس دلاتے ہیں۔

شکست وریخت کے ان تپتے ریگزاروں میں
نسیم تازہ کا جھونکا بس ایک اس کا نام

سطر سطر سے عیاں اس کے ہر سخن کا لمس
کہ لفظ لفظ تراشا بس ایک اس کا نام

یہ اسی کے کرم کی ہے تصویر
ہے نہایت جزا، سزا محدود

وار دیں اس پہ سارے حرف ثنا
بے نشاں بے شمار میرا رب

مشکلیں کر تو سب آساں
اپنے ہونے کی کچھ نشانی دے

مشرک تجھ کو ذرا نہیں بھاتا
دھبّہ کس روشنی پہ رکھا ہے

کرشن کمار طور کے یہاں شعور حمد کی ارزانی ہے۔ وہ چاہیں تو سلیس و سادہ طرز بیاں اختیار کریں، چاہیں تو دانشورانہ انداز فکر سے کام لیں۔ حمد ہو یا نعت، سلام ہو یا منقبت مدحیہ شاعری میں تفکر ایک غیر معمولی وصف شعر تصور ہوتا ہے۔ اس جدّت کا سہرا بھی گنج معانی مرزا غالب کے سر ہے۔ ان کا یہ حمدیہ

شعرایک جہان معنی لئے ہوئے ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالبؔ کے اتباع میں کرشن کمار طورؔ نے بھی حمد میں فکر انگیز خیالات کی جوت جگائی ہے۔ان کی غزلیہ شاعری بھی سوچتی ہوئی شاعری ہے۔انہوں نے شعر میں سوچ کے تسلسل کو حمد،نعت،سلام میں بھی قائم رکھا ہے۔

جہاں میں کچھ بھی نہیں تیری ذات سے آگے
ہے تیرا عشق عیاں کائنات سے آگے

توہی شروع سفر ہے تو ہی ختم سفر
ترا وجود ہے سب ممکنات سے آگے

وہی کہ جس نے کیا کُن سے یہ جہاں پیدا
رقم ہوا ہے وہ سب واقعات سے آگے

کرشن کمار طور اوّل و آخر ایک شاعر ہیں۔وہ کوئی بھگت یا درویش نہیں ہیں۔لیکن ان کے یہاں بھگتی تحریک کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔برصغیر ہندو پاک میں مسلمان صوفیائے کرام کی آمد کے بعد مذہبی رواداری کی جو ایک لہر اٹھی تھی، اس کی حرکی قوت بھگتی تحریک تھی۔اس تحریک کے پرچم کشاؤں نے اسلامی تصوف سے استفادہ کرتے ہوئے بعض صوفیا کے افکار اپنے کلام میں پیش کئے۔یہ افکار دوہا نگاروں کے یہاں نسبتاً زیادہ ملتے ہیں۔انہوں نے بطور خاص وحدت الوجود (ہمہ اوست)، وحدت الشہود (ہمہ از اوست) اور مسئلہ جبر وقدر کے متصوفانہ نظریات وخیالات کی بحسن وخوبی تفسیر وتعبیر کی۔کرشن کمار طورؔ کے بعض حمد یہ اشعار میں بھی تصوّف کے مضامین کے شواہد ملتے ہیں۔

جو وہ دکھائے گا، مجھ کو وہی میں دیکھوں گا
نظر بھی اس کی ہے ذوقِ نظر بھی اس کا ہے

ہمیں تو چلنے سے ہے کام طورؔ چلتے ہیں
سفر نما بھی وہی ہے سفر بھی اس کا ہے

ہر ایک لمحے سے ظاہر فقط ہے اس کی ثنا
ہر ایک ذرّے میں ہے صورت خدا روشن

ہم ہیں اگر غموں کے سمندر میں غوطہ زن
اس میں بھی ہوگی تیری رضا اے مرے خدا

رونق بزم دوجہاں تو ہی
یہ زمیں تو ہی آسمان تو ہی

بھگتی تحریک کے رہنماؤں نے اس خطے میں جہاں مذہبی رواداری کا بیڑہ اٹھایا، وہاں مساوات انسانی کا علم بھی بلند کیا۔بلاشبہ انسانی مساوات کا درس انہیں اسلام نے دیا۔ہندو سوسائٹی، ذات پات کے نظام کی اسیر تھی، جو تذلیل انسانیت سے عبارت تھا۔لہٰذا اہل درد ہندو دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں نے ذات پات کے انسانیت سوز نظام معاشرت کے خلاف متفقہ طور سے آواز اٹھائی اور مساوات محمدی کی نظری اہمیت وافادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے عملی صورت دینے کی کوشش کی۔کرشن کمار طورؔ بھی انسان کی خلقی برابری کے نظریئے سے متاثر ہیں اور ذات پات کے نظام کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔بلکہ اس حوالے سے اسلام سے سمبندھ کے متمنی ہیں۔

ہم سارے اسلام کے ہوں
مدغم ساری ذاتیں کر

کرشن کمار طورؔ کی مدحیہ شاعری سے ایک قوی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ انہیں مطالعۂ قران کا شرف بھی حاصل ہے اور وہ مندرجات کتاب حکمت سے واقف وآگاہ ہیں۔انہیں یہ شعور بھی کلام الٰہی نے بخشا ہے کہ قرآن دراصل نعت سرکار ختمی مرتبتؐ ہے۔اس حوالے سے ان کا یہ شعر ملاحظ کیجیے۔جو بیک وقت سوال بھی ہے اور سوال کا جواب بھی۔

ہے رقم کس کی قرآن میں ذات وصفات
ہفت افلاک کا آئینہ کون ہے

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بیشتر اشعار حضور اکرمؐ کی سیرت کے ان پہلوؤں کو خاص طور پر اجاگر کرتے ہیں۔جن کی طرف قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے۔اس مقام پر ان آیات قرآنی کا حوالہ دینا مناسب ہوگا جن سے کرشن کمار طورؔ نے استفادہ کیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ ○ (سورۂ انبیاء: آیت۔۱۰۷)

ترجمہ: اور (اے محمدؐ) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔

وَمَایَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى○ (سورۂ نجم: آیت۔۴۔۳)

ترجمہ اور وہ اپنی خواہش سے کلام بھی نہیں کرتا ہے۔اس کا کلام وہی وحی ہے۔جو مسلسل نازل ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (سورۂ احزاب: آیت۔۵۶)

ترجمہ: بے شک اللہ اور اس کے ملائکہ رسولؐ پر صلوٰت بھیجتے ہیں تو اے صاحبان ایمان! تم بھی ان پر صلوٰت بھیجتے رہو اور سلام کرتے رہو۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَ لٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ وَ کَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (سورۂ احزاب: آیت۵۲)

ترجمہ:(لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ (سورۂ جمعہ: آیت۔۲)

ترجمہ: وہی ہے جس نے امیّوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۝ (سورۂ بنی اسرائیل: آیت۔۱)

ترجمہ: ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ (محمدؐ) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی جس کے چاروں طرف ہم نے برکت ہی برکت رکھ دی۔ تاکہ اس بندے کو اپنی خاص نشانیاں دکھائیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خدا سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

وہی تو رحمت اللعالمیں ہیں دنیا میں
زمانہ پوچھتا پھرتا ہے کیا محمدؐ ہیں

قرآں میں جو کچھ کہا خدا نے
طوؔر اس کی فقط دلیل ہیں آپؐ

اک آدمی کی اطاعت سے کچھ نہیں ہوتا
درود پڑھتا ہے خود بھی خدا محمدؐ پر

ہے یہ اک سلسلہ قائم شروع سے آخر تک
ہیں آدمؑ ابتداء اور انتہا محمدؐ ہیں

ایک پل میں خدا سے مل آئے
مرحبا ایسا عالم معراج

ادا ہوئی ہے زباں سے جو ایک اُمّی پر
کتاب تو ہے خدا کی عطا محمدؐ پر

ہمارے نزدیک رسول خداؐ کی نعت گوئی کا بنیادی تقاضا اور اساسی شرط جذبۂ عشق کی شعلگی ہے۔ جو مس خام کو کندن بنا دیتی ہے۔ یہ عشق نبیؐ ہی ہے، جس نے کرشن کمار طوؔر کو ثنا خوان محبوب کبریا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ عشق غیر اختیار و غیر مشروط ہوتا ہے اور ہر قبیل کی تحریر و پابندی سے مبرّا ہے۔ اسی بات کو کنور مہندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک شہرۂ آفاق شعر میں کس حسن سے بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

کرشن کمار طوؔر نے بیدیؔ جی کے لہجے میں عشق نبیؐ کا اظہار کیا ہے۔

کچھ مسلمانوں پر نہیں موقوف
میم حا میم دال سب کے لیے

بلاشبہ کرشن کمار طوؔر کے بعض نعتیہ اشعار شہادت دیتے ہیں کہ ان کا سرکار دو عالمؐ سے عشق کی حد تک تعلق خاطر ہے۔ ان کے منتخب اشعار کی زیریں لہروں میں تلاطم عشق نبیؐ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ہم اپنی جان بھی واریں تو کیا محمدؐ پر
نثار ہوتے ہیں ارض وسما محمدؐ پر

دل میں شعاع عشق سدا موجزن رہے
سرکارؐ کے بغیر تو جینا محال ہے

میرے کہاں کے بھاگ تھے سپنے میں آملیں
یہ کیسا سنجوگ ہوا میرے رسولؐ پیا

ہندو ہوں مگر یقین ہے اس پر
میرا دل، میری جاں محمدؐ

عشق سچا اگر رسولؐ سے ہے
روک سکتی ہے کون سی دیوار

آخر الذکر شعر عجب تیور لئے ہوئے ہے۔ اس شعر میں ایک غیر مسلم ہونے کے ناتے طوؔر نے ثابت کر دیا کہ

کوئی لیلیٰ کسی دیوار سے روکی نہ گئی

ہمیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ فی زمانہ منظر عام پر آنے والے بیشتر مجموعہ ہائے نعت میں ایسا نعتیہ کلام نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس میں سیرت نبوی پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ حالانکہ نعت کے معنی و مفہوم ہی اسوۂ حسنہ و مکارم اخلاق رسولؐ کی تعریف و توصیف ہے۔ کرشن کمار طوؔر ایک بالغ نظر شاعر ہی نہیں ایک صاحب مطالعہ مدیر و ادیب بھی ہیں اور انہیں نعت کی صنفی تقاضوں کا مکمل ادراک ہے۔ ان کے یہاں سیرت النبیؐ کے حوالے سے ایک فکر انگیز اسلوب ملتا ہے، جو شاعر سے زیادہ انہیں سیرت و کردار محسن انسانیت حضرت محمدؐ کے مبلغ کے طور پر پیش کرتا ہے۔

وہی ہے ہم کو عشق غیر فانی بانٹنے والا
وہی ہے وعدۂ جنت نشانی بانٹنے والا

وہی ہے جس نے لفظوں کو ضیاء بخشی ہے قرآں کی
وہی ہے نور علم آسمانی بانٹنے والا

وہی ہے جس نے پایا ہے لقب عالم کی رحمت کا
وہی ہے دشمنوں میں مہربانی بانٹنے والا

وہ جو غار حرا میں چمکتی تھی
ہاں اسی برق کے نشاں ہیں آپؐ

بڑائی اس سے زیادہ اب اور کیا ہوگی
صدائیں گونجتی ہیں بے صدا محمدؐ پر

دیکھنا یہ ہے حاجت روا کون ہے
وہ نہیں ہے تو مشکل کشا کون ہے

''رب آشنا'' کے پیش لفظ سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بایں ہمہ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ گزشتہ کم وبیش نصف دہائی کے دوران میں نعت کے حوالے سے صاحبان نور ونظر اور ارباب دانش وبینش کے فکری طرز عمل میں تبدیلی آئی ہے اور نعت کے فکری وفنی پہلوؤں پر مباحث کے در واہوئے ہیں۔ اس عرصے میں کہی جانی والی نعت کے متن (Taxt) کو پہلی مرتبہ زیر غور لایا گیا ہے۔ اور حمد ونعت کے درمیان حد فاصل قائم رکھنے کی ناگزیریت درخود اعتناء ٹھہری ہے۔ خاص کر نعت میں افراط وتفریط اور تنقیص سے گریز کا رجحان سامنے آیا ہے اور قرآن وسنت سے انحراف، نبوت کے استخفاف، ذم معنویت اور ابتذال وسطحیت پر ناپسندیدگی کا اظہار ہوا ہے۔''

ہم ایک خوشگوار مسرت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں کہ ''چشمۂ چشم'' کی نعت اُسی جدید نعت کی نمائندہ ہے جس کی طرف درج بالا اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے۔

''چشمۂ چشم'' کا تیسرا دروازہ سلام کی جانب کھلتا ہے۔ کرشن کمار طورؔ کو حمد ونعت کی طرح سلام کہنے کا بھی سلیقہ ہے۔ ان کا سلام یہ باور کرانے میں کامگار ٹھہرا ہے کہ طورؔ کو معرفت حسینؑ نصیب ہے۔ ان کا سلام پڑھ کر جو پہلا تاثر دل ودماغ پر مرتسم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی نے جو بصد ایقان ایک نعرہ بلند کیا تھا وہ برحق تھا۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

محولہ بالا شعر میں جوشؔ نے جو کچھ کہا اس کا ادعا خود کرشن کمار طورؔ کو بھی ہے۔

ساری دنیا میں جو سنائی دے
اب اک ایسی مگر صدا ہے حسینؑ

کرشن کمار طورؔ کے شامل اشاعت تمام سلام ان کی معراج عشق امام عالی مقام کے شواہد فراہم کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ان کے عرصۂ حیات کے روح رواں حسینؑ ہیں۔

رب نہیں ہے جہان رب ہیں حسینؑ
سچ کہوں میرے روز شب ہیں حسینؑ

نواسۂ رسولؐ سے طور صاحب کی عقیدت کا پھر تو درج ذیل اشعار میں مزید واضح صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

میری آنکھ میں روشن اس کا نزم نزول
میرے ہر سپنے کی ہے تعبیر حسینؑ

یہ فیصلہ بھی کسی روز ہو رہے گا طورؔ
کسے کسے یہاں غم ناک رکھ رہے ہیں حسینؑ

کربلا میں نہیں فقط ان کا
ہے ہمارا بھی امتحان حسینؑ

کچھ خبر بھی ہے اے زمانے تجھے
زیست کرنے کا ایک ڈھب ہیں حسینؑ

وہ ہے کیا جرأت اظہار ہمیں
تو ہی سر ہے تو ہی دستار ہمیں

بابا گرونانک کے حوالے سے یہ ایک مصدقہ روایت تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے کہ ان کی وفات کے بعد مسلمانوں اور سکھوں میں تدفین کے سلسلے میں تنازع کھڑا ہو گیا۔ مسلمان بابا کے اسلامی تعلیمات سے عمل کی حد تک انسلاک پر انہیں مسلم باور کرتے تھے اور ان کی شرع اسلامی کے مطابق تجہیز وتکفین پر اصرار کرنے لگے۔ جبکہ سکھ انہیں اپنا گرو قرار دے کر اسلام سے ان کے کسی تعلق کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے اور ان کی آخری رسومات اپنے طور طریقوں سے ادا کرنے پر مصر ہوئے۔ کرشن کمار طور نے حمد، نعت اور سلام میں جس طرح کے ایمان وایقان کا اظہار کیا ہے، کل کلاں وہ کسی نزاعی صورت حال کا پیش خیمہ نہ بن جائے کہ کرشن کمار طور یہ کہتے پھریں۔

واعظ کم نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

☆

''چہارسُو''

# ''فریاد کرنے والے''

(انتخاب اختصار)

فیصل عظیم (کینیڈا)

وہ لوگ جو ستم ایجاد کرنے والے ہیں
ہماری مٹی کو برباد کرنے والے ہیں

اگر انہیں نہیں فرصت یہاں پہ سننے کی
تو ہم بھی کب بھلا فریاد کرنے والے ہیں

وہ جان دیتے ہیں رکھتے ہیں جو وفا کو عزیز
جو یاد کرتے ہیں وہ یاد کرنے والے ہیں

میں اک پرندہ ہوں اڑنا مرا مقدر ہے
مجھے خبر ہے جو صیّاد کرنے والے ہیں

یہی وہ خاک ہے جو خود کر رکھتی ہے روشن
یہی وہ لمحے ہیں جو شاد کرنے والے ہیں

اگرچہ وقت برا ہے مگر یہاں اک روز
بہت سے لوگ ہمیں یاد کرنے والے ہیں

جو ہے یقین ظفر یاب تو خدا پہ ہے طوؔر
یہ بت فقط ہمیں برباد کرنے والے ہیں

...... O ......

گھر کے علاوہ اور بھی ہے گھر لگا ہوا
آنکھوں کے آگے جیسے ہو منظر لگا ہوا

آواز دے رہا ہے بھلا آسماں سے کون
اک شور سا ہے اپنی زمیں پر لگا ہوا

امکاں شب وصال کا شاید قریب ہو
وہ ہے مرے بدن سے برابر لگا ہوا

اس کا سلوک اس کے نفی ربط کا ہے عکس
اندر کا انتخاب ہے باہر لگا ہوا

لپٹے ہوئے ہیں اس کے قدم سے ہم اس طرح
دیوار میں ہو جیسے کوئی در لگا ہوا

یہ سر ہی اب ہے اپنے لئے ایک دردِ سر
پرواز سے ہے جیسے کوئی پر لگا ہوا

اس کو مثال ایسے کریں اس جہاں میں طوؔر
ہو پھول جیسے باغ کے اندر لگا ہوا

بھرے جہان کو حیرت میں ڈال سکتا ہوں
جو تو کہے تجھے دل سے نکال سکتا ہوں

کسی کے سامنے جھکنا مجھے نہیں منظور
ترے وصال کو میں ہنس کے ٹال سکتا ہوں

جو چھپ کے بیٹھا ہو مجھ میں جہاں کی نظروں سے
کب ایسے شخص کو باہر نکال سکتا ہوں

وہ ایک بار تو کہہ کے مجھے ذرا دیکھے
میں اس کے غم کو سدا دل میں پال سکتا ہوں

میں آ بھی سکتا ہوں لوگوں کے کہنے سننے میں
میں اس کی سمت بھی پتھر اچھال سکتا ہوں

اشارہ کر کے تو دیکھے بس ایک بار وہ آنکھ
میں کل کے وعدے پہ دنیا کو ٹال سکتا ہوں

یہ زیست بوجھ بنی جا رہی ہے مجھ پر طوؔر
میں اپنے آپ کو کب تک سنبھال سکتا ہوں

فصل دل آجکل ہری کم ہے
میری دنیا سے دوستی کم ہے
تو نبھائے گا یہ تو ہے معلوم
کچھ ہماری ہی زندگی کم ہے
آ کہ پھر وصل سے ہوں دونوں شاد
اب چراغوں میں روشنی کم ہے
کیا کہیں دہر کا الف نامہ
یہاں آنسو بہت ہنسی کم ہے
خود میں کھلنے کے دن ہیں اب نزدیک
عمر جیسی بھی ہو رہی کم ہے
لطف اس آنکھ کا کہیں بھی تو کیا
جو زیادہ تھا اب وہی کم ہے
دوست یوں تو بہت ہیں اچھے طورؔ
ان گلوں میں بس اک نمی کم ہے

...... O ......

سوچتا ہوں اک عالم سرشاری میں
دشمن جان تو میں خود تھا تری یاری میں
اب تو بس رنجش بازار ہے بازار کے بیچ
ہم نے دل بیچ دیا شوق خریداری میں
میرے جینے کے لئے اب یہ کوئی کم تو نہیں
شائبہ ہاں کا بھی کچھ ہے تری انکاری میں
خود سے بچھڑے تو کہیں جا کے یہ احوال کھلا
بند ہم آنکھیں کئے بیٹھے تھے بیداری میں
جو اماں جان کی پاؤں تو یہ پوچھوں اس سے
وقت اور کتنا لگے گا تری دل داری میں
اک فقط تم پہ ہی موقوف نہیں طورؔ یہاں
مبتلا اور بھی ہیں عشق کی بیماری میں

نہیں چاہا تھا ایسا ہو گیا ہے
اسے دیکھے زمانا ہو گیا ہے
سنا ہے ہم اکیلے رہ گئے ہیں
سنا ہے تو کسی کا ہو گیا ہے
قیامت ٹوٹنی تھی جس پہ ٹوٹی
جسے ہونا تھا اچھا ہو گیا ہے
زمانہ راستہ روکے کھڑا تھا
مگر اک شخص میرا ہو گیا ہے
یہاں سنتا نہیں کوئی کسی کی
عجب کچھ رنگ دنیا ہو گیا ہے
کہاں کا میں، امید وصل کیسی
یہ منظر کب کا دھندلا ہو گیا ہے
محبت ہی نہیں باقی کسی میں
جہاں بھی تیرے جیسا ہو گیا ہے
ہے یہ بھی ایک صورت رنج کی طورؔ
یہاں جو دل سے چاہا ہو گیا ہے

...... O ......

یہ زخم کس کو دکھاؤں خدا کے ہوتے ہوئے
کوئی صدا نہیں زنجیر پا کے ہوتے ہوئے
مرے ضمیر کی مجھ پر ہے آنکھ ہر لمحہ
میں پھر رہا ہوں برہنہ قبا کے ہوتے ہوئے
یہ بات دیکھیں تو لگتی ہے غیر معمولی
غبار چھایا ہوا ہے ہوا کے ہوتے ہوئے
یہی تو دیکھنا تھا کھولتا اگر تو کیا
یہاں پہ میں ترے بند قبا کے ہوتے ہوئے
یہ بات کس سے کہیں اور کسے سنائیں طورؔ
کہ اپنی جھولی ہے خالی دعا کے ہوتے ہوئے

# ستارۂ ہفت رنگ

کرشن کمار طور

پرت پال سنگھ بیتابؔ کا غالب اور بار بار آور رجحان تصوف کا اعلامیہ رہا ہے۔شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ان کے مختلف نوع کے تجربات انہیں بالواسطہ نہ سہی بلاواسطہ اس طرف رجوع کی دعوت دیتے رہے ہیں۔کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ہر اچھا شاعر اپنے اشعار میں ہر موضوع سمو کر اسے آفاقی شاعری کی سطح تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔بیتاب نے بھی تقریباً حیات وممات کے شانہ بہ شانہ تصوف کو اپنے مخصوص انداز میں شعر کی اساس بنایا ہے اور ایک ایسی فضا کی تعمیر وتشکیل کی ہے جس میں حق ہو اعلامیہ نہ سہی لیکن ایک نامعلوم زیریں لہر کی طرح ان کی نظموں میں موجزن رہتا ہے۔اب ایسا بھی نہیں ہے کہ قاری کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے کسی دقت کا سامنا کرنا پڑے یا پھر ان کی نظموں میں سے وہ مطالب اخذ کرنے پڑیں جنہیں وہ اپنے مفید مطلب سمجھتا ہے اور جو دراصل نظموں کے متن میں موجود نہیں ہوتے۔

شاید مشہور صوفی شاعر سچل سرمست نے کہا تھا۔''فیرو چھوڑا ہجر دا وڈا جے نہ تکیا ماہی/ ویکھ لیا تے ساہنوں جانیں/ مفت پیاں نے اکھیاں'' (اگر محبوب کا دیدار نہ ہو تو یہ ہجر کی انتہا ہے اور اگر میں اسے دیکھ سکوں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ آنکھیں اس کے دیدار کی خاطر ہی مجھے مفت میں نصیب ہوئی ہیں)۔صوفی شاعر سچل سرمست کے اس دوہڑے میں تین بنیادی الفاظ اس کی اساس بن کر سامنے آتے ہیں، سامنے نظر آتے ہیں۔ہجر، دوست اور دیدار، اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو صوفی شاعری کا اصل، قویٰ اور بنیادی تحرک اور تمام تر احساس ان تین لفظوں کے پیچھے ہی سرگرداں نظر آتا ہے۔صوفی ازم، روحانیت اور رہبانیت تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں جن کا مطلب ہے ذکر وفکر میں مشغول ہو کر اپنے خدا کی طرف دھیان اور لو لگانا۔اسلام میں بھی اور سکھ دھرم میں بھی مذکور ہے کہ ہر ذی شعور اور صاحب عقل پر لازم ہے کہ وہ اپنی حیات میں ہر روز چند ایسی گھڑیاں وقف کر سکے جن میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے اپنے رب سے سرگوشی کر سکے اور اس خدائے برتر کی ذات کو خود میں جذب کر سکے۔ایسا انسان خدا کی یاد میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب سے ہم کلام ہے اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب وہ اپنے اندر احتساب اور نو دریافت کا جذبہ ارتقا ہوتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔یہی وہ جذبہ ہے جو اس کے اندر خالق کی تخلیقات پر غور وفکر کا مزاج پیدا کرتا ہے اور وہ کائنات کی ہر تخلیق میں خالق کی وجودیت اور اس کا مظہر تلاش کرنے کی سعی میں مشغول ہوتا ہے۔

''میں نے کتنی بار جنم لیا/ کتنی بار میری موت ہوئی/ کتنی بار میں نے شہادت پائی/ کتنی بار میں کتے کی موت مرا/ اتنا کچھ ہونے کے بعد/ جب آنکھ کھلی/ تو میں نے دیکھا/ کہ وہی پھٹا پُرانا لباس/ جسے میں اپنے خیال میں/ بدل چکا تھا/ میرے جسم پر/ بدستور موجود ہے'' (بدستور) ''کرم بھومی میں/ گیان مارگ کی پستکیں/ کام نہیں آئیں گی/ وہاں تو راستے خود کھوجنے پڑتے ہیں/ گیان تو/ راستوں کے کھوجنے/ ان کے ملنے اور نہ ملنے/ کے معاملات کے درمیان/ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے'' (کرم بھومی میں) ''نہ کوئی رابطہ ہے نہ کوئی سلسلہ ہے/ میں خود اک آہنی دیوار ہوں اس گھر کی خاطر/ مرا گھر کس قدر محفوظ ہے ہر اک بلا سے/ بری اچھی ہوا سے/ مگر راتوں میں اٹھ اٹھ کر/ میں اکثر سوچتا ہوں/ میرا گھر اک کرائے کا مکاں ہے/ نکلنا ہے مجھے اک دن یہاں سے/ تو پھر میں کیوں سجاتا ہوں/ درودیوار اس کے/ یہ روغن یہ سفیدی/ یہ سب کس لئے ہیں''۔(ایک نظم) ''تمام دروازے/ مری دستک پر کھل گئے ہیں/ مگر میں ہوں/ کہ دہلیز پر کھڑا ہوں/ میں اس عمارت تک آتے آتے/ بدل گیا ہوں/ وہ شئے جس کی تلاش/ مجھ کو گھمارہی ہے/ یہاں نہیں ہے/ بالکل ایسی ہی اک عمارت/ کو چھوڑ کر چلا تھا/ اک دن صفر سے چل کر صفر تک آنا/ نہیں نہیں/ یہ بھی کوئی انجام ہے سفر'' (نظم) ''میں جنگل سے بھاگوں/ جنگل میرے پیچھے بھاگے/ خوف نہیں ہے/ خوف ہے ان میدانوں سے/ ہر گام پہ جنگل گہرا ہے/ میں جنگل سے جتنا بھاگوں/ جنگل اتنا/ میرا اندر اگتا ہے''
(ایک نظم)

میں نے پرت پال سنگھ بیتاب کی نظموں کے مطالعے سے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ان کی نظموں میں خود سے قریب آنے کی بجائے دور جانے کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔اسے آپ Alienation کی شاعری سے بھی متصوف کر سکتے ہیں۔ان کی شاعری میں تنہائی، فردیت، دربدری، بے گھری، ایک نامعلوم سا خوف، عدم اطمینان، کشیدہ گزیدہ تعلقات انسانی، لاحاصل غرضیکہ آج کے دور کے تمام تر رجحانات وافر طور پر موجود ہیں۔ان کی نظمیں اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ ان کی شاعری میں عام طور پر اور نظموں میں خصوصی طور پر موضوعات کے اعتبار سے جدیدیت موجود ہے بلکہ یہ نظمیں عصری اثرات سے مملو اور پُر ہیں۔ان کا اسلوب بھی رسمی اور روائیتی سے زیادہ فکری، نفسیاتی اور جذباتی محرکات سے روشن پذیر ہے۔یہ نہیں کہ یہ تمام تر رجحانات قبل از جدید شاعری میں ایک نہ ایک وقت میں موجود نہیں تھے لیکن پرت پال سنگھ بیتاب نے انہیں جس شعری سطح پر خلق کیا ہے وہ انہیں ہماری موجودہ شاعری میں بیش از قیمت ارتقائی حسن سے مملو کرتی ہے۔ان کی نظموں میں منطقی ربط بڑی حد تک ابھر کر صفاتی دائرے میں داخل ہو گیا ہے۔نظم گوئی کی تخلیقی سطح پر یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ اسے ان کا جدت آمیز رویہ کہنا بہت مناسب ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنے موضوعات کو ظاہری پرت سے ہی مس نہیں کیا ہے بلکہ وہ اس کے بطن تک لہو آمیز

ہوئے ہیں اور بے شک ایسے گوہر کھنگال کے لائے ہیں جن کی طرف بادی النظر میں دھیان بھی منعطف نہیں ہوتا۔

بیتاب کے ہاں حالانکہ اقدار کے نفی اثرات ایک مرغوب موضوع کے طور پر موجود ہیں اور وہ ہر اصول کو رد کرتے ہوئے بھی اپنی نظموں میں نظر آتے ہیں لیکن وہ پھر بھی مسرت کے حصول کے لئے اور اطمینان کی خاطر کوشاں بھی دکھائی دیتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی سے کمٹمنٹ کی ایک اعلیٰ اور روشن مثال ہے۔

''آج رستہ خود اپنے گھر کا/ نہیں مجھ کو ملتا/ کہ میں پورے چودہ برس بعد/ اپنے ہی سامنے/ اٹھ رہی اونچی اونچی عمارات کو/ دیکھ کر بھی نہیں دیکھ پایا کبھی/ لمحہ لمحہ بدلتی ہوئی اپنی تاریخ سے/ یوں ہی انجان رہتا ہمیشہ/ ایک بن باس کے بعد/ واپس نہ آتا جو میں'' (نظم) ''ہر اک کروٹ ہراساں/ ہر اک بستر پریشاں/ بھلا اس خوف کے عالم میں/ کوئی سو سکا ہے'' (ایک نظم)

''گھٹن کم ہو رہی ہے/ گرد چھٹنے لگی ہے/ دھوپ کھل اٹھی ہے/ ہواؤں کے ساز بجنے لگے ہیں/ دیواروں میں دروازے کھلنے لگے ہیں/ غیب کے رموز ظاہر ہونے لگے ہیں/ لیکن یہ سب اچانک/ تمام توقعات کے خلاف/ ہوا کیسے/ کہیں وہ گھڑی تو نہیں آ گئی'' (شاید) ''کبھی سوچتا ہوں/ کہ اپنے اندر اُگے ہوئے/ سارے گھنے جنگل کو/ کاٹ ڈالوں/ لیکن پھر سوچتا ہوں/ کہ یہی تو میری پناہ گہ ہے/ یہ نہ رہے گا/ تو میں چھپوں گا کہاں'' (گھنا جنگل مری انا کا) ''مرے بطن میں/ ایک بچہ ہے کتنے یگوں سے/ جوانی بڑھاپا/ بقا و فنا/ سب کو دیکھا ہے اس نے/ اسے وقت پر میں نے پیدا نہ ہونے دیا/ میں کہ اپنے سے اس کو جدا دیکھ سکتا نہ تھا/ اب وہ بچہ مرے اندر ہی اندر/ مرے قد سے اونچا ہوا جا رہا ہے/ میں سلیقے سے اس کو/ پیدا نہ کر پاؤں گا/ مجھ کو خدشہ ہے/ کہ وہ ایک دن/ توڑ دے گا سارے حصار/ اور میرے مقابل کھڑا ہو کے گھورے گا نفرت سے مجھ کو'' (ماضی اور مستقبل) ''اپنے گھر کی کھڑکیوں کو/ بند رکھنا ہی مناسب ہے یہاں/ گھر سے باہر کے مناظر/ دیکھنے میں لطف ہے/ اور جو باہر سے کوئی/ اندر کا منظر دیکھ لے/ تو آدمی جو فطرتاً اک جانور ہے/ چیخنے چلانے لگتا ہے بہت'' (ایک نظم) ''یہ کھڑکی/ ہواؤں کو شب بھر/ ترستی نگاہوں سے تکتی رہی ہے/ گئی رات تک/ ایک شب پر پھڑکتا رہا ہے/ افق اپنی مشعل جلانے کو ہے/ سرخ کی پالکی/ ہر نظر کی سیاہی میں/ عکس اپنا جھلکا رہی ہے/ مگر ایک کھڑکی پریشان ہے'' (نظم)

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ نظم کی جملہ خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو غزل کے برعکس یک رنگی کے عذاب سے بچاتی ہے۔ جب نظم میں مشاہدہ، فکر اور گہرے مطالعے کی باطنی زیریں لہر موجزن ہو تو اس کی افادیت اور تاثیر میں یک گونہ اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ سچے جذبات کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ نظم میں انسان اپنے ہونے کے سراغ کو دریافت کرتا ہے تاکہ اس چراغ آئینہ روشنی میں خوشیوں کی خواہش کر سکے اور غموں کی تلخ انگیزی کا احساس بھی۔ نظم سچے جذبات کی عکاس ہوتی ہے اور اس کا تخلیقی پرزم Prism امکانی طور پر حقیقت اور ادراک کا خوش گوار تجربہ ثابت ہوتا ہے۔ پرت پال سنگھ بیتاب کی چند نظموں سے یہ اقتباس میری اس دلیل میں خاطر خواہ امتیاز کے ساتھ داخل ہوں گے۔ ''باندھ کو توڑ کر/ اس نے/ میرے اندر رکے ہوئے/ سیلاب کو/ رواں کر دیا/ میں اسے بددعائیں دوں/ یا اس کی تعظیم کروں'' (تذبذب) ''چشمے کی مدد سے دیکھتے ہوا/ اور کہتے ہو کہ ہائے/ دنیا کتنی خوبصورت کتنی پیاری ہے/ کبھی اسے اتار کر/ اپنی آنکھوں سے سب دیکھو/ تو تمہیں معلوم ہو/ کہ جنت کی حقیقت کیا ہے/ لیکن تم ایسا نہیں کرو گے/ کیونکہ تمہیں یہ سب جو/ خوبصورت پیارا پیارا دکھائی دیتا ہے/ یہ تو چشمے کا کمال ہے/ فقط مایا جال ہے'' (گر تو برا نہ مانے) ''لمحہ لمحہ نیلیگوں میں/ گرد گھلتی جا رہی ہے/ اُف یہ گاڑی اب/ یہیں پر روک دو/ سامنے خطرہ لکھا ہے/ اور آگے/ ایک اندھی کھائی ہے/ جس میں/ ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے/ کتنے جہاز/ میلوں نیچے غرق ہو کر/ کھو چکے ہیں (ایک نظم) ''مال تو اکثر بک جاتی ہے/ لیکن بات نہیں بن پاتی/ مول بھاؤ کی بات نہیں ہے/ بات تو اپنی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ہے/ جیسے جیسے گٹھری کو خالی کرتا ہوں/ گٹھری وزن میں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے/ سر سے بوجھ اتاروں کیسے/ سوچ رہا ہوں/ میں بنجارہ جنم جنم کا/ اپنی ذات کو بیچ رہا ہوں'' (بنجارہ) ''نظر میں دھول/ میری پیٹھ پر جنگل اگا ہے/ میرے سینے پر اک سنگ گراں ہے/ چلوں تو پاؤں میں کہرا جما ہے/ اڑوں تو ہر طرف/ کنج قفس ہے/ مگر اندر ہی اندر/ خواب کیا کیا پالتا ہوں/ بلاتی ہیں/ پہاڑوں کی سہانی چوٹیاں مجھ کو/ میں اپنے خول سے/ باہر نکلنا چاہتا ہوں'' (قفس) ''غلاموں کے نگر میں/ کس لئے پیدا ہوا میں/ میرے اندر لوازم وہ سبھی موجود ہیں/ آزاد ہونے کے لئے/ جو ہیں ضروری/ کبھی میں سوچتا ہوں/ چھلانگ ایسی لگاؤں/ کہ اس بستی سے/ اُس بستی میں پہنچوں/ مگر ایسا کہاں ہوتا ہے/ مجھ سے/ اپنے کالے رنگ کو/ ان گوری بستی والوں میں/ کیسے کروں شامل/ کہ جو کہتے ہیں/ کالے گورے سب ہیں اک برابر/ وہ مجھ کو/ میرے کالے رنگ سے پہچانتے ہیں'' (شناخت کا المیہ)

نظموں کی ادبی اور شعری حیثیت کے ساتھ ساتھ معاشرتی حیثیت بھی قابل ذکر ہے۔ نظم کی اجتماعیت میں جو قوت پنہاں ہے اس سے انکار کوئی کافر ہی کر سکتا ہے۔ پرت پال سنگھ بیتاب کا اثباتی انداز فکر ان کی مادی اور روحانی بقا کے لئے ضروری بھی اور باعث تعظیم بھی۔ اس کا ذکر میں اپنی کسی سابقہ تحریر میں بھی کر چکا ہوں اور اس مضمون میں اس کا اعادہ کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا کہ اس بحر بے کراں کے لئے بیتاب کی شاعری ایک سفینے کا کام کا ادا کرتی ہے۔ خاص طور پر وہ اپنی نظموں میں موضوع کو جس خوبی اور ہنرمندی سے منطقی انجام تک پہنچاتے ہیں میری نظر میں اسے خیر سعادت سے کسی کم کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس دور بے ثبات میں کتنے ایسے شاعر ہیں جو عصر حاضر کی نبض نہ صرف پہچانتے ہیں بلکہ اسے منطقی دلیل کے ساتھ انجام تک پہنچاتے بھی ہیں۔ پرت پال سنگھ بیتاب کی نظمیں منفی رجحانات کی بجائے مثبت آمیز رنگا رنگی لئے ہوتی ہیں کیونکہ ان میں بیتاب کے تجربے کی پختگی نہ صرف موجود ہے بلکہ ظاہری طور پر عیاں بھی ہے۔ جیسا کہ میں

نے عرض کیا بیتاب نے اپنی نظموں کی تعمیر و تشکیل کچھ اس انداز سے کی ہے کہ یہ ان کی ذہنی اور جذباتی آہنگ کی مثال بن گئی ہیں۔ نظم ان کی تاثراتی تشخص کی پہچان بھی ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی مظاہر بھی کیونکہ غالب نے بھی تو اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعت کا مطالبہ کیا تھا۔ ''ہر صبح اک نیا روپ بنا کر/ گھر سے نکلتا ہوں/ اور پھر/ ہر قدم اک اور پھر/ اور پھر اور/ نئے سے نئے/ روپ دھار لیتا ہوں/ شام تک/ کئی کئی بھیس بدل کر/ اس رنگ برنگی دنیا میں/ کسی نہ کسی طرح/ اپنا دن/ گذارتا ہوں/ لیکن یہ سارے روپ دھارتے ہوئے/ مجھے/ یہ احساس بھی رہتا ہے/ کہ میرا/ اصل روپ/ تو کچھ اور ہی ہے/ جو میرے اندر ہے/ اور جو میں/ کسی کو دکھاتا ہی نہیں/ یا شاید/ اس روپ کو/ کوئی دیکھنا ہی نہیں چاہتا/ میں دنیا کو/ اپنے وہی/ روپ دکھاتا ہوں/ جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں/ اور جو میرے نہیں ہیں/ لیکن ان سب کے پیچھے/ یہ احساس رہتا ہے/ کہ میرا اپنا ایک اصل روپ بھی ہے'' (میں بہروپیا نہیں ہوں) ''کبھی کبھی سوچتا ہوں/ اپنے ساتھ زبردستی کروں/ اور جب/ بچنے کی تمام کوششیں/ ناکام ہو جائیں/ تو زنا بالجبر کا/ پورا پورا/ لطف اٹھاؤں'' (کہتا ہوں سچ) ''کرم بھومی میں/ گیان تو/ راستوں کے کھوجنے/ ان کے ملنے اور نہ ملنے/ کے معاملات کے درمیان/ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے'' (کرم بھومی میں) ''ہمیں سے پوچھی ہوئی باتیں/ گھما پھیرا کے ہمیں بتا دیتے ہو/ اور سمجھتے ہو/ کہ ہم/ تمہارے بخوم سے متاثر ہو گئے ہیں/ دراصل ہم/ تمہارے علم کی/ حقیقت کو جانتے ہیں/ لیکن جو بھرم/ تم نے بنایا ہوا ہے/ اسے قائم رکھنے کے لئے/ قائم رکھتے ہیں/ اس لئے نہیں/ کہ ہمیں/ تم سے کوئی ہمدردی ہے/ بلکہ اس لئے/ کہ اس سے ہماری اپنی/ چھٹی حس کی تشفی ہوتی ہے'' (ہم کو معلوم ہے)

اردو شاعری میں غزل کے شعر کے حوالے سے تو آپ نے سہل ممتنع اور یہ بھی ہمارے دل میں ہے والی بات کم و بیش سنی، پڑھی اور خود پر وارد ہوتی ہوئی دیکھی ہو گی لیکن کیا نظموں کے مصرعوں اور لائینوں میں بھی یہ ممکن ہے۔ نظم کی ہر لائن ایک دوسرے سے مربوط اور پیوست ہوتی ہے۔ اگرچہ آجکل بہت سے اصحاب تجربہ، جدت اور شہرت کی خواہش میں یک سطری نظمیں خلق کر رہے ہیں گو ان کے لاشعور میں وہی غزل کا حسن شورانگیز کارفرما ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے بیتاب کی نظمیں پڑھتے ہوئے کچھ ایسی خود رفتگی کا احساس کیا ہے کہ جسے ذہن کی بجائے دل ہی جواز کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں کی سطروں کی سطریں آپ بے محابا داخل زیست اور ورد ہان خود کر سکتے ہیں۔ یہ مصرعے کچھ ایسے وارد ہوتے ہیں جو اپنی نوعیت، فطرت اور ساخت کے حوالے سے ایک اکائی اور وحدت کا اعلامیہ بن جاتے ہیں بلکہ یہ مفردات ایک مرکب اثرات کے حامل بھی ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ کریں اور ان سے حظ اٹھائیں کیونکہ پرت پال سنگھ بیتاب کو اپنی بات کہنے کا ہنر آتا ہے اور یہ کوئی معمولی واردات نہیں ہے۔

کبھی شہر کے بیچ ابھرتے ہوئے شہر کو دیکھ پایا نہ میں

افق اپنی مشعل جلانے کو ہے۔

وہ شئے کہ جس کی تلاش مجھ کو گھما رہی ہے یہاں نہیں ہے۔

پانیوں پر منقش جو تحریر ہے۔

پانی تو ہر حال میں پانی ہوتا ہے۔

کسی کو خبر تک نہ ہو میرے انجام کی۔

مجھ کو جنت سے جب جب نکالا گیا۔

میں کہ دروازے پہ دستک دے رہا ہوں۔

اپنے ننگے جسم اگر دیکھو گے تو گھبرا جاؤ گے۔

اک شکستہ پا کہ محروم سفر ہے۔

اپنا ہو کر بھی جیسے سب کچھ سب کا ہو۔

رخت سفر باندھے ہوئے نکلے زمینوں کی طرف۔

لیکن اس کے سب انداز غلط ہوئے۔

میں اس گنبد میں داخل ہو گیا ہوں۔

اب کوئی ساری رتوں کو کس طرح یکجا کرے۔

درد کے احساس میں لذت جو پنہاں ہے۔

سب صحیفوں کو جلا کر راکھ کر دوں۔

دیواروں میں دروازے کھلنے لگے ہیں۔

جس کے اندر تک رسائی آج بھی ممکن نہیں۔

جو پرندے دور افق کے ساتھ اڑتے ہیں۔

اک قدم آگے بڑھانے میں بھی لگتے ہیں زمانے۔

## جہانِ ناپائیدار

نامور شاعر، انشائیہ نگار، نقاد اور ماہر تعلیم پروفیسر اکبر حمیدی بارہ دسمبر ۲۰۱۱ء اس جہانِ ناپائیدار کو خیر باد کہہ گئے۔ مرحوم کا ادبی سفر نصف صدی پر مشتمل تھا جس میں کئی درجن کتب اُن کے قلم کے ذریعے منظرِ عام پر آئیں۔ اکبر حمیدی صاحب احباب کا وسیع حلقہ رکھنے والے انتہائی شریف النفس باوضع اور باوفا انسان تھے۔ اردو دنیا بالخصوص اسلام آباد کے اہلِ قلم کے لیے یہ بڑا نقصان ہے جس کا خلاء مدّت تک محسوس کیا جائے گا۔

# ''قلزمِ ہستی''

## حمد باری

مانا کہ گنہگار ہوں، پُتلا ہوں خطا کا　　خُوگر ہوں بہرحال تری حمد و ثنا کا

تجھ سے نہ ہو کیوں گردش ایام کا شکوہ　　خالق ہے کوئی اور بھلا ارض وسما کا

اللہ، کہاں ہیں وہ زمانے کے رفوگر　　صد چاک گریباں ہے مِلّت کی قبا کا

وہ دورخراب ہے کہ مرے پاک وطن میں　　ہر شخص نظر آتا ہے بمبار لڑاکا

ہیں ملک خداداد میں امریکہ کے صدقے　　ہر روز ڈرون حملے، ہر اک روز دھماکا

مرجاتے ہیں، اوروں کو وہ مارانہیں کرتے　　تازہ جو کیا کرتے ہیں آئین وفا کا

دیوانوں کوگذرے ہوئے اک عرصہ ہوا ہے　　پھر بھی ہے ترے کوچے میں اک شور بلا کا

بے خوف جیا کرتے ہیں وہ مردخودآ گاہ　　دل میں جونہیں رکھتے کوئی خوف قضا کا

ڈرتے ہیں صنم ضربِ براہیم سے اب بھی　　فرعون کو ڈر اب بھی ہے موسیٰ کے عصا کا

اک اس کے سوا اورکسی کو نہ پکارو!۔۔۔　　ٹھہرے ہوئے پانی میں نہیں کرتے چھنا کا

یہ قلزم ہستی ہے کہ ہے قطرۂ نا چیز　　صحرائے نفس ہے کہ یہ جھونکا ہے ہوا کا

انسان کو جو کچھ بھی دیا تُو نے دیا خُوب　　اندازہ بھلا کیا ہو ترے جودو سخا کا

وہ زہد و عبادت کی رِدا چاہیے مجھ کو　　جس میں نہ کوئی داغ نہ دھبّا ہو ریا کا

حاضر ہے مرا عود سخن حمد بداماں،　　احسان اٹھائے نہ کوئی بادصبا کا

کیا ہوگی خیالؔ اس سے زیادہ مری تعریف
اک ادنیٰ سا انسان ہوں، بندہ ہوں خدا کا

خیالؔ آفاقی (کراچی)

## نعت

ہمارے نبی ؐ کا مدینہ تو دیکھو
کرو چشمِ دل کو جو بینا تو دیکھو

نبی ؐ کی محبت سے سَرشار ہے جو
وہ دِل کا مدینہ ، وہ سینہ تو دیکھو

وہ جس نے بھی دیکھا ہے شہرِ مدینہ
یہی کہہ رہا ہے، مدینہ تو دیکھو

وہ بطحا کے باسی، وہ سُکانِ طیبہ
زَہے زندگانی ، وہ جینا تو دیکھو

وہ پیاروں کے مَدفن ہیں قدموں کی جانب
وہ ہیرے ، جواہر، دفینہ تو دیکھو

دو شنبہ ولادت، دو شنبہ ہی رحلت
نبیؐ کا مبارک مہینہ تو دیکھو

وہ گُنبد، وہ روضہ، وہ روضے کی جالی
وہ ساغر، وہ بادہ، وہ مینا تو دیکھو

فضائیں یہاں آج تک مشکبو ہیں
نبیؐ کا مُعنبر پسینہ تو دیکھو

حسینؓ و حسن ؓ، فاطمہؓ روشنی ہیں
محمد ؐ کا نُوری سفینہ تو دیکھو

نہ سونا، نہ چاندی، بچھونا زمیں پر
یہ شاہِ اُمم ؐ کا خزینہ تو دیکھو

مؤدّب ہوں الفاظ سب ایستادہ
ذرا نعت کا تُم قرینہ تو دیکھو

شفیقؔ اس کا ثانی نہیں ہے جہاں میں
وہ یکتا ، یگانہ مدینہ تو دیکھو

شفیق احمد فاروقی (مدینہ منورہ)

## سلام بحضور امام عالی مقامؓ

بیبیاں آئیں کھُلے سر نہیں دیکھا جاتا
آنکھ کہتی ہے یہ منظر نہیں دیکھا جاتا

پہلی آواز پہ لبیک کہا جاتا ہے
جادۂ عشق میں مڑ کر نہیں دیکھا جاتا

جان پر کھیلے بِنا بات نہیں بنتی ہے
دل ہو مقتل میں تو پھر سر نہیں دیکھا جاتا

جس کی خاطر سے بسائی گئی دنیا ساری
اہلِ دنیا سے وُہی گھر نہیں دیکھا جاتا

اے جہاں والو چلے آؤ کہ دِکھلائیں تمہیں
اک دربار جہاں زر نہیں دیکھا جاتا

دیکھ کر چہرۂ معصوم، کہا بانو نے
حال تیرا، علی اصغر، نہیں دیکھا جاتا

○

شبنم شکیل
(اسلام آباد)

# چیدغ

## آغا گل

(کوئٹہ)

**یوں** تو صدر شعبۂ سینارٹی کی بنیاد پر مقرر ہوتے ہیں مگر پروفیسر مجاہد تو ساحر تھا۔انگریزی ادب پہ اسے مکمل عبور حاصل تھا اس کے ساتھ ساتھ عالمی ادب اور اردو ادب سے بھی آگاہ تھا جسکی عمر دوسو برس سے زائد نہ تھی۔اس کا علمی لیکچر تو ثقافت تاریخ اور معاشرت کو پہلو بہ پہلو لیے چلتا۔انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے دیگر شعبوں کے طلباء بھی اس کے لیکچر میں کھچے چلے آتے۔خصوصاً جو مقابلے کا امتحان دے کر اعلیٰ افسر بننے کے متمنی ہوا کرتے۔اس کے سینکڑوں طلباء اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے تھے مگر مجاہد کسی ملاح کی طرح دو پاٹن کے بیچ ہی رہا۔ لیکچرر شپ اسکا مشن تھا اور ویژن تھا نئی نسل کو اعلیٰ تعلیم دینا۔افادیت کے پیش نظر نوشکی۔خانوزئی۔خاران۔بیلہ۔کوہلو اور بارکھان جیسے دورافتادہ یا مضافاتی کالجوں کے لیکچرر مجاہد کا لیکچر سننے اور نوٹس لینے کے متمنی رہا کرتے۔دوران لیکچر سوال کرنے اور کلاس کے اندر آنے کی اجازت طلب کرنے پہ پابندی تھی۔کیونکہ یوں کلاس ڈسٹرب ہونے کا احتمال رہتا۔البتہ جمعہ کے روز سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رہتا۔مجاہد کے پر مغز بیان اور لیکچر میں دریائے بیجی کی سی روانی تھی۔جیسے دریائے بولان طغیانی میں بہے جاتا ہو۔سبھی مسحور ہو کے رہ جاتے۔وہ اپنے موضوعات کی جزئیات بھی بیان کرتا جو کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔شیکسپیئر پڑھاتے ہوئے بتلاتا کہ بادشاہ کی خوشنودی کیلئے میکبتھ میں اس نے جادوگرنیوں اور چڑیلوں کے کردار پیش کیے۔اس دور میں چت لیٹ کر سونا بُرا سمجھا جاتا کہ یوں تو مردے لٹائے جاتے ہیں۔کچھ دھوئیں کے سبب بھی لوگ ٹیک لگا کر نیم دراز انداز میں سویا کرتے۔شیکسپیئر سود پر رقم بھی دیا کرتا۔جس کے باعث عوام میں مقبول تھا کہ وقت پہ کام آنے والا شخص ہے۔جان ملٹن پڑھاتے ہوئے وہ بتلاتا کہ POLEMICIST ہونے کے سبب ملٹن کے جھگڑے ہی ہوتے رہے ایسی ہی طبیعت یاس یگانہ چنگیزی نے پائی تھی جسے بدخواہوں نے منہ کالا کر کے گدھے پہ پھرایا۔اقبال نے ابلیس کا رومانی تصور جان ملٹن ہی سے لیا۔کالرج گنٹھیا کا مریض تھا۔افیون کھایا کرتا کیونکہ درد دور کرنے کا ان دنوں یہی ایک علاج تھا۔کافکا کا باپ ایک ظالم قصاب تھا۔جسکے باعث کافکا کے ہاں خوف کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔یوں تو لیکچرار ناول،ڈرامہ،شاعری یا کوئی مخصوص صنف ادب پڑھایا کرتے مگر مجاہد تو ناول،ڈرامہ،شاعری تنقید مکمل دسترس کے ساتھ پڑھاتا۔انگریزی کا پہلا ناول پامیلا پڑھاتے ہوئے وہ ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس تک جا پہنچتا اور اردو ادب کے پہلے ناول امراؤ جان ادا کا تکنیکی مطالعہ کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر کے ناولوں کے محاسن گنواتا ہوا گھوم پھر کر فرانسیسی ناول نگار پیئرے پاول کے ناول MONKEY PLANET کا جائزہ لیتے ہوئے بتلاتا کہ زوال آیا ہے انسان بہ صورت عظمت کردار گر چکے ہیں۔ہر شے کمرشیل ہو کر رہ گئی ہے عورت بھی محض ایک PRODUCT بن چکی ہے۔اس سرمایہ دارانہ نظام اور ٹارگیٹ کیلنگ نے سب کچھ تباہ کر کے رکھ دیا ہے یہ سلسلہ اگر رک بھی جائے تو پچاس برس تک بلوچستان سنبھل نہیں سکتا۔

عزت و تکریم اور کامیابیوں کے باوجود وہ اولاد سے محروم تھا اسکی بیوی علاج اور جنتر منتر کراتی رہی۔پھر تھک ہار کے قسمت پہ شاکر ہو بیٹھی۔بعض دوستوں نے دوسری شادی کا مشورہ بھی دیا۔کچھ خواتین نے لائن مارنے کی کوشش بھی کی مگر مجاہد تو وطن کیلئے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تیار کرنے میں منہمک رہتا۔وہ سبھی کا حوصلہ بندھاتا حالانکہ خود کو غیر محفوظ اور بہت اکیلا سا محسوس کرتا۔آسمان پر بھی لگتا تھا LONG WEEK END ہے۔فرشتے کچھ اور کاموں میں منہمک تھے۔دعائیں گرم ہواؤں سے ٹکرا کر راہ نہ پاتیں۔آبادکاروں کو قتل کرنے والے رفتہ رفتہ دیگر لسانی گروہوں پر بھی پل پڑے۔بم کی آنکھیں نہیں ہوتیں کہ دیکھ پائے کسے بچانا ہے،کسے مارنا ہے۔جمعہ کے سیشن میں سوالوں کی صورت میں جلتے ہوئے تیر مجاہد کے سینے میں پیوست ہونے لگے۔نالے کے پار والوں سے وہ خائف تھا لہذا خوش اسلوبی سے ٹال دیا کرتا ''بلوچستان ایک بڑا اسٹیج ہے جس پر تمام اداکار اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ڈائریکٹر اور پروڈیوسر البتہ ایک ہی ہے ڈرامے کا PROMPTER ڈالر کی زبان میں بات کرتا ہے۔ہر امریکی ڈالر پر پرنٹ ہوتا ہے IN GOD WE TRUST شائد یہ MISPRINT ہے مگر پھر بھی ڈالر چلتا ہے۔اس ڈرامے میں ارسطو والی THREE UNITIES بھی ہیں'' جذباتی طلباء ایسی علامتی گفتگو سے کیا مطمئن ہوتے۔کبھی تو وہ مشتعل ہوتے اور کبھی وہ سہم سے جاتے۔ہر جانب لاشیں گر رہی تھیں وہ دریافت کرتے ''یہ خوفناک ڈرامہ کب ختم ہوگا'' مجاہد مایوسی سے کہتا ''اتنا تو صرف اسکرپٹ رائٹر ہی جانتا ہے۔میں خود بھی MAROONED محسوس کرتا ہوں۔

نوشین نے بارہا مشورہ دیا کہ کسی اور صوبے میں ملازمت کر لی جائے۔مگر مجاہد مُصر رہا کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل ضرور کرے گا'' مگر مجھے خوف آتا ہے کہیں DOCTOR FAUSTUS نہ بن جاؤں۔جو ایک کمزور مالک کو چھوڑ کر طاقتور شیطان کا غلام بن بیٹھا مسلسل ناکامیاں انسان کو بزدل بنا دیتی ہیں۔مگر ہم وہ صبح لا کے رہیں گے خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔''

نوشین کچھ اور بجھ گئی ''ہر طرف تو رات چھائی ہوئی ہے،تم جانے کس صبح کے خواب دیکھتے رہتے ہو۔'' نوشین نے مجاہد کے سوٹ سینت کر الماری میں

بنگروں پہ لٹا دیئے۔ کیونکہ آبادکار مارے خوف کے شلوار قمیض پہننے لگے تھے۔
وارث بیس برس تک ٹائی لگا سوٹ ڈانٹے کلاس میں جایا کرتا۔ اب ڈھیلے ڈھالے
لباس میں جانے لگا تو الجھن سی ہونے لگی۔ لیکن صوبائی سیکرٹری جان محمد دشتی شلوار
قمیض میں ہی ملبوس تھا جب اس پہ فائرنگ ہوئی جان محمد دشتی کا اخبار آساپ بھی
بند ہو گیا۔ سریاب روڈ پہ آساپ کے دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دل میں
ہول اٹھنے لگتا۔ مجاہد اور صبا دشتیاری اس اندوہناک حادثہ پہ دم بخود رہ گئے۔ ادھر
صوبائی حکومت نے حکم نامہ جاری کر دیا کہ سرکاری افسر اپنے ساتھ باوردی ڈرائیور
نہ رکھیں۔ سبز رنگ کی سرکاری نمبر پلیٹ نہ لگائیں افسر راستے بدل بدل کے دفتر
آنے جانے لگے۔

سیکرٹریٹ اور آساپ اخبار تارا مسیح کے ہتھے چڑھ چکا تھا۔ یوں لگتا
تھا یونیورسٹی کسی سائیکلوپس کی گرفت میں آ چکی ہے۔ پھر وزیر تعلیم شفیق احمد کو اس
کے گھر کے سامنے ہی گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اساتذہ تو عمومی طور پہ کانپ اٹھے
صوبائی وزیر تعلیم کو ٹارگٹ کرنے والے عام اساتذہ کو بھلا کیا جانیں؟ ایک بھگدڑ
سی مچ گئی۔ نظام تعلیم درہم برہم ہوا جا رہا تھا۔ مجاہد کو یوں محسوس ہوتا کہ قدرت اس
سے علم واپس لے رہی ہے۔ اس کے لیکچر میں وہ روانی نہ رہی۔ طلباء کے چبھتے
ہوئے تکلیف دہ سوالوں سے بچنے کیلئے اس نے سوال و جواب کا جمعہ سیشن بند کر
دیا۔ بہت سے کالج بند ہو چکے تھے۔ اسکول اساتذہ سے خالی ہوئے جا رہے تھے۔
مجاہد کے قدموں میں اب وہ جان نہیں رہی تھی گھر کی جانب واک کی بجائے وہ
SLOCUHING کرتا۔ اور تھکا ہوا سا دھم سے بستر پہ جا گرتا۔ نوشین اسکا جی
بہلانے کو کوئی فلم لگا دیتی یا کوئی اچھی سی خوش ذائقہ ڈش بناتی مگر مجاہد کسی اندھیرے
غار میں اترا چلا جا رہا تھا۔ اسکے لہجے کی مٹھاس احتجاجی تلخی میں بدل چکی تھی۔ وہ
بات بے بات جھڑک دیا کرتا۔ یونیورسٹی میں کسی پروفیسر نے سوال کیا۔

''آپ کوئی پالتو جانور نہیں پالتے کیا؟''

مجاہد نے تڑاخ سے جواب دیا ''مہنگائی کے سبب جانور پالنا مشکل
ہے، لوگ نفرتیں پالتے ہیں۔ کتوں کی بجائے پہلو میں زنجیروں سے بندھی نفرتیں
لئے پھرتے ہیں۔'' محفل میں سناٹا سا چھا گیا۔ فضا بوجھل سی ہو گئی۔ یونیورسٹی کے
قریب سے شور مچاتی ریل گاڑی گزر گئی نہتے مسافر گولیوں اور راکٹوں کا سامنا
کرنے جا رہے تھے۔ بم دیوتا نے بلوچستان میں مستقل بسیرا کر لیا تھا۔ اس نے
بلوچستان کا ڈومیسائل سرٹیفکیٹ بھی بنوا لیا تھا۔ یونیورسٹی اجڑتی چلی گئی۔ اور مجاہد کے
کانوں میں سرگوشی ہونے لگی ''جیسے گر گیا ہو آسمان سے اور اچک لے جائیں اسے
پرندے یا جا پھینکے اسے ہوا کسی دور دراز مقام پر''۔ یوں لگتا تھا کوئی غموں سے بھرا
قطور رکھ گیا ہے۔ پڑھاتے ہوئے اچانک مجاہد کا لب ولہجہ بدل جاتا وہ زہر اگلنے لگتا
''ٹیکسلا گوتم بدھ کے پرامن افکار کی یونیورسٹی تھی۔ علم کا مرکز تھی۔ ہم نے وہاں
سب سے بڑی اسلحہ فیکٹری جما دی ہے۔ ہمارا قومی شاعر تیغوں کے سائے میں پل
کر جواں ہونے پہ فخر کرتا ہے۔ خودکش حملہ آور ہماری اسی ذہنی روش کا مجسم اظہار
ہیں۔ ہماری خواہشات کی PERSONIFICATION ہیں۔ خودکش حملہ
آور ہمارے پرتشدد خوابوں کے قابوس ہیں''۔ اگلے ہی روز وائس چانسلر کیانی کو
اسکے گھر کے قریب گولی مار دی گئی، وہ واک کیلئے نکلا تھا، پرائیویٹ سیکورٹی گارڈز لا
تعلقی سے جان نکلنے کا منظر دیکھتے رہے۔ نوشین مجاہد کے قدموں پہ گر گئی۔ ''خدا
کیلئے یہ یونیورسٹی چھوڑ دو، نوکریاں مل جائیں گی اس سے تو بہتر ہے رنگ محل میں
ریڑھی لگا لو۔ کیا قدر رہے علمیت کی۔ کیانی نے پچیس برس تعلیم دی تھی سوچو اسکا کیا
حشر ہوا۔'' مجاہد گم سم سا کافی پیتا رہا۔ ہر چیز کی ایک قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔ میری
کمٹ مینٹ کی قیمت میری زندگی ہے۔ میں ایک عظیم انسان کی موت مرنا چاہتا
ہوں جیسے ٹامس بیکٹ۔ برونو RUDOLF HESS''

نوشین مضطرب ہو گئی ''سب کی کوئی نہ کوئی قوم تھی روڈولف ہیس
جرمن تھا۔ اسکے پرستار جرمن ہیں اسکی قبر مرجع خلائق ہے۔ تم کون ہو ایک آبادکار۔
ڈومی سائل ناں لوکل پناہ گزین۔ مہاجر۔ کون تمہارا ساتھ دے گا۔ جہاں تمہیں جینے
کا حق نہیں دیا جا رہا وہاں لوگ تمہاری قبر پر جھنڈے گاڑنے آئیں گے کیا۔ تمہاری
برسی منائیں گے؟'' مگر مجاہد کوہِ باطل کی مانند حوادث کے سمندر میں ثابت قدم
رہا۔ ''ایک FUGITIVE بلکہ RENEGADE پروفیسر کی بیوی بن کے
جینے سے بہتر ہے کہ تم ایک COMMITTED استاد کی بیوہ بن کے عزت پاؤ
جو علم و ادب کے نام پر قربان ہو گیا''

پروفیسر ناظمہ طالب کا بھی ایسا ہی ارادہ تھا ایسے میں آغا ناصر اور
صبا دشتیاری حوصلہ بندھاتے ''کسی وقت بھی اسکرپٹ رائٹر پلاٹ بدل سکتا ہے،
چند ماہ میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' امریکن سول وار دوسری جنگ عظیم بھی تو
ہوئی تھی''

پروفیسرز جمعہ کی نماز میں پابندی سے شامل ہوئے تا کہ طلباء کیلئے
اچھی مثال قائم ہو۔ نماز جمعہ کے بعد مولوی نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے حالانکہ
پوری نماز ایک دعا ہے۔ دھاڑتے مائیک پہ وہ بولا ''یا اللہ ہمیں۔۔۔۔''

مجاہد دعا کیلئے ہاتھ بلند کئے آنکھیں بند کئے پہلی صف میں مولوی
کے سامنے بیٹھا تھا اس نے فقرہ جوڑا ''ہمیں چوہا بنا دے'' طلباء کے قہقہوں سے
مسجد گونج اٹھی۔ وہ بے ساختہ قہقہے تھے جوانی کے۔ معاً انہوں نے گھبرا کے خود کو
سنبھالا۔ مولوی نے کھا جانے والی نظر مجاہد پر ڈالی اور دعائیں مانگنے لگا۔ نمازی
آمین آمین کی گرہ لگاتے چلے گئے۔ اگلے روز وائس چانسلر نے مجاہد کو دفتر میں بلوا
بھیجا۔ تمام ڈین اور پروفیسر پہلے سے براجمان تھے۔

''کل آپ نے مسجد میں کیا حرکت فرمائی''۔

مجاہد مجوب سا شرمسار بیٹھا تھا۔ میرے لئے میری شرمندگی ہی کافی
ہے۔ دراصل میرے ذہن پہ JOHN STEINBECK کا ناول قتل کے
بعد ناول کے چوہے باہر نکل آئے ہیں۔ ہر طرف گھومتے پھرتے ہیں۔ یونیورسٹی
میں اور گھر میں۔ اسے میں وہم سمجھ کے جھٹک دیتا ہوں۔ شائد میں

PSYCHOSIS کا شکار ہو گیا ہوں۔ کیونکہ بارہا میرا نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ میں PHOBIA میں مبتلا ہو چکا ہوں PERSISTENT FEAR میں رہنے والا''۔

وائس چانسلر نے زبانی سرزنش کر کے بات ختم کر دی۔ اسی دوپہر جب کلاسیں ختم ہوئیں۔ درس و تدریس کے بعد طلباء واساتذہ گھروں کو جا رہے تھے پروفیسر ناظمہ طالب سے راہداری میں ملاقات ہو گئی۔ مجاہد گفتگو کرتا باہر نکلا۔ ابھی ناظمہ طالب رکشہ میں بیٹھ ہی رہی تھی کہ کرایہ کے قاتل آ پہنچے اور ناظمہ پر فائر کھول دیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ سپاہیوں سے علیک سلیک کرتے ہوئے وہ قاتل آرام سے گزر گئے۔ نوشین رورو کے بے حال ہو گئی۔

یونیورسٹی میں صف ماتم بچھ گئی۔ مجاہد آہیں بھرتا ''کاش میں ایکلیز (ACHLIES) ہوتا یا پھر انسانی پیکر کا ہیکٹر (HECTOR) اوران قاتلوں پہ ٹوٹ پڑتا! افسوس میں ہملٹ (HAMLET) کی طرح قاتلوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ خدایا! مجھے مرد بنایا ہے تو ہمت بھی عطا فرما'' نوشین منت سماجت کرنے لگی ''خدارا کہیں اور چلے جاتے ہیں ایک ایک کر کے سبھی مارے جا رہے ہیں۔ ہر پروفیسر سمجھتا ہے کہ وہ محفوظ ہے۔ اس نے بڑی خدمت کی ہے'' مجاہد ٹس سے مس نہ ہوا۔ ''میرا وہی سقراط والا جواب ہے، بھاگا تو اپنے افکار پہ گویا قائم نہیں رہا غیروں میں جینے سے اپنوں میں مارا جانا ہی بہتر ہے''۔ دونوں نے کھانا زہر مار کیا تو مجاہد گھٹنوں چلنے لگا بیڈروم میں۔ نوشین کانپ اٹھی ''یہ کیا کر رہے ہو تم تو انسان ہو انسانوں کی طرح چلو۔ مردوں کی طرح سینہ تان کے''

مجاہد چونک اٹھا ''ہاں میں تو انسان ہوں۔ کیا میں واقعی انسان ہوں؟ نوشین میں چوہوں کے ساتھ رہتے ہوئے چوہا بن چکا ہوں۔ یہ تو ECOLOGICAL EFFECT ہے۔'' نوشین نے پیار سے اسے جھنجھوڑا ''ہوش میں آؤ تم مرد ہو۔ ایک مکمل مرد تمہیں مجھ سے زیادہ بھلا کون جان سکتا ہے۔''

مجاہد توجیہہ پیش کرنے لگا ''ایک شخص نے رات بھر خواب دیکھا کہ وہ تتلی بنا اڑتا پھرتا ہے، صبح جاگا تو گومگوں کا شکار ہوا کہ آیا وہ خواب حقیقی تھا وہ ایک تتلی ہے یا ایک مرد ہے؟ میں بھی تذبذب کا شکار ہوں۔ میں مرد ہوں یا چوہا۔''

یونیورسٹی ویران ہوئی جاتی تھی۔ بہت سے استاد قتل کیے جا چکے تھے۔ طلباء کو چک ترّ اُٹھا کے غائب کر رہا تھا۔ مسخ شدہ لاشیں مل رہی تھیں۔ مجاہد کے دوست پروفیسر صبا دشتیاری گولیوں کا نشانہ بنا تو مجاہد کے صبر کے بندھن ٹوٹ گئے وہ دھاڑیں مار مار کے رویا۔ اگلے روز طلباء اور اساتذہ اسے دلاسہ دینے جوق در جوق آئے کیونکہ صبا دشتیاری کا سب سے قریبی دوست مجاہد ہی تھا۔ مجاہد دنیا مافیہا سے لاتعلق جان سٹین بک کا ناول OF MICE AND MEN پڑھ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے خلاف عادت شیو بڑھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر حال احوال ہوا۔ موضوع بدلنے کیلئے ناول کی جانب توجہ دلائی تو مجاہد نے اثبات میں سر ہلایا ''یہ ناول دراصل مشہور شاعر ROBERT BURNS سے متاثر ہو کر JHON STEINBECK نے 1937ء میں تخلیق کیا تھا۔ روبرٹ برنس کدال سے زمین کھود رہا تھا کہ اچانک کسی چوہے کا بل ادھڑ گیا۔ خوفزدہ چوہا اپنے گھر میں کانپ رہا تھا۔ یہ گھر اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ چوہے کے خوف اور بے بسی سے متاثر ہو کر رابرٹ برنس نے 1785ء میں نظم TO A MICE تخلیق کی۔'' احباب کو افسوس ہوا ''کاش رابرٹ برنس بلوچستان آتا تو چوہوں سے بدتر انسانوں کو دیکھ کر زیادہ بہتر نظمیں کہتا۔ یہاں ستر لاکھ چوہوں کے بل کھلے پڑے ہیں۔ ستر لاکھ بلاکار (بل کھودنے والے) دہشت سے کانپ رہے ہیں۔''

مجاہد نے اقرار کیا ''مجھے تو پورا بلوچستان ہی بلکھو لیکھن (چوہے کی کتری کھرچی شے) لگتا ہے۔ لیکن چوہا انسان سے افضل ہے۔ ہم ماضی کے پچھتاوں اور مستقبل کے خوف میں رہتے ہیں۔ جبکہ چوہے صرف حال کے لمحۂ موجود میں رہتے ہیں''۔

اس ملاقات کے بعد پروفیسروں نے وائس چانسلر سے استدعا کی کہ مجاہد کو ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ جس پہ وہ راضی نہ ہوا کہ اس بدنام یونیورسٹی کی مزید رسوائی ہوگی کہ وہاں دیوانے پروفیسر صدر شعبۂ لگے ہوئے ہیں۔ صرف پروفیسر بالاچ نے مجاہد کی وکالت کی کہ وہ بدستور اپنے فرائض انجام دیتا رہے تو رفتہ رفتہ سنبھل جائے گا۔ اس کے دماغ میں چیدغ بن گیا ہے۔ جسکا دباؤ اسے مارے ڈالتا ہے''

وائس چانسلر نے استفسار کیا ''ذرا چیدغ کی وضاحت کیجیے گا''۔

پروفیسر بالاچ نے بتلایا ''کسی جگہ کوئی اہم واقعہ وقوع پذیر ہو تو ہزار برس سے رواج ہے کہ بلوچ اُس کی یاد قائم رکھنے کیلئے وہاں کچھ پتھر رکھ دیتے ہیں۔ اُن کے وسائل تو نہیں کہ کوئی یادگار بنائیں یا مینار تعمیر کریں۔ ہاں گزرنے والوں پر لازم ہے کہ اُن پتھروں میں اضافہ کرتے رہیں۔ تا کہ زمانے کی دست و برد سے محفوظ رہیں۔ ہر دوست کی موت مجاہد کے دماغ میں بنے چیدغ کے پتھروں میں اضافہ کرتی رہی۔ افسوس کہ محبت کی کوئی EXPIRY DATE نہیں ہوا کرتی''۔ بالاچ کی وجہ سے مجاہد کی نوکری تو بچ گئی۔ مگر مجاہد سنبھل نہ پایا۔ کچھ جارحانہ انداز بھی اپنانے لگا۔ گشت کرتا سپاہیوں سے بھرا ٹرک دیکھ کر ہش ہش کرنے لگا اور نعرہ زن ہوا ''یہ چوہنے وردیاں پہنے اسلحہ اٹھائے کونسا ڈرامہ کرتے پھر رہے ہیں ان کا PROMPTER کہاں ہے؟''۔ سپاہی اسے خودکش حملہ آور سمجھتے ہوئے دم دبا کر بھاگ نکلے۔ ایک روز اچانک ہی مجاہد غائب ہو گیا۔ وہ طلباء میں بہت مقبول تھا۔ آناً فاناً یونیورسٹی بند ہو گئی۔ اساتذہ اور طلباء اسکی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بلوچ اسٹوڈینٹس آرگنائزیشن (بی ایس او) نے صوبہ بھر میں ہڑتال کی کال دے دی۔ اس روز نہ تو کوئی بم پھٹا تھا نہ ہی کوئی راکٹ گرا تھا اور نہ ہی کوئی خودکش حملہ ہوا تھا۔ اکثریت کا خیال تھا کہ چک برے اڑا ہوگا۔ یا پھر اغوا برائے تاوان

باقی صفحہ۸۰ پر ملاحظہ کیجیے

# سایوں بھرادالان

یسٰین احمد
(حیدرآباد، دکن)

معاً مجھ کواحساس ہوا کہ دالان میں کوئی ہے۔

کیا جولیا آگئی ہے؟ فوراً یہی خیال میرے دماغ میں آیا تھا۔لیکن جولیا کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا' پھر کون ہوسکتا ہے؟ میں نے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے دالان کی طرف نظر دوڑائی۔دالان کا جتنا حصہ مجھ کونظر آرہا تھا وہ سنسان تھا۔وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ممکن ہے کہ دالان کے اور حصے میں کوئی موجود ہو؟ میں نے سوچا اور اپنی وہیل چیر گھمائی۔

میں وہیل چیر چلاتا ہوا دالان میں آگیا۔دالان سنسان تھا تاہم مجھ کو محسوس ہورہا تھا کہ وہاں کوئی موجود ہے۔میرے گھر کا دالان بہت بڑا ہے۔سوسوا سو افراد وہاں بیٹھ بھی جائیں تو دالان تنگ دامنی کا شکوہ نہ کرے۔میں نے چاروں طرف دیکھا۔دالان کے در و دیوار چپ تھے۔وہ بڑی سی کھڑکی جو دالان کے پچھواڑے کھلتی تھی' بند تھی اور وہاں بھی خاموشی تھی۔اس کے باوجود مجھ کو لگ رہا تھا کہ دالان میں کوئی موجود ہے' کوئی غیر مرئی ہستی کوئی ہیولاٗ کوئی سایہ...؟ جو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر متواتر چلتا پھرتا رہتا ہے۔جب ڈوبتے سورج کی کرنیں میرے گھر کے آنگن میں پھیل جاتی ہیں تب اکثر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

میری یہ پشتینی جائیداد ہے۔اس کے باوجود کبھی کبھی جی کرتا ہے کہ وہاں سے بھاگ جاوں۔لیکن بھاگ کر کہاں جاوں؟ کوئی ایسی جگہ' ایسا در 'ایسا کونچہ ہے جہاں مجھ کو اماں مل سکتی ہے۔؟ اس کی کوئی ضمانت نہیں۔آدمی مرکر بھی قبر میں چین نہیں پاتا۔میرا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہے۔!

میرا اپاہج پن پیدائشی نہیں ہے۔آج میری جیسی حالت ہے' دس بارہ سال پہلے ایسی نہیں تھی۔اس وقت میری عمر ۲۵'۲۶ سال کے درمیان تھی۔میں انتہائی پھرتیلا اور صحت مند نوجوان تھا۔اسکول کے تعلیمی دور میں میں لمبی لمبی دوڑ میں حصہ لیتا تھا اور اکثر میرا نام دوسرے یا تیسرے نمبر پر رہتا۔آج بھی میرا کمرہ کئی انعامات اور تمغات سے سجا پڑا ہے۔کالج میں آنے کے بعد مجھ کو باسکٹ بال سے دل چسپی پیدا ہوگئی۔اپنی دراز ٹانگوں کی بدولت میں نے اس کھیل میں بھی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔مَیں میدان میں آتا تو مخالف ٹیم کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ایک بار گیند میرے ہاتھ لگتی تو ایک پوائٹ یقینی تھا۔مجھ کو اپنی دراز ٹانگوں پر بڑا زعم تھا۔لیکن آج میری دونوں ٹانگیں سانپ کی کینچلی کی مانند ناکارہ پڑی ہیں۔میں ایک وہیل چیر کا محتاج ہوگیا ہوں۔

ماں باپ جب تک دُنیا میں رہے مجھ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ماں نے ایک نوازئدہ بچے کی مانند میری دیکھ بھال کی تھی۔اُن کے گذر جانے کے بعد مجھ کو ایک ہمدرد ملازم مل گیا۔وہ میری تمام ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا۔وہ بیک وقت میرا دوست تھا اور خانساماں بھی۔مشیر تھا اور خزانچی بھی۔میرا اسکریٹری تھا اور باڈی گارڈ بھی اور اس گھر کا چوکیدار بھی۔میں اُس کو اتنی معقول تنخواہ دیتا تھا جو اُس کو کسی اور ملازمت میں نہیں مل سکتی۔اُس کی ضرورت کی تکمیل میرے پیسہ سے ہوتی تھی۔چند ماہ پہلے اُس نے شادی کی میں نے اس کے لئے ایک اچھا سا سرونٹ کوارٹر بنادیا۔شادی کے بعد وہ تھوڑا تھوڑا سا بدل رہا ہے۔شادی سے پہلے ہمہ وقت 'حکم میرے آقا' کی تصویر بنا رہتا تھا لیکن آج کل موقع ملتے ہی مجھ سے نظر بچا کر کھسک جاتا اور....اور مجھ کو سرونٹ کوارٹر کے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ قصور اُس کا نہیں ہے۔قصور اُس کی عمر کا ہے۔قصور اُس کی قبول صورت بیوی کا ہے جس کے بھرے بھرے جسم میں بے پناہ سیکس اپیل ہے۔

لنچ کے بعد وہ اپنے کوارٹر میں گھس گیا تھا اور اب تک نہیں لوٹا تھا۔جب کہ شام ہونے والی تھی۔اُس کے رابطہ کا ذریعہ ایک اطلاعی گھنٹی تھی جو اس کے کوارٹر میں لگی تھی اور سوئچ میرے کمرے میں۔مَیں اپنے کمرے کی طرف مڑا تا کہ سوئچ دباوں کہ اتنے میں دروازے کھلنے کی صدا سنائی دی۔میں رک گیا۔دروازہ کھلا۔جولیا اندر داخل ہورہی تھی۔میں نہال ہوگیا کہ دالان سے سایوں کا راج ختم ہوجائے گا۔

مَیں نے دیکھا کہ جولیا کا لباس پانی میں بھیگا ہوا تھا۔چہرے اور سر کے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔سفید لباس نے اس کی صندلی بدن کے نشیب و فراز کو اجاگر کردیا تھا۔دونوں ہاتھوں سے اپنے بدن کو سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

مَیں نے پوچھا۔''باہر بارش ہورہی ہے۔؟''

''ہاں۔''بوندا باندی ہورہی ہے اور ہلکی ہلکی دھوپ بھی پھیلی ہوئی ہے۔ایسے موسم میں بھیگنا اچھا لگتا ہے نا؟''

''ہاں۔'' میں نے اپنی نظریں پھیر لیں اور دوسری سمت دیکھنے لگا۔دل میں ایک دُکھ کی لہر اُٹھی کہ میں دنیا سے کتنا کٹ گیا تھا۔اس بات سے بھی بے خبر تھا کہ باہر بارش ہوئی تھی۔

اندر آکر جولیا نے اپنا پرس اسٹینڈ سے لٹکایا اور تولیہ اٹھا کر باتھ روم جانے کی بجائے سامنے کے کمرے میں چلی گئی جو کبھی میرے ماں باپ کی خواب گاہ تھی۔اس خواب گاہ کا دروازہ اسی وقت کھلتا تھا جب میری بڑی بہن امریکہ سے آتی تھی۔جب تک وہ یہاں رہتی اس کا اٹھنا' بیٹھنا اور سونا اسی کمرے میں ہوتا تھا۔اس کے جانے کے بعد کمرہ بند کردیا جاتا لیکن صفائی ہر روز پابندی سے ہوا کرتی تھی۔

اُس کمرے میں داخل ہوکر جولیا نے سوئچ آن کیا لیکن دروازہ بند نہیں کیا۔پہلے اُس نے اپنی بھیگی بھیگی زلفوں کو ہیر بینڈ کی گرفت سے آزاد کیا

اور پھر بالوں کو خشک کرنے لگی۔اس کے بعد اس نے اپنا سکرٹ اُتارا تھا اور تولیہ سے جسم کا پانی پونچھنے لگی تھی۔مہین پردے اور برقی قمقمے کی تیز روشنی میں اس کے بدن کے سارے پیچ وخم دکھائی دے رہے تھے۔میں نے اپنی نگاہ دوسری طرف پھیر لی کہ عورت میرے لئے ایک بے معنی شئے بن کر رہ گئی تھی۔

جولیا کو عارضی طور پر میری بہن نے میری خدمت کے لئے مامور کیا تھا۔دراصل میری بہن میری وجہ سے بڑی متفکر رہتی ہے۔اُس نے متعدد بار مجھ کو علاج کے لئے امریکہ آنے کے لئے کہا تھا۔اُس کا خیال تھا کہ میرا علاج وہاں ممکن ہے۔لیکن میں امریکہ جانے کے لئے تیار نہیں ہوا تھا۔پچھلے دو ماہ پہلے وہ اچانک یہاں آدھمکی تھی۔آتے آتے اُس نے ایک ایسے ارتھوپیڈک سرجن کا پتہ لے آئی تھی جو یہاں کے ایک ملٹی اسپیشلٹی ہسپتال میں مجھ جیسے مریضوں کا کامیاب علاج کر چکا تھا۔

وہ مجھ کو اپنے ساتھ اس سرجن کے پاس لے گئی تھی۔ڈاکٹر نے میری ہسٹری شیٹ پڑھی۔میرا معائنہ کیا اور اپریشن کے لئے اگلے ماہ کی ۳ تاریخ مقرر کر دی تھی۔اُس نے بتایا کہ اپریشن کامیاب ہو سکتا ہے۔لیکن اپریشن سے پہلے وہ میری شوگر،بلیڈ پریشر کو کنٹرول کرنا چاہتا تھا۔جس کے لئے کچھ دوائیں اور ہدایتیں لکھ دی تھیں اور جولیا کو مامور کر دیا تھا تا کہ میں کسی معاملے میں بھی لاپرواہی نہ کروں۔ابتداء میں جولیا مجھ کو اچھی نہیں لگی تھی۔لیکن اس کا برتاؤ اور ہمدردانہ رویہ دیکھ کر مجھ کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔اب تو یہ عالم ہے کہ اس کے آنے میں اگر دیر ہو جاتی ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔لگتا ہے کہ جولیا جیسی ایک نرس کی مجھ کو ضرورت ہے۔

بھیگا ہوا سکرٹ دوبارہ پہن کر وہ باہر نکلی۔اُس کے شانے تک کٹے ہوئے بال پریشان سے تھے۔لگتا تھا جیسے غسل سے فارغ ہو کر باتھ روم سے نکلی ہو۔اُس نے کہا۔''میں چائے بنا رہی ہوں۔آپ بھی پئیں گے؟''

اس کے اس سوال میں بڑی اپنائیت تھی۔مجھ کو اچھا لگا۔جن کا گھر ہوتا ہے۔گھر گرہستی ہوتی ہے' وہاں ایسے ہی پیار بھرے سوالات کی بارش ہوتی ہوگی۔میری قسمت میں گھر کا سکون تو لکھا ہی نہیں گیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر اس نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا اور پھر ہسٹری شیٹ لے کر بیٹھ گئی۔وہ بڑے غور سے میری ہسٹری شیٹ کا مطالعہ کر رہی تھی۔وہ جب سے آئی تھی' بلاناغہ بغور میری ہسٹری شیٹ کا مطالعہ کرتی جیسے کسی مریض کی ہسٹری شیٹ نہیں ناول پڑھ رہی ہو۔ہسٹری شیٹ پڑھنا ہر نرس کی ڈیوٹی ہے لیکن جس انہاک سے وہ ہسٹری شیٹ پڑھتی تھی وہ میرے لئے حیرت انگیز بات تھی۔میری ہسٹری شیٹ میں روز اول سے آج تک کی ساری تفصیلات درج تھیں۔کن کن ڈاکٹروں نے علاج کیا تھا۔کون کون سی دوائیں میرے استعمال میں آئی تھیں۔وہ ہسٹری شیٹ کہاں تھی' میرے اپاہج پن کی ایک تاریخ تھی۔دس سال سے جاری علاج کی ایک مکمل داستان تھی۔

دفعتاً اُس نے مطالعہ بند کیا اور پوچھا۔''سر! میں نے جب یہ پیشہ اختیار کیا تھا تب میری عمر ۱۶ سال تھی اور آج میں ۳۰ سال کی ہوگئی ہوں۔ابتداء کے دو تین سال میں نے اپنے وطن کیرالا کے ایک ہسپتال میں گذارا ہے' اُس کے بعد میں یہاں آگئی۔ان ۱۴ برسوں میں میں نے سینکڑوں ہسٹری سیٹس دیکھی ہیں۔ہر مریض کا مرض آسانی سے سمجھ میں آیا ہے لیکن آپ کی ہسٹری سیٹ پڑھ کر میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی۔''

''میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''اس سیٹ میں لکھا ہے کہ آپ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے کہ دفعتاً آپ کا توازن نکل گیا اور آپ کھڑکی سے باہر گر گئے۔'' جولیا کہنے لگی۔''آپ کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں لیکن تعجب ہے کہ آپ کے ہاتھ اور سر پر کوئی چوٹ نہیں آئی؟''

''کیا میرا سر پھٹ جانا چاہئے تھا؟'' میں نے بات کو ہلکی سی ہنسی میں اُڑا دینے کی کوشش کی۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کا توازن نہیں بگڑا تھا'' وہ بھی شاید مذاق کے موڈ میں تھی۔''شاید آپ اس وقت باسکٹ بال کھیل رہے تھے۔جیسے ہی بال کھڑکی سے باہر نکلا آپ نے اس کو پکڑنے کی کوشش میں کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔''

میں مسکرا کر خاموش رہا۔لیکن اُس کی بات تیر کی طرح میرے دل میں دھنس گئی تھی میں نے آج تک کسی سے نہیں بتایا تھا کہ کس طرح میرے ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹی تھیں۔حادثہ پرانا ہے لیکن تازہ گھاؤ کی طرح رستا رہتا ہے۔

اُس وقت دُنیا مجھ کو باسکٹ بال کا ایک بہترین چمپن تسلیم کر چکی تھی۔میرا نام اس شہر سے نکل کر ملک بھر میں پھیل رہا تھا۔

کامیابی' شہرت اور دولت کے نشے میں میں اتنا چور ہو گیا تھا کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹکنے لگے تھے۔اپنے خلاف کسی کا ایک لفظ بھی میں سننا نہیں چاہتا تھا۔کوئی میرے لمبے قد کا مذاق اُڑاتا تو میرا جی چاہتا کہ اُس کا سر پھوڑ دوں۔کسی کے لبوں پر اپنے لئے تمسخر آمیز ہنسی دیکھتا تو میں پاگل ہو جاتا۔سوچتا کہ اس کے لبوں کو کاٹ کر قیمہ بنا دوں۔

ایک ڈھلتی شام کو میں مشق کر کے گھر لوٹا۔دالان میں میری ماں اپنی سہلیوں کے ساتھ بیٹھی گفتگو کر رہی تھی۔مجھ کو دیکھ کر میری ماں کی ایک سہیلی نے کہا۔''تمہارا بیٹا تو ایک بہترین باسکٹ بال چمپن بن گیا ہے۔''

''لیکن سارا کریڈٹ اونٹ کی طرح لمبے قد کو جاتا ہے۔''

میں نے ایک کھنکتی ہوئی آواز سنی۔خواتین بے ساختہ ہنسنے لگیں۔میں نے اس ہنسی میں' اس کھنکتی ہوئی آواز میں تمسخر محسوس کیا۔میں اپنے کمرے میں آگیا لیکن فوراً پلٹ کر دروازے تک آیا اور اُن لوگوں پر نظر دوڑائی۔ ۱۹'۱۸ برس کی ایک خوبصورت لڑکی میری ماں کے پہلو میں بیٹھی مجھ کو تاک رہی تھی۔میں نے اس کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

پہلے وہ ذرا سا جھجکی۔پھر خواتین پر نظر ڈالی۔وہ سب بات چیت

میں محو تھیں۔ وہ چپکے سے اُٹھ کر میرے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے اندر آتے ہی میں نے پوچھا: ''میں تم کو اونٹ لگ رہا ہوں؟''

اُس نے بڑی معصومیت سے جھک کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی' یہ بھی جانتی ہو؟'' میں نے ترش لہجے میں کہا اور اس کو فوراً ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ وہ اب تک سب کچھ مذاق سمجھ رہی تھی۔ لیکن میرا غصہ' میرے چہرے کی درشتگی دیکھ کر اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کافور ہوگئی۔ حواس باختہ ہوکر میرے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے مچلی۔ مگر میرے استاد نے مجھ کو سکھایا تھا کہ ایک دفعہ اگر گیند ہاتھ آجائے تو اس وقت تک گیند نہیں چھوڑنا جب تک کہ گیند باسکٹ کے حلق میں اُتر نہیں جاتا تبھی تو ایک پوائٹ میرے نام چڑھتا ہے۔

میرے ہاتھ کا حلقہ زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا۔ اس لئے اُس کا تراشیدہ بدن میرے ہاتھوں کے محدود حلقے میں ایک گیند کی شکل اختیار کر لیا تھا۔ میں نے اس کے ڈوپٹے کا ایک کونہ اُس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اُس کے شدید ترین مدافعت کے باوجود میں نے منٹوں میں اُس کے کپڑے اتار دیئے۔

اور پھر باسکٹ کے حلق سے گیند اُترا۔ ایک پوائٹ....

میں فاتح چمپئن کی طرح اُٹھا۔ وہ ایسے سہمے ہوئے پرندے کی مانند بستر پر برہنہ بیٹھی ہوئی تھی جس کے بال و پر صیاد نے نوچ لیے ہوں۔ اُس کے کپڑے اُس کے جسم پر ڈال کر میں باتھ روم میں گھس گیا۔

باتھ روم سے باہر نکلا تو کمرہ خالی تھا۔ وہ جا چکی تھی اور ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں سہم گیا اور مجھے لگا کہ اُس نے سب کچھ اپنی ماں کو بتادیا ہوگا۔ میری ماں کو بتادیا ہوگا۔ پولیس کو بتادیا ہوگا۔ کچھ دیر میں پولیس آگئی اور میں دھر لیا جاوں گا۔ میرے ماں باپ کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ میرا کیریئر تباہ ہوجائے گا۔ اسی خوفزدگی کے عالم میں تادیر بیٹھا رہا اور پھر مجھ کو نیند آگئی تھی۔

وہ درمیانی شب کی گھڑی تھی جب اچانک میں نے ایک آواز سنی۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی میرا خوف یکلخت دور ہوگیا۔ خوش فہمی کے عالم میں سوچا کہ ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس یہاں کھینچ لائی ہے۔

''آو...!'' میں دروازہ سے ہٹ گیا۔

لیکن وہ کمرے میں نہیں آئی۔ ڈور کر دالان کے ایک گوشے میں کھڑی ہوگئی۔ وہاں سے اشارہ کرنے لگی۔ میں خوش ہوکر اُس کے قریب پہنچا۔ وہ لپک کر دالان کے دوسرے گوشے میں چلی گئی اور اشارہ سے مجھ کو بلاتی رہی۔ اس وقت اس کے جسم پر دودھ کی مانند اجلا لباس تھا اور چہرہ یوں سفید لگ رہا تھا کہ جیسے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

میں اُس کے قریب پہنچ کر اُس پر جھپٹنا چاہا' وہ مچل کر دوسری سمت نکل گئی۔ شاید وہ میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل جاری رکھنا چاہتی تھی۔ مجھ کو تھکا دینا چاہتی تھی۔ عین اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور دیوار سے لٹکتے ہوئے کیلنڈر کے اوراق پھر پھڑانے لگے۔ ایک ورق پر شیر کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ مجھ کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس شیر میں جان آگئی ہے۔ مجھ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ دیوار پر آویزاں گھڑی کی ٹک ٹک میرے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگی۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور دوڑ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مجھ کو قریب آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ مجھ پر جھلاہٹ طاری ہورہی تھی۔ کیلنڈر کے اوراق کی پھڑ پھڑاہٹ گراں گذرنے لگی میں نے غصہ میں کیلنڈر کو دیوار سے نکال کر پھینک دیا۔ اس کو دبوچنے کے لئے لپکا مگر وہ میری گرفت میں نہیں آسکی۔ پھر ایک دفعہ مچل کر دور نکل گئی۔

میری سانس پھولنے لگی اور مساموں سے پسینہ نکلنے لگا۔ یکا یک میری آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا تھا کہ میں لرز کر رہ گیا۔ وہ اچھل کر گھڑی کے پنڈولم میں جا بیٹھی تھی۔ ایک چھوٹی موٹی گڑیا کی مانند..نہیں ایک چھوٹے موٹے گیند کی طرح... گھڑی کے پنڈولم پر بیٹھی وہ جھول رہی تھی۔ کبھی دائیں جانب... کبھی بائیں جانب!

مجھ پر ہول طاری ہوگیا تھا۔ عقل حیراں تھی کہ کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کو میں نے چند گھنٹوں پہلے منٹوں میں زیر کر لیا تھا اب وہ سارا دالان مجھ کو نچاتی پھر رہی تھی۔ اپنی شکل بدل کر پنڈولم پر جا بیٹھی تھی۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ خواب تھا یا حقیقت یا واہمہ.....جو بھی ہوا اب تو عزت پر بن آئی تھی۔ چنانچہ میں اس کو گرفت میں لینے کے لئے زمین سے اُچھلا۔ کھیل کے میدان میں کسی دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ سے گیند چھیننے کے لئے ایسے ہی زمین سے اوپر اُٹھ جاتا تھا۔

مگر وہ وہاں سے تتلی کی مانند اُڑ کر میرے کمرے کے دروازے میں کھڑی ہوگئی۔ میں گھڑی سمیت فرش پر گر پڑا۔ مجھ کو چوٹ نہیں آئی تھی۔ لیکن قیمتی گھڑی' جو نوادرات کا حصہ بنی ہوئی تھی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اُس کا پنڈولم رک گیا۔ اُس کی ٹک ٹک ساکت ہوگئی اور وہ دروازے میں کھڑی تمسخر آمیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔ ''چمپئن تھک گئے؟''

میں تھکا نہیں تھا۔ تھکنے کا مطلب تھا کہ اپنی شکست تسلیم کر لینا۔ شکست تعلیم کرنا میری مردانگی کی توہین تھی۔ عورت کے معاملے میں ایک مرد اپنی توہین آسانی سے برداشت نہیں کرتا۔ اب وہ صحیح مقام پر کھڑی تھی۔ کمرے میں اُس کو زیر کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ میں ادھر بڑھا۔ وہ آہستہ آہستہ اندر کمرے میں ہٹتی گئی۔ کمرے میں داخل ہوکر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بستر تک جا چکی تھی۔ میں جیسے ہی بستر کے قریب پہنچا وہ اچھل کر کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ اپنے دونوں گھٹنوں کو اس نے ہاتھوں کے درمیان میں لے لیا تھا اور بدستور مسکرا رہی تھی۔

دیوار پر بیٹھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ دیوار بہت پتلی تھی۔ مجھ کو خدشہ تھا کہ مجھ سے بچنے کی کوشش میں وہ کھڑکی سے پھسل کر نیچے گر سکتی۔

باقی صفحہ ۷۰ پر ملاحظہ فرمائیے

# ''سعیِ لا حاصل''

خورشید احمد صدیقی

(میر پور خاص، سندھ)

**مورس** نے اپنے حرکت پذیر معاونِ زندگی نظام کے خلائی سوٹ نما احاطے سے اپنے نئے جسم کو دیکھا۔ وہ بے ڈول جسم اسے قطعی پسند نہیں آیا لیکن جلد ہی وہ جسم اس کی ذات کا حصہ بننے والا تھا آخر کب تک وہ خود کو وہیل چیئر تک محدود رکھتا۔

اس نے وہیل چیئر کا بٹن دبایا۔ لاس اینجلس کے تبدیلیٔ اجسام کے ادارے کے جراثیم سے پاک فرش پر نائلون کے ٹائروں کی ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ کرسی دوسری جانب گھوم گئی۔

''کیا اس سے بہتر جسم کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا؟'' مورس نے ادارہ کے سربراہ اور ملک کے مشہور سرجن ڈاکٹر فریڈرک سے پوچھا۔

''مسٹر مورس آپ کے ایجنٹ اس سے بہتر جسم حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایک نیا جسم مل رہا ہے۔''

مورس نے ایک بار پھر کرسی کو گھمایا تا کہ وہ ملحقہ کمرے کے درمیان حائل شیشے کی دیوار سے اندر کھڑے ہوئے تقریباً برہنہ شخص کو دیکھ سکے۔

اس کی آنکھیں بھینگی اور چہرہ مضحکہ خیز تھا۔ اس کا جسم بھی ڈھیلا ڈھالا تھا۔ وہ کسی بھی زاویئے سے مورس کو خود کے لئے موزوں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس خیال ہی سے وہ کانپ گیا کہ چار دن بعد اُس کا دماغ اس بے ڈول جسم میں منتقل ہو جائے گا۔

مورس نے دوبارہ وہیل چیئر کو گھمایا اور ڈاکٹر فریڈرک سے مخاطب ہو کر بولا ''مجھے اس سے بہتر جسم کی ضرورت ہے ڈاکٹر''۔ ''اس وقت تو جو جسم مہیا ہو سکے ہیں ان میں یہ ہی بہترین ہے۔ تمہارے ایجنٹ نے اس کے ورثا کو ان کی خواہش کے مطابق قیمت ادا کی ہے۔ قانونی اجازت کا حصول بھی ان کے لئے بہت مشکل ثابت ہوا۔''

''اسے یہاں سے لے جاؤ۔ میں اس جسم کو نہیں اپنانا چاہتا''۔ مورس نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کے بعد وہ پھرتی سے کرسی گھما کر اس کمرے سے باہر نکل گیا۔

چھ ماہ کی طویل تلاش کے بعد دماغ کی تبدیلی کا یہ معجزہ رونما ہونے والا تھا اس احمق شخص کے جسم کو خریدنے میں بھی کتنی دشواری پیش آئی تھی۔ اس کے ایجنٹ نے اسے بتایا تھا کہ ابتداء میں اس کے باپ اور بھائی پانچ لاکھ ڈالرز کے عوض اسے سائنسی تجربے کی بھینٹ چڑھانے پر آمادہ نہ تھے لیکن وہ سودے بازی سے خود کو نہ روک سکے آخر کار وہ دس لاکھ ڈالر کے عوض اپنے بیٹے اور بھائی کی محبت کو بیچنے پر تیار ہو گئے۔

مورس ان چھ مہینوں کے دوران جس کرب سے گزرا تھا وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اُس جسم سے وابستگی اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ادارے کے سربراہ سے کہا کہ وہ ایک دن کے لئے اپنے گھر جانا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر فریڈرک نے اسے اجازت دے دی۔ وہ ایک خصوصی وین کے ذریعہ اپنے گھر آ گیا۔

مورس کا شمار دنیا کے چند امیر ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ امریکہ کی ایک بہت بڑی جہاز راں کمپنی کا مالک تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی لیکن وہ اب بھی زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کا خواہش مند تھا۔ ڈاکٹر فریڈرک نے ایک مرتے ہوئے شخص کے دماغ کو ایک پاگل شخص کے سر میں منتقل کر کے طب کی دنیا میں دھوم مچا دی۔ مورس نے اس کے فوراً بعد ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا۔ اب وہ اپنی دولت کے ذریعے دوبارہ ایک جوان جسم حاصل کرنے والا تھا۔

تبدیلیٔ اجسام کے ادارے سے واپسی کے فوراً بعد اس نے اپنی جہاز راں کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ بورڈ کے تمام اراکین وقتِ مقررہ پر اس کے گھر پہنچ گئے۔

اپنے گھر کے ایک وسیع و عریض ہال میں وہ بورڈ کے اراکین سے مخاطب ہو کر بولا ''دوستو میری چھ ماہ کی غیر حاضری کے دوران آپ نے جس کامیابی سے جہاز راں کمپنی کا کام سنبھالا میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ دو یا تین روز بعد مجھے ایک جسم مل جائے گا۔ اس کے بعد میں ایک نئی شکل میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کروں گا۔ اگر آپ کو کوئی مسئلہ ہو تو بتائیں''۔

''مسٹر مورس'' مائیکل بولا ''آپ کے دماغ کے دوسرے شخص کے جسم میں منتقلی کے بعد ہمیں یہ کیسے معلوم ہو گا کہ جو شخص ہمارے سامنے ہے وہ ہمارا باس ہے۔''

''اوہ یہ تو واقعی ایک بڑا مسئلہ بن سکتا ہے۔ لیکن آپریشن سے قبل میں آپ کو اس شخص کی شکل دکھا دوں گا۔ اس کے علاوہ میرے دستخط بھی کوئی اور نہیں کر سکتا'' مورس نے جواب دیا۔

''سر آپ کو جسم کی تبدیلی کا خیال کیسے آیا؟'' اس کی سیکرٹری مارشا نے پوچھا۔

''یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ ڈاکٹر فریڈرک نے دماغ کی تبدیلی کا معجزہ تو کر دکھایا ہے لیکن وہ صرف اس شخص کے دماغ کو زندہ رکھ سکتا ہے جسے بعد میں نکالا جائے۔ اس کے تجربے کے بعد میں نے سوچا کہ اگر مجھے دوسرا جسم مل جائے تو میں مزید کافی عرصہ تک زندہ رہ سکتا ہوں۔''

''کیا آپ دوبارہ آج ہی تبدیلیٔ اجسام کے ادارے میں واپس جائیں گے؟'' مارشا نے ایک اور سوال کیا۔

''ہاں۔ تم فوراً رابرٹ سے رابطہ قائم کر کے اسے کہو کہ وہ مجھ سے

ملے''۔ موریس نے کہا اور وہ پھر بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبران سے مخاطب ہو کر بولا''آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بہرحال مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی خلوص اور محنت سے کام کرتے رہیں گے'' تمام لوگ اُٹھ گئے اور موریس سے ہاتھ ملا کر وسیع ہال سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد مارشا بولی''میں رابرٹ سے بات کرتی ہوں سر۔''

آدھ گھنٹے بعد رابرٹ وہاں پہنچ گیا۔ وہ ایک پُرکشش نوجوان تھا۔ اس نے چودہ سال کی عمر میں پہلا قتل کیا تھا لیکن اس پر الزام ثابت نہ ہو سکا اور وہ عدالت سے بری ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے مزید چار قتل کئے اور خود کو قانون کی گرفت سے دور رکھنے میں کامیاب رہا۔ اب اس کی عمر ستائیس سال تھی۔ وہ موریس کی جہاز راں کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

موریس کی وہیل چیئر کا ایک بٹن جلنے بجھنے لگا۔ اُس نے ایک دوسرا بٹن دبایا اور بولا''ہیلو کیا بات ہے مارشا؟''

''سر رابرٹ آ گیا ہے''

''اسے میرے کمرے میں بھیج دو''

''ٹھیک ہے سر میں اسے آپ کے پاس بھیج رہی ہوں''

چند ثانیوں بعد رابرٹ کمرے میں داخل ہوا۔ موریس نے اپنی وہیل چیئر کا رُخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا''رابرٹ تم نے میرے لئے جس آدمی کا انتظام کیا وہ مجھے پسند نہیں آیا''۔

''سر قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے تو یہی ممکن تھا''

''تم قانون کو بھول جاؤ دیکھو مجھے ایک خوبرو نوجوان کا جسم چاہیے۔ تم پیسے کی بالکل فکر نہ کرو لیکن یہ کام کل تک کر دو''

''اس صورت میں تو یہ کام کل تک یقینی ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔''

رابرٹ نے تعظیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور پھر واپسی کے لئے مڑ گیا۔

اس کے دو دن بعد ڈاکٹر فریڈرک نے موریس کے دماغ کو ایک خوبرو نوجوان شخص کے جسم میں منتقل کر دیا۔ اسے بہرحال ایک ہفتے تک ڈاکٹر کی نگرانی میں رہنا پڑا۔

چھ ماہ کے طویل انتظار کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب وہ باقاعدگی سے اپنے کاروبار کو بھی سنبھال رہا تھا۔ ادارے سے گھر واپس آئے ہوئے اسے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ زندگی اسے اب حسین لگنے لگی تھی۔ ایک دن اس نے سوچا کہ اسے کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کر لینی چاہیے۔ اچانک مارشا کا سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

دوسرے دن جب وہ دفتر میں گیا تو اس نے انٹرکام پر بات کرتے ہوئے مارشا کو بلایا۔

''سر آپ نے مجھے یاد کیا؟''

''ہاں مارشا بیٹھو۔''

وہ جھجکتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟''

''کیا۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا آپ مذاق تو نہیں کر رہے'' وہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔

''نہیں میں سنجیدہ ہوں مارشا''

آپ نے یہ جسم مفت تو حاصل نہیں کیا ہے سر؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''اوہ تو کیا تم شادی کے لیے تیار؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا''۔

''ہوں۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔'' موریس نے کہا اور میز کی دارز سے چیک بک نکال کر ایک کورے چیک پر دستخط کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے وہ چیک لے لیا اور اُٹھتے ہوئے بولی''شکریہ سر میں کل اس سوال کا جواب دوں گی۔''

''جواب مجھے معلوم ہے''۔

وہ مسکرائی اور پھر پُر وقار انداز میں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے دن جب موریس اپنے دفتر میں پہنچا تو اسے میز پر ایک لفافہ پڑا ہوا نظر آیا۔ اس پر خود اس کا نام لکھا تھا۔ جب اس نے اسے کھولا تو اس میں اسے ایک خط اور وہی کورا چیک ملا جو اس نے مارشا کو دیا تھا۔ وہ خط پڑھنے لگا۔

''مسٹر موریس!

آپ نے اپنے لئے ایک نوجوان جسم خرید لیا مبارک ہو۔ آپ نے کورا چیک دے کر شاید یہ سوچ لیا تھا کہ آپ نے میری محبت بھی خرید لی ہے۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ محبت پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتی۔ میں نے کل آپ کا چیک اس لئے لیا تھا کہ میں آپ کو جذبوں کی پہچان کرانا چاہتی تھی۔ آپ دولت سے دنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہیں لیکن محبت تو خلوص کی طلب گار ہوتی ہے۔ آپ کا جسم دولت کے سہارے جوان ضرور ہو گیا ہے لیکن آپ کا ذہن بوڑھا ہے۔ میں رابرٹ سے محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے ماضی سے واقف ہوں۔ وہ بُرا انسان نہیں ہے۔ حالات نے اُس سے غلط کام کرائے لیکن اب وہ ان پر نادم ہے۔ ہم دونوں ملک سے باہر جا رہے ہیں۔ ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔

آپ کی سیکرٹری

مارشا''

موریس نے خط پڑھنے کے بعد واپس لفافے میں رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے کورا چیک اٹھایا اور چند ثانیوں تک اُسے گھور کر دیکھتا رہا پھر وہ اُسے پھاڑتے ہوئے بڑبڑایا''کیا واقعی محبت انمول ہے؟''

# چھوٹی چچی

ثمینہ روحی
(کینیڈا)

چھوٹی چچی نے اپنی زندگی میں ہی سوالاکھ کلمہ پڑھ کے خود کو بخش دیا تھا۔

باہر انکے ایصالِ ثواب کے لئے سپارے پڑھے جا رہے ہیں۔دھیمی دھیمی ،ایک لے اور تال کے ساتھ بھنبھناہٹ ابھر اور ڈوب رہی ہے۔کہیں کہیں سے،گاہے بگاہے ایک سسکی،ایک آہ بھی ابھر آتی ہے۔سفید دوپٹوں میں لپٹی انکی بیٹیاں ،یہاں سے وہاں کچھ نہ کچھ کرتی پھر رہی ہیں۔پڑھے گئے اور بے پڑھے سپارے الگ الگ کرنا،دانے سمیٹ کر براق چاندنی برابر کرنا،چائے لانا اور لے جانا جیسے اور بہت سے کام جو کسی موت کے گھر میں ہوسکتے ہیں۔

انکی تدفین کل شام تھی۔سہاگنوں والا سرخ دوپٹا انکی میت پہ ڈالا گیا تھا۔ہر آنکھ اشکبار تھی۔ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے انکی اس بے وقت ،مگر آسان،سہل موت کا تذکرہ رات گئے تک رہا،کہ جنتی تھیں جو یوں پل کے پل رخصت ہوگئیں۔نہ کسی سے خدمت لی اور نہ کسی کو زیر بار کیا۔چلتی پھرتی یوں گئیں جیسے خوشبو ہوا میں بکھر کر غائب ہوجاتی ہے کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں۔شام کی چائے کا پیالہ لاکر میاں کو دیا تھا۔اپنا لینے باورچی خانے میں گئیں،دل میں درد اٹھا۔زمین پر بیٹھیں اور جب تک بیٹے نے آکر ہاتھوں میں لیا،جا چکی تھیں۔عمیر میرے سامنے بیٹھا یہ قصہ پھر دہرا رہا ہے''جب تک ہماری سمجھ میں آیا،گاڑی نکالی۔امی گزر چکی تھیں۔ایک گھونٹ پانی منہ میں ڈالنے کا موقع بھی نہیں ملا ہمیں تو۔۔۔۔''اسنے آستین میں منہ گھسا کر سسکنا شروع کیا اور میں نے بیزار ہوکر سامنے دیوار پر لگی تصویر پر نگاہیں جمادیں۔

کب کی تھی یہ تصویر؟ آفتاب چچا کی شادی کے کتنے عرصے بعد کی ہوگی؟ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔چار بچے اس تصویر میں چچا اور چھوٹی چچی کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔صحت مند،سرخ سفید،جوانی کے غازے سے چمکتی ہوئی چھوٹی چچی اور سانولے سلونے ،درمیانے قد اور جھکے ہوئے سے آفتاب چچا۔سنا ہے کہ چچی فقط سولہ سال کی تھیں جب بیاہ کرلائی گئیں۔آفتاب چچا کو اس وقت تک پڑھ لکھ کر نوکری سنبھالے بھی عرصہ گزر چکا تھا۔یوں دونوں کی عمروں میں خاصا فرق تھا۔دادا کے اس تین منزلہ مکان میں ہمارے ابا اپنے دو بھائیوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔سب سے اوپر کی منزل میں تایا ابو،درمیانی منزل میں ہم اور سب سے نیچے چھوٹے یعنی آفتاب چچا۔ہمارے گھر سے چار ،پانچ گھر چھوڑ کر بڑی پھپو کا گھر تھا۔وہ ہماری سگی پھپو نہیں تھیں بلکہ ابا کی کوئی رشتے کی بہن تھیں۔ہماری امی سے بھی ان کی کسی قسم کی رشتے داری تھی جو میں نے نہ اس وقت جاننے کی کوشش کی اور نہ کبھی بعد میں،بس اتنا معلوم تھا کہ اس دہرے رشتے کی وجہ سے ان کا ہمارے گھرانے سے ایک خاص اور ذرا مختلف تعلق تھا۔میرا اسکول سے آنے کے بعد،باقی وقت یا تو گلی میں تایا ابا کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے گزرتا اور یا پھر چھت پر کیرم اور لوڈو کی بازی جماتے۔پڑھائی میں نہ اس وقت دیدہ لگتا تھا نہ پھر کبھی لگا لیکن جب ابو کو اچانک خیال آجاتا تھا کہ صاحب زادے سارا وقت غیر نصابی سرگرمیوں میں ہی صرف کردیتے ہیں اور نصاب بیچارا پڑا اپنی جان کو روتا ہے تو پھر مار بہت لگتی تھی۔اسکے بعد کان پکڑ کر،گاہے بگاہے چپتیں لگاتے ہوئے وہ سیدھے پڑوس میں بڑی پھپو کے گھر جا پہنچتے اور عذیر بھائی کے سامنے اوندھا کردیتے۔

''کیوں میاں! چھوٹا بھائی ہے تمہارا۔۔۔اسکو ایک ڈانٹ لگا کر، اگر تم اپنے ساتھ بٹھا لیا کرو کہ یہ نالائق بھی کچھ سیکھ جائے تو اسکا بھلا نہ ہو جائے؟ کبھی کبھار پوچھ لوتو کیا بات ہے ورنہ صرف تمہاری صحبت ہی کا اثر بہت ہے۔اسے پتا تو چلے کہ کیسے ڈاکٹر،انجینیر بنا جاتا ہے۔محنت کس چڑیا کا نام ہے؟ تمہاری طرح صوبے بھر میں اول تو کیا آئے گا یہ کوڑھ مغز۔۔۔عزت سے پاس تو ہوجایا کرے۔''

عذیر بھائی، بڑی پھپو کی تیسری اولاد تھے۔دھیمے لہجے اور شرمیلی مسکراہٹ والے عذیر بھائی۔میں نے انہیں جب دیکھا ،اپنے چھوٹے سے کمرے کی چھوٹی سے میز پر بڑا سا لیمپ جلائے انجینیرنگ کی موٹی موٹی کتابوں پہ جھکا ہی دیکھا۔شاید کبھی بچپن میں کچھ کھیل کود بھی لیتے ہوں،لیکن مجھ سے عمر میں خاصے بڑے تھے اسلئے انکے بچپن کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔خاندان بھر کے ضرب المثل قسم کے سپوت تھے جن کا طعنہ ہماری نسل کے پڑھائی چوروں کو اٹھتے بیٹھتے دیا جاتا رہا۔ستم یہ تھا کہ پڑھائی کے تو ہیرو تھے ہی،شکل وصورت اور قد وقامت بھی ہیروز جیسا ہی پایا تھا۔پھر گاتے بھی خوب تھے۔مجھے یہ بات سمجھ میں آتے آتے بہت دیر لگی کہ خاندان کی لڑکیوں کی آدھی سے زیادہ آبادی عذیر بھائی پر فدا تھی۔جب وہ خاندان کی شادیوں کے موقع پر ہونے والے رت جگوں میں،اپنے کالے بالوں کی ریشمی لٹیں،ماتھے پر سے ایک ادا کے ساتھ پیچھے کرتے ہوئے''دنیا کسی کے پیار میں،جنت سے کم نہیں'' گایا کرتے تو نوجوان لڑکیوں کی بات بے بات کھی کھی کرتی ٹکڑی پر سناٹا چھاجایا کرتا تھا۔خدا کے فضل سے وہ ہم سے اتنے فاصلے پر تھے کہ تمام لڑکیوں کے ان کی طرف جھکاؤ سے کم ازکم ہماری نسل کو تو کوئی فرق نہیں پڑا لیکن اب سوچتا ہوں کہ انکے ساتھ کے خاندان کے لڑکے تو غریب بہت ہی کڑھتے ہونگے۔مجھ سے احمق کو اس بات کی عقل بھی زمانہ گزرنے کے بعد آئی کہ انکی غزالی آنکھوں والی خالہ زاد غزالہ کی آمد پر کیوں وہ اپنا چہیتا کمرہ،ٹیبل اور لیمپ چھوڑ کر ہر تھوڑی دیر

بعد صحن کا چکر لگانے نکل جاتے ہیں

جہاں خواتین کی محفل بمع غزالہ آپا جمی ہوتی تھی۔ یا غزالہ آپا کیوں بار بار آ کر عین انکے کمرے کے باہر بڑی بھابی کے منے کو بہلائے جاتی ہیں۔

'' میرا پیالا پیالا منا۔ آپا کے ساتھ کھیلے گا۔۔۔ٹافی کھائے گا۔۔جھولا جھولے گا''

اب بے چارہ ننھا منا جمعہ جمعہ چھ مہینے کی پیدائش منا کیا ٹافی کھاتا اور کیا ان کے ساتھ کھیلتا۔ لیکن مجھے ان آوازوں سے بڑی الجھن ہوتی۔ خدا خدا کر کے تو جیومیٹری کی اشکال کچھ کچھ پلے پڑنا شروع ہوتی تھیں، اور یہاں منے کا الاپ شروع ہو جاتا تھا۔ میں کن انکھیوں سے عذیر بھائی کو دیکھتا کہ شاید وہ منے کے بڑے بھائی کے صحن میں زور وشور سے آوازیں نکال کر ہوائی جہاز اڑانے کی پاداش میں جس طرح باہر نکل کر کان کھینچتے ہیں اور پڑھائی میں خلل نہ ڈالنے کی گھر کی دیتے ہیں اسی طرح غزالہ آپا۔۔۔لیکن توبہ کیجئے صاحب، لگتا تھا کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ جاتے تھے ایسے موقعوں پر تو۔ بس پنسل ہونٹوں میں دبائے، دبی مسکراہٹ کے ساتھ کرسی پر آگے پیچھے جھولے جاتے۔ جھولے جاتے، جھولے جاتے۔

ابو میرے بارے میں ٹھیک ہی کہتے تھے۔ پڑھائی میں تو خیر میں غبی تھا ہی، لیکن زندگی کے اور معاملات میں بھی وہ عقل آتے آتے میری عمر عزیز کے پندرہ، سولہ سال گزر گئے جن کی میرے تایا زاد اور ماموں زاد بھائیوں کو بارہ تیرہ کے سن میں ہی خاصی سوجھ بوجھ ہو چکی تھی۔ اکثر انکی باتیں اور مذاق میرے سر پر سے گزر جاتے اور میں ہونقوں کی طرح ایک ایک کا منہ تکتا۔ مجھے گھامڑ، الو کی دم فاختہ اور بھولو جیسے پیار کے القابات سے بھی میرے ان بھائیوں نے ہی نوازا تھا۔ شائد اسکی وجہ ہمارے گھر کا سیدھا سادہ ماحول، ابو کا ڈر، اماں کی کڑی نگاہیں اور زمانے کی ہوا نہ لگنے دینا تھا، لیکن وجہ کوئی بھی ہو، لب لباب یہ تھا کہ میں اپنے ہم عمر لڑکوں سے بہت سے معاملات میں بہت پیچھے تھا۔ یعنی پندرہ سال کی عمر میں، جب مجھے عزیر بھائی کے ساتھ انکے کمرے میں گھسے، کتابوں کو رٹے لگاتے، دوسرا سال تھا تو مجھ پر دو انکشافات ہوئے۔ ایک تو یہ کہ غزالہ آپا سے عذیر بھائی کا زبردست قسم کا، یا بقول میرے تایا زاد عامر کے دھواں دیتا عشق چل رہا تھا۔ دوسرے عزیر بھائی اتنے سیدھے اور معصوم نہیں تھے جتنے سمجھے جاتے تھے بلکہ خاصے گھنّے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں اپنے کسی دوست کے ساتھ باہر گلی میں انکی کلاس کی جملہ لڑکیوں پر سیر حاصل تبصرہ کرتے سنا۔ بہت دبی آواز میں بات کرنے کے باوجود کام کی ساری باتیں مجھ تک پہنچ گئیں۔ ویسے بھی جب آپ کا سارا جسم کان بن جائے تو کس آواز اور کس بات کی مجال ہے کہ چھوئے بغیر گزر جائے۔ اسی طرح ایک بار میں نے اپنی چپل انکے بستر کے نیچے سے نکالنے کے چکر میں وہ کیلنڈر دریافت کر لیا جس میں تباہ کن، گوری حسینائیں تیرا کی کے لباس کی برائے نام دھجیوں میں میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں، کم از کم اپنے دل کے زور زور سے دھڑکنے سے تو مجھے یہی لگا۔ میں نے کاہے کو کبھی ایسی تصویریں دیکھی

تھیں۔ ہمارے گھر یا تو اخبار آتا تھا جس میں سے فلمی اشتہاروں کا صفحہ امی صبح ہی صبح بڑی صفائی سے کاٹ کر الگ کر ڈالتی تھیں، یعنی خس کم جہاں پاک، یا پھر امی کا زیب النساء، جو اپنے نام کی طرح اپنے سرورق کی خاتون کے حلیے سے بھی اٹھارویں صدی کا لگتا تھا، مگر آتے ہی انکی الماری کے تالے چابی میں چلا جاتا تا کہ بے بی باجی کے ہاتھ نہ لگے۔ یعنی کہاں زیب النساء کی پردہ دار دوشیزہ کے درشن سے بھی محرومی اور کہاں یہ رنگ ونور کے جلوے۔۔۔میری تو حالت تباہ ہو گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کسی کام سے باہر گئے عزیر بھائی نے آتے ہی اسے میرے ہاتھ سے ''خبیث'' کہہ کر جھٹکے سے کھینچ لیا ورنہ شائد دوسری تصویر آتے آتے تک میرا انتقال پر ملال ہو جاتا۔ اس وقت تو عذیر بھائی کی اس دھمکی پر کہ وہ ابو سے میری ''زبردست'' شکایت کریں گے اور انکی چیزوں میں ''منہ مارنے'' کے جرم میں آئندہ اپنے کمرے میں گھسنے پر پابندی لگا دیں گے، میری روح سارا دن فنا رہی۔ دوپہر کا کھانا بھی دو لقمے حلق سے نیچے اترا لیکن شام ہوتے ہوتے مجھے ادراک ہوا کہ آخر وہ ابو سے شکایت کیا کریں گے؟ ہوا بھی یہی۔۔شکایت وکایت تو خیر کیا ہوتی۔۔بس ہوا یہ کہ ریاضی کی دو مشقیں زیادہ کرنی پڑیں اور مجھ پر یہ حقیقت کھل گئی کہ جو عزیر بھائی ایسی تصویریں اپنے بستر کے نیچے رکھ سکتے ہیں وہ اتنے بھولے نہیں ہو سکتے جتنا دنیا انہیں سمجھتی ہے، یا میں انہیں مانتا تھا۔

اسی پر آشوب زمانے کا ذکر ہے جب میٹرک بورڈ کے امتحانات نے دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ صورت حال اتنی گمبھیر تھی کہ کھیلنے کودنے، ٹی وی دیکھنے کا تو خیر ذکر ہی کیا، کھانا بھی اس طرح کھاتے جیسے کوئی جرم کر رہے ہوں۔ ابو کی خونخوار نگاہوں کے سامنے ایک ایک پل، ایک ایک لمحے کا حساب تھا۔ صبح اٹھ کر سکول جانا، واپس آ کر تین سے پانچ بجے تک ماسٹر صاحب سے ٹیوشن پڑھنا، اور رات کے کھانے کے بعد عزیر بھائی کے حجرے پر کم از کم چار گھنٹے کی حاضری لگانا۔ یہ وہ معمول تھا جس میں ذرا سا ردو بدل، ذرا سی ہیرا پھیری اس قیامت کو آواز دے سکتی تھی جس کو ابو کہتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر تایا ابو کی طرح میرے والد بھی بے ضرر اور لئے دئے سے ہوتے۔ کہ گھر آ کر آرام کرسی پر پسر کر گھنٹے، دو گھنٹے اونگھ لیتے۔ پھر شام کی چائے کے ساتھ صبح کا بچا کھچا اخبار نچوڑتے اور رپھر کھانا کھا کر، خبرنامہ دیکھ کے شریف اور معقول آدمیوں کی طرح سو جاتے، اللہ اللہ خیر صلا۔ اور اگر بالفرض محال اس ساری کاروائی میں بیٹوں کی پڑھائی کا خیال آ بھی جاتا تو ایک کھنکھار بھر کے، آتے جاتے بیٹوں کو روک کر پوچھ لیتے کہ'' اور بھئی، کیا ہو رہا ہے؟ سب ٹھیک ہے اسکول میں؟''اور ہم عامر اور واصف کی طرح نگاہیں جھکا کر، اور سینہ تان کر اثبات میں ''سب اچھا ہے'' کی گردن ہلا دیتے اور لو بھائی کہانی ختم، پیسہ ہضم۔ مجھے اپنے ان کمینے تایا زاد بھائیوں کی قسمت پر رشک آتا جن کے لئے عزیر بھائی انکے سینے پر مونگ دلنے کو اس دنیا میں بھیجے گئے تھے۔ جب رات دس، ساڑھے دس بجے تک پتا پانی ہو جانے کے

ساتھ ساتھ جمائیاں لے لے کر آنکھیں بھی پانی ہو جاتیں تو عزیر بھائی سے گھر جانے کی اجازت ملتی۔ابھی تو سلسلہ شروع ہوا تھا۔ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔ابھی تو کرکٹ کھیلنے، ٹی وی دیکھنے یا پتنگ اڑانے کے بارے میں سوچنا سہانا خواب ہی تھا کہ امتحانات سے ٹھیک بیس، پچیس دن پہلے ماسٹر صاحب دغا دے گئے۔انکی امی کی طبیعت خراب تھی اسلئے انہیں فوراً حیدرآباد جانا پڑا۔اتنے دن!ہمارے اوپر تو بجلی گر پڑی۔ہم سے زیادہ ابو کے ہاتھوں کے طوطے اڑے۔اب کیا ہوگا؟ ماسٹر صاحب نے وعدہ کر رکھا تھا کہ امتحانات سے دس دن پہلے وہ گیس پیپرز کی حتمی تیاری کروائیں گے۔اب اس وقت جب ساری دنیا کے ماسٹر صاحبان اپنے اپنے شاگردوں کو اپنا علم گھول کر پلانے میں دن رات مصروف تھے، ہماری طرف کون دیکھتا؟ آخر کار قرعہ فال عزیر بھائی کے نام ہی نکلا۔انکے آخری سال کے امتحانات شروع ہونے میں ابھی دو مہینے تھے۔بقول انکے انہیں کان کھجانے کی فرصت نہ تھی مگر ماموں جان (ہمارے ابو) کے کہے کو منع کیسے کرتے۔طے پایا کہ بڑے چچا کے دونوں سپوت اور مابدولت اسی طرح چھوٹے چچا کی بیٹھک میں دوپہر کو ان سے پڑھا کریں گے جس طرح ماسٹر صاحب سے پڑھا کرتے تھے لیکن تین گھنٹوں کے بجائے دو گھنٹے۔اس سے زیادہ انکے پاس وقت نہیں تھا۔وہ اپنی یونیورسٹی سے واپس آکر کھانا کھانے کے بعد فوراً ہی چھوٹے چچا کی بیٹھک پہنچ جاتے جہاں ہم پہلے ہی ہل ہل کر رٹے لگا رہے ہوتے۔چچا کی یہ بیٹھک انکے باقی گھر سے الگ تھلگ تھی اور اس کا ایک دروازہ گھر کے علاوہ باہر گلی میں بھی کھلتا تھا۔ویسے تو اس گلی میں لوگوں کی ٹھیک ٹھاک آمدورفت رہتی لیکن گرمیوں کی بھری گرم دوپہروں میں، جب سارے شریف لوگ اپنے اپنے گھروں میں اونگھ رہے ہوتے، یہ گلی اتنی خاموش، اتنی سنسان ہو جاتی کہ جیسے اس کمرے سے باہر کسی دنیا کا وجود ہی نہ ہو۔دھوپ کا رخ نہ ہونے کی وجہ سے اس کمرے میں ایک آسودہ سا اندھیرا اور خنکی پھیلی رہتی۔عزیر بھائی باہر گلی کے دروازے کو کھٹکھٹاتے اور ہم میں سے کوئی لپک کر دروازہ کھول دیتا۔اگلے دو گھنٹے کمرے کا منظر بالکل وہی رہتا جیسے ماسٹر صاحب کے سامنے ہوتا تھا۔بس فرق اتنا پڑا کہ ماسٹر صاحب کی منمنی آواز کی جگہ عزیر بھائی کی خوبصورت، بھاری مگر نرم آواز کمرے میں گونجتی۔انکے سمجھانے کا انداز بھی مختلف تھا۔گدھے اور گھوڑے کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کے وہ قائل نہیں تھے۔ایک ہی محلے میں رہتے آرہے تھے۔واصف اور عامر کے بارے میں جانتے تھے کہ شاطر لڑکے ہیں۔امتحانات میں کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔دوسرے ان کے ساتھ کسی مروت یا ذاتی دلچسپی کا تعلق بھی نہیں تھا، اسلئے انکا بیشتر وقت اب بھی مجھ پر ہی صرف ہوتا۔کچھ دیر کے سمجھنے سمجھانے اور سوال جواب کے بعد پھر وہی ہم ہوتے، وہی نوٹس ہوتے، وہی بڑے سے پنکھے کی گھوں گھوں اور وہی کھڑکی کا ہلتا ہوا پردہ۔شاید اس منظر میں عزیر بھائی اور ان کی آواز کے علاوہ کوئی فرق نہ پڑتا اگر چھوٹی چچی کی چائے درمیان میں نہ آ جاتی۔وہ دوپہر میں سونے کی عادی تھیں۔انکا کمرہ بیٹھک سے خاصا دور تھا اور درمیان میں صحن اور گول کمرہ آتا تھا، ہماری پڑھائی سے انکی نیند میں خلل پڑنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔عزیر بھائی کی آمد شروع ہونے کے تیسرے دن انہوں نے چھوٹی مانو سے کہلوایا کہ میں آکر عزیر بھائی کی چائے لے جاؤں۔

چائے۔۔۔۔؟

اس چائے کا اس سے پہلے تو کبھی ذکر نہ تھا۔ماسٹر صاحب آتے تھے، پڑھا کر چلے جاتے تھے۔نہ ان کا کسی سے واسطہ نہ کسی کو ان سے غرض۔لیکن عزیر بھائی ایک طرح سے خاندان کے لڑکے تھے، شائد اس لئے۔۔۔۔میں جا کر چائے لے آیا۔ساتھ میں زیرے والے نمکین بسکٹ بھی تھے۔دوسرے دن بھی چائے آئی دال موٹ کے ساتھ اور تیسرے دن چائے کے ساتھ خوشبوؤں میں بسی چچی خود آ گئیں۔ہماری یہ چچی خاندان کی دوسری شادی شدہ خواتین سے مختلف تھیں، اس کا اندازہ مجھے اس کم عمری میں بھی تھا۔دو بچوں کے بعد کا لازمی چھا جانے یا چڑھالیا جانے والا موٹاپا ان کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔اپنے چھریرے بدن کے ساتھ وہ اب تک لڑکی سی لگتیں۔میں نے انہیں ہمیشہ خوش رنگ، اور مروجہ فیشن سے مطابقت رکھتے لباس میں دیکھا۔بہت حسین نہیں تھیں لیکن اپنی خوش لباسی اور سنگھار کے باعث کچھ خوبصورت سی لگنے لگتیں۔انکے دوپٹے ہمیشہ کسی خاص قسم کی خوشبو سے مہکا کرتے۔وہ جہاں سے گزرتیں، اپنے اڑتے آنچل کے ساتھ اس خوشبو کو جا بجا بکھیرے جاتیں۔کیسی خوشبو تھی وہ؟ جو صرف انکے پاس سے آتی تھی۔میں آج تک سمجھ نہیں پایا۔اس خوشبو کو لئے جب وہ چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں تو عزیر بھائی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

''السلام علیکم۔۔۔'' انہوں نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کیا

چچی نے سر کے اشارے سے گویا سلام کا جواب دیا اور کہا ''بیٹھو بیٹھو۔۔۔ارے بیٹھ جاؤ بھئی''

یہ بات تو نہ تھی کہ چچی انکے لئے اجنبی تھیں۔خاندان کی بیاہتا تھیں۔خاندان کی تقریبات میں آتے جاتے سلام دعا تھی لیکن اس بے تکلفی کی غریب عزیر بھائی کو کیا امید تھی۔ہم بھی کچھ جز بز تھے۔چچی کیا کوئی شکایت کرنے آئی ہیں؟ کیا ہم نے ان کی نیند خراب کی؟ لیکن چچی خاموش بیٹھی تھیں۔عزیر بھائی چپ تھے اور ہم گوں مگوں۔کبھی کتابوں پر سے نظریں ہٹا کر ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھ لیتے۔چھوٹی چچی سے ہماری کوئی بے تکلفی نہیں تھی۔تائی امی کو ہم ہوش سنبھالنے سے دیکھتے آرہے تھے۔ہماری امی کی طرح ہم سے پیار بھی کرتی تھیں اور ضرورت پڑنے پر اپنے بچوں کی طرح ڈانٹ بھی لیتی تھیں۔لیکن ان سے تعلق نسبتاً نیا تھا اور ان کی طبیعت اور عادتیں بھی لئے دیئے سی تھیں۔انکے بچے بھی ہمارے ساتھ کے نہ تھے کہ ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے انکے ہاں اسی طرح آنا جانا لگا رہتا جس طرح تائی امی کے ہاں، اسلئے ان سے ہمیشہ ایک ان دیکھا فاصلہ ہی رہا۔

اس پرتکلف ماحول میں، جب خاموشی تکلیف دہ لگنے لگی تو چچی اچانک اٹھ کھڑی ہوئیں اور جاتے جاتے بولیں۔

''اچھا چلو۔۔۔چائے پی لو، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔۔۔کسی چیز کی ضرورت ہوا کرے تو بتا دیا کرو۔۔اپنا ہی گھر ہے''

جاتے جاتے اس جملے کی بازگشت کے علاوہ وہ اپنی مخصوص خوشبو بھی کمرے میں چھوڑ گئیں۔نہ جانے مجھے کیوں لگا کہ ہم سب نے تو سکون کے سانس لئے ہی لیکن عزیر بھائی نے بھی ناک اٹھا کر گہرے گہرے سانس لئے۔اور پھر اس خوشبو نے جیسے ہمارے کمرے کا راستہ دیکھ لیا۔ہم اس خوشبو اور چچی کے کمرے میں آنے جانے کے عادی ہو گئے۔اب عزیر بھائی ان کی آمد پر گھبرا کر کھڑے نہیں ہو جاتے تھے بلکہ اکثر سلام کرنے کے بعد ایک آدھ بار مسکرا بھی دیتے۔چچی کو ہماری کتابوں، امتحانات، پڑھائی اور آرام سے اچانک دلچسپی ہو گئی تھی۔لگتا تھا کہ ساری دوپہر اب سوتی نہیں ہیں کیونکہ انکی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ، ہماری بیٹھک سے ملے گول کمرے میں اکثر و بیشتر گونجا کرتی۔کبھی کبھی ہلکی سی گنگناہٹ بھی ابھرتی، جو، ان گرم سنسان دوپہروں میں عجیب پر اسرار سی لگتی۔شروع شروع میں ہماری ان آوازوں سے دوستی نہیں تھی لیکن دھیرے دھیرے ہمیں ان کی اپنے آس پاس رہنے کی عادت سی ہو گئی۔پھر اکثر چائے پہنچانے کے بعد انکا کچھ وقت کمرے میں گزرنے لگا۔کبھی سائیڈ ٹیبل پر رکھے گلدان کو جھاڑا پونچھا جا رہا ہے، تو کبھی کتابوں کی الماری سے کلیات فیض یا غالب نکال کر اسکی ورق گردانی ہو رہی ہے۔عزیر بھائی، جو پہلے ہم سے جان چھڑا کر بھاگنے کے چکر میں رہتے تھے، اب مرحوم داداجان کی کیم شحیم آرام کرسی پر، پنسل دانتوں میں دبائے، اکثر دو گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی سکون سے بیٹھے مسکراتے رہتے اور کبھی کبھی لگتا کہ اگر وہ کہیں اس کرسی کو جھلا پائیں تو ضرور جھولے جائیں، جھولے جائیں، جھولے جائیں۔

پھر ایک دن چائے کے ساتھ بادام کا حلوہ پیش کرنے کے بعد انہوں نے ذرا ترچھی نظر سے عزیر بھائی کو دیکھا اور کہا۔

''صرف نام کے ہی انجینئر ہو کہ کچھ ٹھیک ٹھاک بھی کر لیتے ہو؟''

عامر اور واصف اپنی پڑھائی بھگتا کر جا چکے تھے۔اس ٹھنڈے، نیم تاریک کمرے میں انکا سراپا کھڑکی سے آتی کرنوں کے ہالے میں جگمگا رہا تھا۔اسی پراسرار خوشبو میں بسا انکا آنچل باوا آدم کے زمانے کے دیوزاد پنکھے کی ہوا میں ہولے ہولے لرز رہا تھا۔انکے لبوں پر جو مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں جو جادو تھا، اسکا مطلب سمجھنے کے لئے میں بہت کم عمر، نا تجربہ کار اور نا سمجھ تھا۔لیکن عزیر بھائی بہت سمجھ دار تھے۔رومال سے ماتھے پر آئے پسینے کے قطرے صاف کرتے ہوئے، چھوٹی چچی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہوں نے ایک لمحے کو دیکھا۔

''ہمارا فرج خراب ہے۔کتنے دن ہو گئے۔ان کو تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی۔۔۔قسم سے ٹھنڈے پانی کو ترس گئے۔ذرا موقع نکال کر ایک نظر ڈال جاؤ آج''انہوں نے کچھ ایسے لاڈ بھرے، التجائی لہجے میں کہا کہ عزیر بھائی تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔

''چلئے۔۔۔میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔کہاں ہے؟''

چھوٹے چچا کے اس فرج کو خاندان کے پہلے پہلے فرج ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔اسکے بعد آنے والے کچھ سالوں میں تقریباً تمام گھرانے فرج یافتہ ہو چکے تھے لیکن اب تک اس فرج کی چچا کے گول کمرے میں طلسماتی آمد اور اس کے ارد گرد لوگوں کا جھمگٹا کوئی بھولنے کی بات نہیں تھی۔ایک اور بات جو اسے اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی تھی وہ اس میں پائے جانے والی ڈیوٹی فری اشیا کی فراوانی تھی جو چچا کو انکی ائرپورٹ کی ملازمت کے باعث با آسانی دستیاب تھیں۔شروع شروع میں ہم میں سے اکثر کسی نہ کسی بچے کو فرج کھول کر کھڑے رہنے پر ڈانٹ پڑا کرتی تھی۔کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی ہمت تو نہیں تھی، لیکن اس خوش رنگ غیر ملکی اشیائے خورد و نوش سے بھرے فرج کا اندرونی نظارہ کتنا خوش کن تھا کوئی ہم سے پوچھتا۔پھر شاید ہمیں اس احساس محرومی سے نکالنے کی ایک پرخلوص کوشش کے تحت فرج میں تالا لگوا دیا گیا۔اس تالے کے ساتھ ہی وہ ہمارے لئے ایسا شجر ممنوعہ ہو گیا تھا، جس کا رخ پھر کبھی نہ کیا گیا۔لیکن آج اسکے بیمار ہونے کی خبر سے نہ جانے کیوں کوکا کولا کی ٹھنڈی ٹھنڈی شیشے کی بنی سڈول بوتلیں پھر نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔اگر عزیر بھائی اٹھتے اٹھتے کڑی نظروں سے دیکھ کر''سیدھی طرح کام کرتے رہو'' کا سیدھا سیدھا پیغام نہ دے دیتے تو شائد میں بھی اٹھ کر ان دونوں کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔میں کمرے میں فزکس کی ایک نہ سمجھ میں آنے والی گتھی کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا گیا۔میں اسے سلجھانے میں مصروف تھا جب برابر کے کمرے میں چچی کی چوڑیاں زور سے بجیں، کچھ سرگوشیاں سی ہوئیں، اور پھر دونوں کی دھیمی سی ہنسی ابھری۔عزیر بھائی جب کمرے میں آئے تو انکا پورا وجود اس ہنسی کے زیر اثر تھا۔ان سرگوشیوں سے سرشار تھا۔اس دن میری فزکس کی گتھی دھری کی دھری رہ گئی، کیوں کہ پہلی بار وہ میرے کسی سوال کا جواب مجھے سمجھا نہیں پائے۔صرف آرام کرسی پہ پڑے، پنسل دانتوں میں دبائے، مسکرائے گئے، مسکرائے گئے۔

آنے والے دن، سخت امتحانات اور چلچلاتی گرمیوں کے تھے۔چچا کی بیٹھک ویران ہو چکی تھی اور عزیر بھائی کے کمرے میں میرا وجود لازم و ملزوم بن چکا تھا۔میرے چچا زاد جب اپنے گھروں میں مناسب موقع دیکھ کر ٹھنڈے کمروں میں پردے گرا کر اونگھ رہے ہوتے، میں بدنصیب نیند سے بھری آنکھیں لئے، موٹی موٹی کتابوں کے بڑے بڑے رٹے لگا رہا ہوتا۔عزیر بھائی کے پاس اب مجھے دینے کے لئے کم ہی وقت تھا۔انکے اپنے امتحان سر پر کھڑے تھے۔آخری سال کے اس معرکے کو بھی بحسن و خوبی سر کرنے کے لئے وہ سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ایسے میں میری موجودگی انہیں صرف اس صورت میں گوارہ تھی کہ میں حتی الامکان خاموش رہوں اور ان سے کم سے کم سروکار

رکھوں۔ابو اس صورت حال سے واقف تھے اور ان کے لئے صرف میرا انکے کمرے میں پایا جانا ہی باعث اطمینان تھا۔یوں بھی میری اور عزیر بھائی کی آزمائش کے کل ملا کر اگلے دو ہفتے ہی باقی تھے، پھر میرے امتحان ختم ہو جاتے اور انہیں مجھ سے اور مجھے ان سے چھٹکارہ مل جاتا۔

وہ بھی ایسی ہی ایک چلچلاتی، لُو کے تھپیڑے مارتی اور جھلستی دوپہر تھی۔ اگلے دن میرا کیمسٹری کا پرچہ تھا، جس سے میری کبھی دوستی نہیں رہی۔اس دن بھی میری روح فنا تھی۔خشک، بے رونق کتاب اور رجسٹر کے صفحات کھولے میں نہ جانے انہیں کیا تک رہا تھا۔عزیر بھائی کچھ دیر سے غائب تھے۔آجکل وہ اکثر اسی طرح دو ایک گھنٹے کو غائب ہو جایا کرتے تھے۔گھر میں دوپہر کے کھانے کے بعد، چھا جانے والے سناٹے میں وہ اٹھتے، اور باہر نکل جاتے۔مجھ سے کچھ کہنے سننے کی انہیں کیا خاک ضرورت تھی۔بس ایک کڑی نظر ہی کافی ہوتی جس کا مطلب میں خوب سمجھتا تھا۔یعنی مجھے ان کے واپس آنے تک کمرے کے اسی کونے میں اسی طرح پایا جانا تھا ورنہ۔۔۔اب وہ کہاں جاتے ہیں کیوں جاتے ہیں۔۔اتنا دماغ خرچ کرنے کے لئے میرے پاس، بچا ہی کہاں تھا، میں اپنے آپ سے بیزار تھا۔کب میری جان چھوٹے اور کب میں اس منحوس کمرے سے چھٹکارا پاؤں۔کبھی کبھی دل جلانے کو یونہی ایک گمان سا ہوتا کہ شائد پچھلی گلی کے دروازے سے واپس آکر کہیں پڑ کے اونگھ لیتے ہوں مگر پھر وہی کہ بھاڑ میں جائیں، میری بلا سے۔

لیکن اس دوپہر کسی خاص وجہ سے میرا دماغ اور آنکھیں دونوں معمول سے زیادہ اونگھ رہے تھے۔ہر تھوڑی دیر بعد میرا سر کتاب پر جھک جاتا، نیند کا جھونکا آتا اور آنکھیں بند ہو جاتیں۔پھر ایک جھٹکا سا لگتا اور میں ہڑبڑا کر اس دنیا میں واپس آتا جہاں دوپہر میں سونا میرے لئے کم از کم اگلے دو ہفتے تک حرام تھا۔خاص وجہ یا تو یہ کیمیا کے بے جان، بے روح نوٹس تھے، یا پھر شائد چھوٹی چچی کا بھجوایا لوکی کا حلوہ جو میرے لئے پھپھو نے کمرے میں تھوڑی دیر پہلے بھجوایا تھا۔چچی کا یہ حلوہ انکی خاص الخاص چیز تھی جو دور دور تک مشہور تھی۔نصیب والے ہی اس حلوے سے فیض یاب ہو سکتے تھے، اور آج کل پھپھو کے گھر کے نصیب جاگے ہوئے تھے۔کبھی کڑھی، کبھی بریانی اور آج یہ لوکی کا حلوہ۔بھئی واہ! لیکن اب اس نیند کا کیا کروں۔۔۔؟ میں نے بے زار ہو کے رجسٹر میز پر پٹخا اور پانی کا گلاس اٹھا کر عزیر بھائی کے بک شیلف پہ رکھے پانی کے جگ کی طرف بڑھا۔گلاس منہ سے لگا کر گھونٹ لیتے ہوئے میری نظر بک شیلف سے ہوتی ہوئی اس کونے کی طرف گئی جہاں مٹی سے اٹی انجینئرنگ کی ضخیم کتابوں، موٹی موٹی کاپیوں اور رجسٹرز کا ڈھیر لگا تھا۔مجھے ان فضول کتابوں سے رتی برابر دلچسپی نہ تھی مجھے تو اپنی اس گیند سے دلچسپی تھی جو ان کتابوں کے انبار کے پیچھے سے جھانک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔"ارے! میری بال!" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس غلیظ کونے سے اپنی عزیز از جان گیند باہر کھینچ لی۔کتنی پیاری تھی مجھے یہ، عزیر بھائی کو خوب اندازہ تھا۔نہ جانے کب سے تھی میرے پاس۔کرکٹ

تو شائد اس سے میں نے کبھی نہ کھیلی ہو، بس اپنے ہاتھ میں رکھے رکھے اچھالنے کی عادت سی ہو گئی تھی اسے۔بال پن سے لکھا میرا نام نہ جانے کتنی جگہ چمک رہا تھا اس پر۔ایک دن ذرا ہاتھ سے پھسل کر انکی کتاب پر جا پڑی تھی، بس ایک جھٹکے سے اٹھائی اور سامنے رکھی ٹرے میں ڈال دی۔پھر کہاں گئی یہ آج پتا چلا۔نفرت کی ایک لہر عزیر بھائی کے خلاف میرے دل میں اٹھی۔"ہونہہ۔۔۔بڑے آئے" غصے میں جیسے بدلہ لینے کو میں نے کرسی کی پشت پر پڑی انکی تولیہ سے اپنی گیند رگڑ رگڑ کر صاف کر ڈالی۔نیند غائب ہو چکی تھی لیکن کتاب کی طرف تو رخ کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا، پڑھنا تو ایک طرف رہا۔پتا نہیں ضد تھی، بغاوت تھی، غصہ تھا یا سرکشی کہ میں اٹھا اور دروازہ کھول کر گلی میں نکل گیا۔دور دور تک گلی سنسان پڑی تھی۔نہ آدم نہ آدم زاد۔گیند زمین پر مارتے اور پکڑتے چلتے چلتے جب اپنا تین منزلہ مکان آیا تو میں نے رک کر سب سے اوپر نظر ڈالی۔عامر اور واصف یقیناً کمروں کے پردے گرائے سو رہے تھے۔میری ایسی کہاں قسمت تھی کہ سامنے موجود، اپنے گھر کے کسی تاریک کونے میں پڑ کے اونگھ لیتا۔توبہ کرو۔۔قیامت نہ آجاتی ابو کے ہاتھوں۔

"کمینے۔۔سالے" میں نے دانت پیس کر اپنے تایا زادوں کو گالی سے نوازا۔گھر کے سامنے لگے نیم کے درخت کے نیچے لگی بنچ پر کچھ دیر بیٹھنے کا ارادہ کیا، لیکن اسکا سایہ بھی اس گرمی اور حبس کو کم نہ کر سکا جو آسمان برس رہا تھا۔تھوڑی دیر میں ہی بدن میں دھوپ چبھنے لگی اور حلق میں پیاس سے کانٹے اگ آئے۔چھوٹے چچا کے دروازے کے عین سامنے بیٹھا تھا شائد اس لئے مجھے اس ٹھنڈی بوتلوں والے فرج کا خیال کسی شیطان کی طرح آیا۔شائد آج چابی نہ لگی ہو!!! واپس جا کے جگ کا گرم پانی پینے کے مقابلے میں یہ خیال اتنا خوش کن تھا کہ میں نے اس "شائد" کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔گیند کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے میں نے گیٹ کو ہلکا سا دھکا دیا۔وہ کھلتا چلا گیا۔یہ اچھا شگن تھا۔ورنہ دوسری صورت میں، میں اوپر سے ہاتھ ڈال کر کنڈی کھول لیتا جس طرح ہم عام طور پر کھول لیا کرتے تھے۔اچھے زمانے تھے۔اس گیٹ سے تینوں منزلوں کو جانے والی سیڑھیاں ملتی تھیں اور سارا دن نہ جانے کتنے قدم اندر باہر ہوتے تھے اس لئے اسے کنڈی لگانے کا کم ہی تردد کیا جاتا تھا۔اندر جا کر میں نے چھوٹی چچی کے صحن میں جھانکا۔کوئی نہیں تھا۔صحن سے گزر کر جب میں گول کمرے میں داخل ہوا تو جیسے ایک لمحے کو باہر کی چکا چوند کر دینے والی دھوپ کے بعد اس اندھیرے نے میری آنکھیں تاریک کر دیں۔آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں فرج کی طرف بڑھا اور اس کے دروازے کو اپنی طرف کھینچا۔"ہت تیرے کی" کم بخت۔۔۔وہ حسب معمول چابی سے جڑا تھا۔ٹھنڈی سڈول بوتلوں کی حسرت پر لعنت بھیجتے ہوئے میں نے واپسی کے قدم بڑھائے کہ بیٹھک سے آتی کچھ مدھم، عجیب آوازوں نے میرے پیر پکڑ لئے۔کیا کسی نے کچھ کہا تھا؟ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔وہی مدھم

سرگوشی، گہری سانس پھر کہیں قریب سے ابھری۔ کیا کوئی بیٹھک میں ہے؟ کون ہے؟ تجسس، اسرار، کرید کی حس اگر انسان کے اندر اسے بنانے والا نہ ڈالتا تو نہ جانے ہم کتنی مصیبتوں، کتنی آزمائشوں، کتنے نظاروں سے بچ جاتے لیکن اسی کیوں، کہاں اور کس لئے نے ہماری مت ماری ہوئی ہے ورنہ لڑکپن کے اس سولہویں سال کی اس گرم دوپہر کو میں اس بیٹھک میں جھانکے بغیر الٹے قدموں پلٹ آتا تو۔۔۔۔۔۔لیکن میں نے الٹے قدموں پلٹنے کے بجائے روشن دان نما بڑی کھڑکی کے نیچی رکھے لکڑی کے صوفے کے ہتھے پر پاؤں جمائے اور اندر جھانکا۔ اندر کیا تھا؟ ایک لمحے کی اس ایک نظر میں میں نے اس ٹھنڈے اندھیرے کمرے میں دادا کی آرام کرسی کے پاس رکھے صوفے پر دو سائے سے دیکھے۔ ایک دوسرے میں مدغم، گہری سانسیں اور سرگوشیاں۔۔۔اسی ایک لمحے کے اگلے ہزارویں حصے میں میری روشنی سے مانوس ہوتی آنکھوں نے ان سایوں کے چہرے پڑھ لئے۔ میری نظروں کے سامنے جیسے روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ یوں لگا جیسے پاؤں کے نیچے رکھا صوفے کا ہتھا مجھے دھکے دے کر نیچے گرا رہا ہو۔ مجھے چکر سا آیا اور میں دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ بال میرے ہاتھ سے چھوٹ کر لڑھکتی چلی گئی۔ بیٹھک میں بھگدڑ سی مچ گئی۔

''کوئی ہے۔۔ باہر کوئی ہے'' عزیر بھائی کی گھبراہٹ میں ڈوبی سرگوشی ابھری۔ پھر کچھ سرسراہٹیں سی ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص جانی پہچانی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ کچھ لمحوں کی ان سرسراہٹوں اور آوازوں کے درمیان نہ جانے کب میں اٹھ کے بھاگا اور صحن سے گزر کے سیڑھیاں پھلانگتا چلا گیا، مجھے جیسے خواب کی طرح یاد ہے۔ اپنے گھر کے دروازے سے دوڑتا جب میں اپنی سوئی ہوئی امی کے پیروں میں دھڑ سے گرا تو وہ ہول کے اٹھ بیٹھیں۔ اسکے بعد مجھے ان سے لپٹ کے زور زور سے رونا، امی کا دعائیں پڑھ پڑھ کے مجھ پہ پھونکنا اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر انکے بستر میں چپ چاپ پڑے رہنا مجھے کہیں کہیں سے یاد ہے۔ شام کو ابو گھر آئے تو میری حالت دیکھ کر اور امی کی صلواتیں سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ امی کا خیال تھا کہ مجھ پر اس بھری دوپہر میں باہر واہی تباہی پھرنے کے دوران کوئی سایہ یا آسیب مہربان ہو گیا ہے اور اس کے ذمہ دار ابو ہیں جنہوں نے میری جان اس پڑھائی کے پیچھے مہینوں سے ہلکان کر رکھی تھی۔ ابو کتنے بھی بارعب سہی لیکن جب امی کسی بات پر لتے لینے پر آ جاتیں تھیں تو انکا سارا ابا پن ہوا بن کر اڑ جاتا تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے ''ارے کیا بات کرتی ہو بیگم۔۔۔ کیسا آسیب، کہاں کا سایہ، سب فضولیات ہیں'' وغیرہ وغیرہ کہہ کر ان کا غصہ کم کرنے کی کوشش کی لیکن میری صورت دیکھ کر ہاتھ پاؤں ان کے بھی پھول گئے تھے۔ شام ہوتے تک مجھے کپکپی چڑھ کر تیز بخار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے گرمی کا اثر بتایا اور مجھے مکمل آرام کروانے کی ہدایت کی۔ اب میرے امتحانات کسے یاد رہتے؟ میرا بخار تو اگلے دن اتر گیا، لیکن میں اسی طرح گم صم، چپ چاپ نہ جانے کتنے دن بستر میں پڑا رہا۔ میرے نوخیز ذہن پر کس آسیب اور گرمی کا اثر ہوا تھا، کسی کو بتانے کا کیا سوال تھا، میں تو اپنے آپ سے بھی نظریں چرا رہا تھا۔ سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ صورت ذرا سی نکل آئی تھی۔ ایک پرچہ کی قربانی دے چکا تھا، آخر اگلے پرچے کے لئے امی کے منع کرنے کے باوجود کتابیں لے کر بیٹھ گیا۔ عزیر بھائی کے ہاں جانے کا نہ کسی نے کہا اور نہ میں جاتا۔ اللہ جانے انہوں نے ابو کو میرے باہر پھرنے کے بارے میں کیا رام کہانی سنائی ہوگی، مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں، میری گیند ضرور انہوں نے واصف کے ہاتھ ایک دن بھجوادی۔

پھر بہت کچھ بہت جلدی جلدی ہوا۔ ابو نے آخر کار تسلیم کر لیا کہ میں انجینیئر نہیں بن سکتا، یوں میرے اوپر پڑھائی کا جو ڈنڈا ہر وقت لٹکتا رہتا تھا وہ ہٹا لیا گیا۔ میں نے ایک ڈپلومہ کورس میں داخلہ لے لیا۔ اسی دوران خبر اڑی کہ عزیر بھائی کی صوبے بھر میں اول پوزیشن آئی ہے۔ مٹھائیاں، مبارک بادیں یہاں سے وہاں ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ پتا چلا انہیں سعودی عرب میں ایک زبردست نوکری مل گئی ہے۔ پھر پتا چلا کہ انکی شادی ہو رہی ہے تاکہ پردیس اکیلے نہ جائیں۔ جس دن غزالہ آپا سے انکا نکاح تھا اس دن میں نے انہیں عرصے بعد دیکھا۔ کامیابی، سرخروئی کے غرور کا تاج تھا جو انکے سر پر رکھا تھا۔ کتنی رشک بھری نگاہیں تھیں جو ان پر گڑی تھیں۔ عزت اور توقیر تھی کہ چھپڑ پھاڑ کر ان پر برس رہی تھی اور پھر من پسند، من چاہی ہستی سے عمر بھر کا ساتھ ہونے جا رہا تھا۔ ان سے بڑھ کر خوش نصیب ہو سکتا تھا کوئی بھلا؟ غزالہ آپا کے کانوں میں لوگوں سے آنکھ بچا کے سرگوشیاں کرتے کتنے خوش نظر آ رہے تھے وہ۔ نکاح کے بعد مبارک باد کے لئے اسٹیج پر آنے والوں میں چھوٹی چچی بھی شامل تھیں۔ میں نے لوگوں کے سروں کے ہجوم کے پیچھے سے وہاں نظر ڈالی۔ اسٹیج کی چکا چوند روشنی میں وہ ہمیشہ کی طرح چمک رہی تھیں۔ شانوں پر بھاری بنارسی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے انہوں نے جھک کر دولہا، دلہن کی بلائیں لیتے ہوئے، مسکرا کر کچھ ایسی سرگوشی کی کہ غزالہ آپا کا سینے پر جھکا سر مزید جھک گیا اور عزیر بھائی کی کھلی باچھیں مزید کھل گئیں۔ میں نے اسٹیج کے نیچے کھڑے کھڑے پھر اچک کر چچی اور عزیر بھائی کے چہروں پر کچھ ڈھونڈنا چاہا۔ کوئی ملال، پچھتاوا، کچھ کھو دینے کا دکھ، لیکن وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس وقت میری ناتجربہ کاری اور نوعمری نے مجھے زندگی کا یہ سبق نہیں پڑھایا تھا کہ اس گرم دوپہر کو اس تاریک کمرے میں جو کچھ میں نے دیکھا اس کا تعلق ایسے کسی جذبے سے تھا ہی نہیں، جسے عشق، محبت یا جنون کہتے ہیں کہ جس کے ختم ہو جانے یا کھو دینے سے کوئی دکھ، ملال، یا پچھتاوا ہو۔ وہ تو صرف ہوس تھی، طلب اور رسد کے معاملے تھے۔ کچھ دو اور کچھ لو کے سلسلے تھے۔ اور کون جانے کہ اس طلب، اس رسد اور اس لینے دینے میں اور کون کون حصے دار تھا۔ تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔

پھر نہ وہ دادا کا تین منزلہ گھر رہا، نہ وہ محلہ اور نہ وہ زمانہ۔ پلوں کے نیچے سے گزرنے والا پانی اپنے ساتھ میری عمر کا ایک بڑا حصہ بہا لے گیا۔ بیرون

ملک ملازمت نے مجھے ان لوگوں، ان گلیوں سے اتنا دور کر دیا کہ کبھی کبھار کے کچھ دن کے آنے جانے میں نہ سب سے ملاقات ممکن رہی اور نہ بات چیت۔ امی سے فون پر بات ہوتی تو خاندان کی چیدہ چیدہ خبروں سے آگاہی ہو جاتی۔ کسی کی شادی کی، کسی کے ہاں اولاد ہونے یا کسی کے گزر جانے جیسے عام اور روز مرہ کی خبریں۔ انہیں باتوں سے پتا چلا کہ چھوٹی چچی بہت مذہبی ہو گئی ہیں، کئی عمرے کرنے کے بعد اب حج کر آئی ہیں اور اپنے گھر آئے دن قرآن کے درس اور نعت کی محافل منعقد کرتی رہتی ہیں۔ ان سے میری ملاقات اس تمام عرصے میں بہت کم کم ہوئی تھی۔ میں تو ان سے ملنے سے کتراتا ہی تھا لیکن مجھے پتا تھا کہ انہوں نے بھی کبھی مجھ سے بہت بات چیت یا ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن ایک موقع ایسا آیا جب ان سے نہ صرف دو تین دن مستقل آمنا سامنا ہوا بلکہ سلام دعا کے علاوہ کچھ بات چیت بھی ہو گئی۔۔ یہ موقع تھا انکے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی کا، جو اس موسم گرما میں ہوئی جب اتفاق سے مجھ سمیت تقریباً تمام بیرون ملک مقیم خاندان تعطیلات گزارنے کراچی پہنچے ہوئے تھے۔ ان دو تین دنوں میں، مجھے ٹھیک سے اندازہ ہوا کہ وقت نے انہیں کتنا بدل دیا ہے۔ انکا بردبار وجود اب ان خوشبودار دوپٹوں کے بجائے بڑی سی چادر سے ڈھکا رہتا، جس کا پلو وہ سر پر اس طرح لیتیں کہ بالوں کے علاوہ ماتھے کا بھی ایک بڑا حصہ اس میں چھپا رہتا۔ ہاتھ میں تھامی تسبیح کے دانے مستقل، ایک نپی تلی رفتار سے گرتے رہتے۔ بہت کم اور ضرورتاً بات کرتیں۔ پوری شادی میں ان کی اولاد دیوانہ وار انکے اردگرد پھیرے لگاتی رہی، انتظامی امور میں انکی رائے لینے اور ہر ہر رسم شروع کرنے کی اجازت لینے کے لئے۔ آفتاب چچا بھی اسی طرح کسی کونے میں لئے دیئے خاموش، بیٹھے رہتے لیکن یہ بات کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ دراصل اس شادی کا کرتا دھرتا کون ہے۔

اور کل ان کی تدفین تھی۔ اسی گھر میں، جہاں کچھ دن پہلے اسی طرح بچھی چاندنیوں پر جوڑے ٹانکے جا رہے تھے اور ڈھولک پیٹا جا رہا تھا، اب دانے اور سپارے پڑھے جا رہے تھے۔ میں نے پھر آس پاس نظر ڈالی۔ یہاں میرے جیسے اور کتنے تھے؟ پردہ پوشی، خاموشی، اور چپ کی چادر اوڑھے ہوئے۔۔۔۔ مصلحت، رواداری، اور چشم پوشی کے پردے میں ملفوف۔

آفتاب چچا کے بڑے داماد نے، چاندنی پر بچھے دانے سمیٹ کر ایک طرف کر دیئے۔ باورچی خانے سے بریانی اور قورمہ کی خوشبو آ رہی تھی۔ یقیناً کھانا لگنے والا تھا۔

کمرے کے ایک کونے سے پڑوس کی مسو خالہ کی ٹھنڈی سانس کے ساتھ بڑی رقت آمیز آواز آئی۔۔۔

''اپنی زندگی میں ہی خود کو سوا لاکھ کلمہ پڑھ کے بخش گئی۔۔۔۔ ارے ہمارے پڑھے کی اسے کیا ضرورت۔۔۔۔۔۔۔ اللہ مغفرت کرے ۔۔۔۔ بڑی جنتی عورت تھی۔۔۔۔''

## بقیہ: سایوں بھرا دالان

آخر وہی ہوا جس کا مجھ کو ڈر تھا۔ اُس نے جیسے ہی کھڑکی کے اس جانب کھسکنا چاہا اس کا توازن بگڑا اور وہ پھسل کر گر پڑی۔ اُس کو پکڑنے کی جستجو میں میں نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ وہ میرے ہاتھ نہیں لگی اور اندھیرے میں یہ بھی دکھائی نہیں دیا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی۔ میں تیس فٹ سے بھی زیادہ اونچائی سے گر پڑا تھا۔

مجھ کو ہوش آیا تو میں دواخانے میں تھا۔ میری دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں چکنا چور ہو گئیں تھیں۔ میری ماں شدید غم میں تھی کیونکہ اُس کو ایک رات میں دو حادثوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ایک بیٹے کی ٹانگوں کا ٹوٹنے کا حادثہ اور دوسرا حادثہ اس کی عزیز ترین سہیلی کی بیٹی کی خودکشی۔ جو پچھلی رات کو ان کے گھر آئی اور اپنے گھر جاتے ہی کسی کو کچھ بتائے بغیر خودکشی کر لی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق کسی نے اُس کی عزت لوٹی تھی۔

اس حادثے کو دس سال گذر گئے۔ لیکن اس حادثے کا ایک ایک منظر ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے سے گذرتا رہتا ہے۔ جیسے میں ٹی وی پر کسی منظر کا Recap بار بار دیکھ رہا ہوں۔

صبح سے وہیل چیرز پر بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا تھا۔ اب بستر پر لیٹنا چاہتا تھا۔ جولیا شاید میری بے چینی کو سمجھ گئی تھی۔ وہ بولی۔ ''آپ آرام کریں۔ مسلسل بیٹھنا بھی اچھا نہیں۔''

وہ میری وہیل چیرز ڈھکیلتی ہوئی مجھ کو کمرے میں لے آئی۔ مجھ کو سہارا دے کر آہستگی سے بستر پر لٹا دیا۔ مجھ کو ذرا سی بھی دقت نہ ہوئی۔ معاً مجھ کو خیال آیا کہ اُس کے چلے جانے کے بعد جھوٹے موٹے کام کے لئے بھی مجھ کو پہلے کی طرح دقت ہوگی۔ میں نے کہا۔

''سسٹر! آپ کے جانے کے بعد مجھ کو زندگی دوبارہ دوبھر لگے گی۔''

وہ بولی! ''آٹھ دن بعد آپ کا آپریشن ہوگا۔ آپریشن کے تین چار ہفتوں کے بعد آپ کس کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پہلے کی طرح آپ چل پھر سکیں گے۔ اپنے کام کاج کر سکیں گے۔''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ آپریشن کامیاب ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''صد فی فیصد'' وہ بڑے خود اعتمادی سے بولی اور کراس بنایا۔ ''میں ہر وقت خداوند سے دُعا کرتی ہوں کہ آپ اچھے ہو جائیں۔''

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جولیا میرے اچھے ہو جانے کی دُعائیں کرتی ہے لیکن میرا گناہ تو ایسا ہے جس کی سزا کا سلسلہ قبر میں بھی ختم نہیں ہو سکتا۔!!

# وہ

طاہرنقوی

(ابوظہبی)

اُس وقت میں شہر کے مشہور علاقے سے گزر رہا تھا۔کسی زمانے میں اکثر معززین یہاں گھومتے نظر آتے تھے۔شوقین محض تانک جھانک سے دل بہلاتے تھے۔شام ہوتے ہی گانے بجانے کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔پابندی لگنے سے پہلے یہ یہیں تک سمٹا ہوا تھا۔پھر پھیل کر شہر کے بیشتر فیشن ایبل علاقوں تک پہنچ گیا۔لیکن اس کی باقیات اب تک یہاں موجود ہیں۔میں تیز تیز قدموں سے جارہا تھا۔اچانک کسی نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔میں چونک پڑا۔اس علاقے میں میری جان پہچان والا نہ جانے کون نکل آیا تھا۔میں نے پلٹ کر دیکھا تو اُسے پہچان گیا۔اُس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''تم اور یہاں؟''

اُس کے اِس غیرمتوقع حملے سے میں ذرا بوکھلا گیا۔

''آں۔ہاں۔ذرا کسی کام۔۔۔''

''سب یہی کہتے ہیں!''

مجھ سے کوئی مناسب جواب نہیں بن پڑا۔بس تلملا کر رہ گیا۔وہ قہقہہ لگا کر فوراً غائب ہوگیا۔

وہ یونیورسٹی میں مجھ سے پہلے سے تھا۔مذہب سے بے زاری ہمیشہ اُس کا شیوہ رہا۔اس فیشن ایبل نعرے سے متاثر ہو کر اکثر طالب علم اُس کے ساتھ ساتھ رہنے لگے۔یوں وہ خودساختہ لیڈر بن گیا۔اپنی اپنی مصروفیات کے سبب اُس نے بارسوخ لوگوں سے رابطہ پیدا کرلیا تھا۔لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ،غنڈہ گردی اور کیمپس میں سیاسی تقریریں کرنے کے الزام میں کئی بار یونیورسٹی میں اُس کا داخلہ بند رہا۔میں ایم اے کے بعد یونیورسٹی چھوڑ کر روزگار کی تگ ودو میں لگ گیا۔وہ وہاں میرے بعد تک رہا۔پھر وہ مجھے اپنے محلے میں ملا۔پتہ چلا کہ وہ وہیں آبسا ہے۔مگر وہاں اُس کی شہرت اچھی نہیں رہی۔کیونکہ اُس کا روّیہ اب بھی ویسا ہی رہا۔اُن دنوں وہ کسی لبرل سیاسی پارٹی میں شامل ہوگیا تھا۔یوں علاقے میں اُس کا رعب تھا۔میں اُس سے ملنے جلنے سے احتراز کرتا تھا۔

اسی دوران ایک روز میں اپنے گھر کی طرف جارہا تھا۔وہاں مختلف ٹولیوں میں کھڑے لوگ چہ مگوئیاں کرتے نظر آئے۔میں نے حالات کا جائزہ لے کر کسی سے سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اُس کے گھر میں چند بدنام عورتیں غیراخلاقی حالت میں پائی گئی ہیں۔میں نے کریدا تو کسی اور نے وضاحت کی کہ محلے کے کسی شخص نے تھانے میں جا کر رپورٹ کردی تھی۔پولیس اُن عورتوں کے ساتھ اُسے بھی پکڑ کرلے گئی۔لیکن اُسی شام وہ محلے میں اکڑ اکڑ کر چلتا پھرتا دکھائی دیا۔اُس واقعے کے بعد میں اُسے آتے جاتے دیکھتا تو اپنا راستہ بدل لیتا۔اب شاید وہ بھی یہ بات سمجھ چکا تھا کہ میں اُس سے ملنے جلنے سے کترانے لگا ہوں۔آس پڑوس والے اُس سے سہمے ہوئے رہتے۔اُس کی ٹوہ میں بھی لگے رہتے۔اُس جیسے شخص کی زندگی میں کسی کے ملنے نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اُنہی دنوں میری فرم کا ایک یورپین کلائینٹ آیا ہوا تھا۔میری فرم اُس سے کوئی بڑا آرڈر لینا چاہتی تھی۔اس لئے معاملات طے کرنے کے لئے اُس سے ملنے مجھے ہی جانا پڑا۔وہ کلائینٹ کسی کلب میں ٹھہرا ہوا تھا۔پابندی کے باوجود ایسے چند کلب چوری چھپے اب بھی اُسی طرح چل رہے تھے۔میں وہاں پہنچا تو چونک پڑا۔کیونکہ مجھے پھر وہی نظر آیا۔نشے میں دھت شاید ڈانس دیکھ کر اُس کلب سے نکل رہا تھا۔میں اُس کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا۔مگر اُس نے مجھے دیکھ لیا اور بہکے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

''بھئی۔یہاں کیسے؟''

اُس کے چہرے پر اب بھی ویسی ہی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔میں ابھی کوئی وضاحت نہیں کرپایا تھا کہ وہ جھومتا جھامتا آگے نکل گیا۔میں نے چند لمحے اُسے حقارت سے دیکھا اور اپنے کلائینٹ کے روم کی طرف جانے لگا۔

میں نے اُس کی ذاتی زندگی کے متعلق معلوم کرنے کی کبھی ضرورت سمجھی اور نہ وہ خود کسی کو زیادہ وقت دیتا تھا۔ہوا کے جھونکے کی طرح کہیں سے آتا تھا اور چلا جاتا تھا۔اسی طرح غیرمحسوس طریقے پر اُس نے میرے محلے سے اپنا ٹھکانہ کہیں اور کرلیا۔اس لئے عرصے تک اُس سے کوئی ملاقات نہیں ہوپائی۔رفتہ رفتہ وقت کی راکھ اُس پر پڑتی رہی اور وہ میرے ذہن سے تقریباً محو ہوگیا۔پھر ملک میں الیکشن کا موسم آیا تو شہر میں گہما گہمی ہوگئی۔ہرطرف جلسے جلوس ہونے لگے۔ایک روز کہیں سے گزرتے ہوئے میں نے کسی مذہبی سیاسی جماعت کے امیدوار کی حیثیت سے اُس کا انتخابی بینر بھی لگا ہوا دیکھا۔حیرانی کے ساتھ اب مجھے پریشانی بھی ہوئی۔اُسی وقت وہیں سے آگے بڑھتے ہوئے میں نے عجیب منظر دیکھا۔اُونچی شلوار سرپر دُپلّی ٹوپی اور چہرے پر شرعی داڑھی سجائے وہ نمازیوں کے جلو میں قریبی مسجد سے نکل رہا تھا۔یہ دیکھ کر میں بے اختیار اُس کی طرف لپکا۔اُس کے قریب جا کر میری زبان سے یکلخت نکلا۔

''تم اور مسجد!''

اب اُس نے دبی دبی مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور جواب دئے بغیر آگے بڑھ گیا۔۔!!!

☆

# ''کارِدنیا''

## امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

کس پہ الزام نہ تھا اُس کی گلی جانے کا
مستحق ٹھہرا مگر میں ہی سزا پانے کا

کارِ دنیا کے نئے رُخ کا پتا دیتا ہے
بیٹھنا چھاؤں میں آ کر کسی دیوانے کا

جب سے رندوں کی رسائی ہوئی ایوانوں تک
نام لیتا ہی نہیں کوئی بھی مے خانے کا

اب مکانوں میں دکانوں کا چلن عام ہوا
دور آیا ہے مکینوں کے چلے جانے کا

جب مقدر میں نہ ہو، سعی مداوا بے سود
ضرب ہی ایسی لگی ، ہوش نہیں آنے کا

جانے کیا بات ہوئی، اُس پہ ہی لکھا نہ گیا
ایک کردار تھا وہ بھی مرے افسانے کا

کیا سبب سوچ کے بتلاتے کسی کو راحتؔ
بے سبب اُس کے گلی کوچے میں یوں آنے کا

❍

## سید مشکور حسین یادؔ

(لاہور)

شبیہِ شوق کے جتنے شمارے ہم نے بدلے ہیں
اُسی نسبت سے قسمت کے ستارے ہم نے بدلے ہیں

جہانِ دید کا معیار ہی ہم نے نہیں بدلا
نگاہیں ہم نے بدلی ہیں نظارے ہم نے بدلے ہیں

ہمارے شانوں پہ لیتے رہے ہیں سانس دو عالم
یونہی کب اپنے کاندھوں کے سہارے ہم نے بدلے ہیں

ہم اپنے آنسوؤں میں ڈوب کر اکثر نکلتے تھے
فقط نکلے نہیں دریا کے دھارے ہم نے بدلے ہیں

ہماری وجہ سے کون و مکاں کی شکل بدلی ہے
زمین و آسماں کے سب کنارے ہم نے بدلے ہیں

عجب کیا پھُول برسیں اور گرج کر گونج کر برسیں
شعارِ برق بدلا ہے شرارے ہم نے بدلے ہیں

یونہی روز ایک تازہ آسماں کب یادؔ بنتا ہے
کروڑوں چاند سورج اور ستارے ہم نے بدلے ہیں

❍

## محمودالحسن

(راولپنڈی)

ہم بتاتے ہیں کہ ہیں دُنیا میں خنجر اور بھی
خود بخود دِل میں اُتر جاتے ہیں نشتر اور بھی

کاش پوری ہوں دلِ ایذا طلب کی حسرتیں
کاش ہوں ہم پر ستم اے بندہ پرور اور بھی

کُچھ تو دُھل جائے سیاہی نامۂ اعمال کی
ایک سیلابِ ندامت دیدۂ تر اور بھی

زندگی کا راز کر دیتے ہیں مر کر آشکار
زندہ ہو جاتے ہیں جب کچھ لوگ مر کر اور بھی

جیب وداماں ہی نہیں دیتے محبت کا ثبوت
کُچھ تو ہوتے ہیں نشاں سینہ کے اندر اور بھی

ایک دنیا ہے ترے حسنِ تبسم پر نثار
ہم سے پوچھیں ہم نے دیکھے ہیں جو منظر اور بھی

گالیاں کھا کر بھی ہم تو بے مزا ہوتے نہیں
لیجیے ہم خُود ہی کہتے ہیں ''مکرّر'' اور بھی

آ گئے ہیں ساقیا کچھ تو مٹے رِندوں کی پیاس
حوضِ کوثر سے ملیں دو چار ساغر اور بھی

کیا براہیمی صِفّت لوگوں کی اب حاجت نہیں
کیا نہ پیدا ہوں گے اب دُنیا میں آذر اور بھی

کون ہے جس کو ملا ہو میرے آقاؐ سا مقام
آئے ہیں دنیا میں گو لاکھوں پیمبر اور بھی

آپ کہلائے ستمگر پے بہ پے کر کے ستم
اور ہم ہوتے گئے محبوبِ داور اور بھی

○

## سُرور انبالوی

(راولپنڈی)

ہر اِک منزل تری یادیں ستمگر ساتھ رکھتے ہیں
تجھے بھُولے نہیں تجھ کو برابر ساتھ رکھتے ہیں

ہر اک جادہ ہر اک منزل تُو ان کے ساتھ رہتا ہے
یہ دیوانے تجھے خود سے بھی بڑھ کر ساتھ رکھتے ہیں

چلو وہ غیر تھے کیا ذکر اُن کی سنگباری کا
سِتم اپنوں نے جو ڈھائے برابر ساتھ رکھتے ہیں

غمِ دوراں ہُوا رخصت غمِ جاناں کو لے بیٹھے
''بھٹک جانے کے ڈر سے ایک رہبر ساتھ رکھتے ہیں''

سدا صبر و رضا سے دل کو ہم نے شاد رکھا ہے
قناعت کی یہ دولت بھی قلندر ساتھ رکھتے ہیں

ہم اُس کے شہر سے ہو کر تہی دامن نہیں لوٹے
ہمارے سر پہ جو آئے تھے پتھر ساتھ رکھتے ہیں

تری یادیں تو تیرے شہر میں ہی چھوڑ آئے ہیں
جو اپنوں سے لگے اِلزام ہم پر ساتھ رکھتے ہیں

لبِ ساحل نظارہ کرنے والے ہیں تہی دامن
جو گہرے پانیوں میں اُترے گوہر ساتھ رکھتے ہیں

سُرور انبالوی یونہی وفا کا دم نہیں بھرتے
کہ ہم تو سر کٹانے کا بھی جوہر ساتھ رکھتے ہیں

○

## انوارفیروز

(راولپنڈی)

لہو کا اک سمندر سامنے تھا
یہ کس مقتل کا منظر سامنے تھا

حسیں پھولوں کی مجھ کو آرزو تھی
مگر دیکھا تو پتھر سامنے تھا

تجھے میں کس طرح دل سے بھلاتا
ہمیشہ تیرا پیکر سامنے تھا

مسافت آئینہ دکھلا رہی تھی!
نظر جب بھی اٹھی گھر سامنے تھا

ہمارے ہاتھ اِک جگنو نہ آیا
اُجالے کا سمندر سامنے تھا

جہاں میں نفرتیں بانٹی تھیں جس نے
وہ پھر چہرہ بدل کر سامنے تھا

کسی کو دوش کیا انوؔار دیتا
کہ خود اس کا مقدر سامنے تھا

❍

## آصف ثاقب

(بوئی ہزارہ)

سفارش کی ضرورت رہ گئی ہے
مرے دکھ کی عدالت رہ گئی ہے

کوئی اپنوں سا اپنا بن کے سوچے
مرے دل میں یہ حسرت رہ گئی ہے

نمازوں میں کوئی آنسو نہ نکلا
عبادت سی عبادت رہ گئی ہے

لگاوٹ کی ہوئی تھیں تم سے باتیں
مگر دل میں شکایت رہ گئی ہے

ترا ملنا ہے رہ میں اتفاقاً
اب آگے اپنی قسمت رہ گئی ہے

رہینِ خاک ہو کر سوچتا ہوں
نجانے کتنی ذلّت رہ گئی ہے

ملی ہے داد ثاقبؔ اس غزل پر
خدا کا شکر عزّت رہ گئی ہے

❍

## غالب عرفان

(کراچی)

جدید فکر کی راہِ طلب میں رہتا ہے
شعورِ وقت جو شعر وادب میں رہتا ہے

سمندروں کی ہوا سے بھی نم نہیں ہوتا
وہ خشک لہجہ جو اک بے ادب میں رہتا ہے

روایتوں کا مخالف بنا ہوا اک دل
جو میری فطرت و نام ونسب میں رہتا ہے

اگرچہ آنکھ سے اوجھل ہے پھر بھی وہ ہردم
ہمیشہ ذہن کے پیش وعقب میں رہتا ہے

میں جس کی کھوج میں ہوں مجھ میں ہی وہ ہے لیکن
نہ جانے کون ہے کس روز وشب میں رہتا ہے

خیال ہو کے گزرتا ہے دن کے لمحوں میں
تو پیاس بن مرے تشنہ لب میں رہتا ہے

وہ مجھ سے ملتا ہے اکثر فرازِ عرفاںؔ میں
مگر وہ جہتِ بنائے سبب میں رہتا ہے

○

## پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

تاریکیوں میں ڈوب رہا ہے جہانِ صبح
گم چشمِ مُنتظر سے ابھی ہے نشانِ صبح

جو رات بھر رہے سر مژگاں ستارہ بار
اِک ایک کر کے ٹوٹ گئے راز دانِ صبح

یہ دن نہیں، ہے خندۂ صبح جمالِ ناز
یہ شب نہیں، ہیں گیسوئے عَنبر فشانِ صبح

چشمِ فلک سے گرتے رہے رات بھر جو اشک
اُن کے لہو سے لکھی گئی داستانِ صبح

پھیلی ہے آسمان پہ جو بَن کے کہکشاں
یہ رہگزارِ صبح کہ ہے نردبانِ صبح

رودادِ ظلمتِ شبِ ہجراں کے ساتھ ساتھ
اچھا رہے جو چلتی رہے داستانِ صبح

ہم کو نصیب ہو نہ سکی ایک بھی کرن
ہر چند عمر بھر رہے افسانہ خوانِ صبح

اہلِ زمانہ قدر ہماری کریں زہیرؔ
ہم لوگ اس زمانے میں ہیں پاسبانِ صبح

○

## ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(کیلی فورنیا)

دل سے ملیئے ، جب بھی ملتے ہو کسی سے
بیگانہ خُو سے کون ملتا ہے خوشی سے

رابطہ رکھتا نہیں وہ تو کسی سے
اور تُو ملتا ہے دل سے ہر کسی سے

کون آئیگا اب اس در پر تمہارے
کسکو نسبت ہے تمہاری بے کسی سے

ماسوا شریں زبان ، نیک نامی
کچھ نہ ہو گا ساتھ خالی زندگی سے

ہو گئے بے معنی جسم و جاں تمہارے
بقعۂ نور ہوا دل آ گہی سے

درسِ عبرت دے گئی پیاس اُسکی
کرتا پھرتا تھا محبت تشنگی سے

رات بھر جلتا رہا شمع کی صورت
کاش ہو جاتا تعلق بندگی سے

تیری صورت نے دکھائے کیسے جلوے
ملتا ہے ہر شخص تم سے بے رُخی سے

مختصر ، مختصر سی تمہاری دنیا
باز رکھتی ہے تمہیں اب سرکشی سے

تھے تعاقب میں اجل روزِ ازل سے
منقطع کب ہو تعلق زندگی سے

چھوڑیئے بھی ذکرِ عہدو پیاں بھی تشنہ
پوچھیئے راہِ نجات کسی مولوی سے

○

## ولی عالم شاہین
(کینیڈا)

اَن کہی داستان چھوڑ گیا
شہر کو بد گمان چھوڑ گیا

اک گھڑی تھی مری کلائی پر
وقت گہرے نشان چھوڑ گیا

کون کس کا ہوا کہا اُس نے
ساتھ پھر بے گمان چھوڑ گیا

اک بہانہ بھی مل گیا اس کو
بھیڑ کے درمیان چھوڑ گیا

کس نے پتوار سارے توڑ دیئے
کون بے بادبان چھوڑ گیا

کر دیئے شہر سب کھنڈر کس نے
اک کھلا آسمان چھوڑ گیا

میں تو غافل تھا اُس کو عجلت تھی
وہ مجھے نیم جان چھوڑ گیا

کھا کے شاہین زخم کانٹوں کے
پھول جیسی زبان چھوڑ گیا

○

## مہندر پرتاپ چاند

(انبالہ شہر،بھارت)

بچا نہ کچھ بھی نگاہوں کو مُنتہیٰ کے سِوا
جھُکا یہ سر نہ کہیں اُن کے نقشِ پا کے سِوا

ہزار منّتیں کیں۔ لاکھ ہاتھ پھیلائے
مِلا نہ کچھ بھی مگر زخمِ التجا کے سوا!

نہیں ہے اس کے سوا اور کچھ بھی پاس مرے
میں دُوں بھی کیا تجھے اے دوست! اب دعا کے سِوا؟

یہی ہوس ہے کہ سارا جہاں ہو زیرِ نگیں
جہاں میں کچھ بھی نہیں اور اس ہوا کے سِوا

خلوص شرط ہے اوّل بھی اور آخر بھی
دیارِ عشق میں سب ، سچ ہے وفا کے سِوا

لَبوں پہ حرفِ وفا ہے، دِلوں میں بیر مگر
کہوں میں کیا اسے یاروں کی اِک ادا کے سِوا!

عزیز کیوں نہ ہو اے چاند! مجھ کو یہ دولت
بچا بھی کیا ہے مرے پاس اب اَنا کے سِوا؟

O

## سید سعید نقوی

(نیویارک)

کچھ کہے اور نہ کچھ سنے دن بھر
آئینہ کاش چپ رہے دن بھر

یوں رہے ہم خدا کی بستی میں
جی اٹھے اور کبھی مرے دن بھر

دن میں جگنو تلاش کرنے کو
آپ کہئے کہاں رہے دن بھر

شاید یہ ابتدا ہے آندھی کی
سوکھے پتے کہیں گرے دن بھر

خواب جو رتجگے کی نظر ہوئے
ہم انہیں ڈھونڈتے رہے دن بھر

کسی بینا کو دیکھنے کے لئے
ایک اندھا پھرا کرے دن بھر

کوئی ہوگا تو اندر آئے گا
بس اسی سوچ میں رہے دن بھر

آدمی اب یہاں نہیں ملتا
بستیاں چھانتے رہے دن بھر

پھول شاخوں سے نوچ نوچ کے ہم
دام کرتے رہے دن بھر

ہم کسی سے تو خیر کیا ملتے
خود کو ہی ڈھونڈتے رہے دن بھر

O

# لاش کے آنسو

## تشنہ بریلوی

(کراچی)

نیند کے مزے لے، اے ننھی پری اور اے رشکِ حُور خاتون اپنی تھکن اُتار۔

رات کے دو بج چکے ہیں۔اندھیرے اور سناٹے کا راج ہے۔اس کمرے میں، اِس بیڈروم میں بھی خاموشی ہے' روح فرسا' وحشت ناک سکوت' تابوت اور مُردہ خانے کی خاموشی۔

''لیکن اس خواب گاہ میں ایسا آسیب زدہ ماحول کیوں؟ یہاں تو بہارِ حیات رقصاں ہونی چاہیے اس لیے کہ زندگی کے دو خوبصورت نمونے یہاں موجود ہیں، بسترپر محوِ خواب''۔

بیشک' مگر پھر بھی یہ کمرہ موت ہی کا ماحول پیش کر رہا ہے کیونکہ زندگی کے اِن دو دل آویز مرقعوں کے ساتھ یہاں ایک لاش بھی موجود ہے، ایک بھوت، جو اس نفیس شبستاں کو مقبرہ میں تبدیل کر رہا ہے۔اور یہ لاش اس ننھی بچی کے باپ اور اس نوجوان عورت کے شوہر کی ہے۔

خواب گاہ کے ایک تاریک گوشے میں مَیں کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں' سر جھکائے اور بمشکل سانس لیتے ہوئے۔میں خود کو زندہ لوگوں میں شمار نہیں کرتا۔میں تو مُردوں سے بدتر ہوں چونکہ میرا دل مر چکا ہے، میری روح مر چکی ہے، میرا ذہن و دماغ، شعور، لاشعور سب کچھ مر چکا ہے۔میں سانس ضرور لے رہا ہوں لیکن میری سانس سے بدبو کے بھبکے پھوٹ رہے ہیں، ایک سڑتے گلتے جسم کی طرح۔

''اگر ایسا ہے تو پھر تم اس کمرے میں کیوں بیٹھے ہو۔تمہیں تو زمین کے اندر ہونا چاہیے!''

موت کے بھی مختلف انداز ہیں۔ایک مُردہ ہزار سائے رکھتا ہے۔ اَن گنت چھلاوے اُس سے وابستہ ہوتے ہیں۔لیکن ذرا توقّف کیجیے۔جواب جلد ہی مل جائے گا۔سنسنی خیز جواب۔فی الفور میں صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ ننھی بچی جو بستر پر سو رہی ہے میری اپنی بیٹی ہے اور یہ نوعمر حسینہ میری بیوی ہے۔

دنیا کے کسی بھی انسان کو لیجیے۔مرد یا عورت، امیر یا غریب، تعلیم یافتہ یا اَن پڑھ۔وہ عزیزوں دوستوں کے درمیان زندگی گذارتا ہے(یا گذارتی ہے)۔محنت اور محبت سے اپنے ماحول کو خوشگوار بناتا ہے اور خوشیاں بانٹتا ہے۔

جب یہ انسان، یہ فرد، قدرت کے مقرر کردہ وقت پر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے (یا ہوتی ہے) تو اِسے ''مردہ'' نہ کہا جائے اور محفلِ زندگی سے اس مرد یا عورت کی ''روانگی'' کو ''موت'' ہرگز نہ سمجھا جائے اِس لیے کہ ''موت'' تو ایک شیطانی لفظ ہے۔لیکن میں اِس دلکش خاتون کا شوہر اور اس پری تمثال بچی کا باپ یقیناً ''مُردوں'' میں شمار ہوتا ہوں، میں قہرِ الٰہی کا عبرت انگیز نمونہ ہوں۔مگر شاید میرے اندر بھی ابھی زندگی کی رمق باقی ہے جو آنسوؤں کی اس آبشار کی شکل میں میرے قلبِ مُردہ کے کسی قدیم آتش فشاں سے لاوا بن کر اُبل رہی ہے۔

مزید برآں میں تو ایک مجرم ہوں، سزا یافتہ۔ایک عدالت میں میرا جُرم ثابت ہو چکا ہے۔مجھے پھانسی کی سزا مل چکی ہے اور اس سزا پر عمل بھی ہو چکا ہے۔پھانسی کا پھندا میرے گلے میں پڑ چکا ہے۔میرے ہاتھ پاؤں باندھے جا چکے ہیں۔تختۂ دار پیروں تلے سے ہٹایا جا چکا ہے یعنی ''دھڑن تختہ'' ہو چکا ہے۔ انگریزی حرف (ایل) کی طرح ایک ٹکٹی سے بندھے ہوئے پھندے میں جھولتا ہوا میں اپنی ٹوٹی اور مڑی ہوئی گردن کے ساتھ کُرّہ ارض کے گرد چکر پہ چکر لگا رہا ہوں۔ارض البلد اور طول البلد کی لکیروں کی طرح۔ ہر برّ اعظم سے گذرتا ہوا، عظیم سمندروں کے پانیوں سے چھُپاتا ہوا۔ تپتے صحراؤں کی چٹختی ہوئی زمین کو چھوتا ہوا۔ یخ بستہ پہاڑوں کی چٹانوں سے پھسلتا ہوا۔ گھنے جنگلوں کو پھلانگتا ہوا۔لُڑھکتا ہوا اور سطحِ ارض سے ٹکراتا ہوا میں گردش میں ہوں، بیحد تیز رفتاری کے ساتھ، اس لیے کہ بقول جرمن شاعر بورگر ''مرنے والے بہت تیز سفر کرتے ہیں''

DENN DIE TODTEN REITEN SCHNELL

(FOR INDEED THE DEAD TRAVEL FAST)

اور یوں گردش کرتے ہوئے میں اِس شعر کی تصویر بن جاتا ہوں:

میں بھی ہوں گردش میں یا پھر گردشِ دوراں ہوں میں
کون کہتا ہے کہ جیتا جاگتا انساں ہوں میں

جس عدالت نے مجھے سزا دی وہ لڑکیوں پر مشتمل تھی۔منصف، وکیلِ استغاثہ اور عدالتی عہدیدار سب لڑکیاں ہی تھیں لیکن جیوری میں چند حیران و پریشان خواتین اور اشکبار مرد بھی موجود تھے۔

''می لیڈی اور ممبرانِ جیوری'' وکیلِ استغاثہ نے اپنے خطاب کا آغاز کیا:

''آج یہاں کٹہرے میں آپ انسانیت کے سب سے بڑے دشمن کو دیکھ رہے ہیں جو کروڑوں بچّوں، لڑکیوں اور عورتوں پر ظلم ڈھا چکا ہے۔اُنہیں موت کے گھاٹ اتار چکا ہے اور لاکھوں خاندانوں کو تباہ کر چکا ہے۔اس کے جرائم کا خلاصہ یہاں ایک رجسٹر میں موجود ہے۔اسے پڑھیے اور اگر چاہیں تو ملزم سے جرح کیجیے، نرمی یا رحم کا ہرگز مظاہرہ نہ کریں اس لیے کہ یہ سخت ترین عبرتناک سزا کا مستحق ہے۔یعنی پھانسی اور صرف پھانسی۔ یہ بدنامِ زمانہ کردار

ایک بچّی کا سنگدل باپ ہے۔جی ہاں لڑکی کا باپ۔

''می لیڈی۔ ہر بچّہ، ہرنفسِ نوزائیدہ (لڑکا ہو یا لڑکی) جو اس دنیا میں وارد ہوتا ہے وہ خُدائے مہربان کی طرف سے ایک تحفہ ہے ایک قیمتی امانت اور والدین پر لازم ہے کہ وہ اس کا استقبال کریں اپنی آغوش اس کے لیے وا کریں۔ یاد رکھیں کہ خُدا نے ماں اور باپ ''دونوں'' کے ذریعہ اس بچّے کو دنیا میں بھیجا ہے۔اس لیے لڑکی کی پیدائش پر ماں پر ''الزام'' کسی صورت میں درست نہیں ہے۔ ماں تو محبت کا سرچشمہ ہے وہ دل وجان سے ننّھے وجود پر واری و صدقے ہوتی ہے۔لیکن یہ ملزم یعنی نو وارد کا باپ بچّی کی پیدائش پر بیحد اُداس ہو جاتا ہے اور غصّہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کو ''خطاوار'' قرار دیتا ہے یہ بھول کر کہ اِس ''خطا'' میں وہ خود بھی برابر کا شریک ہے۔ اپنے شوہر کے اس افسوس ناک روّیے کی وجہ سے بچّی کی ماں بھی خود کو ''مجرم'' سمجھنے لگتی ہے اور معاشرے کے گھناؤنے دستور کا حصّہ بن کر اس انسانیت سوز سازش میں مجبوراً شامل ہو جاتی ہے۔

''مزید برآں 'می لیڈی' وکیلِ استغاثہ نے ایک گھونٹ پانی پی کر بیان جاری رکھا'' اور اگر بچّی کا باپ دل پر جبر کرکے اسے قبول بھی کر لیتا ہے تو بھی بیشتر حالات میں اُس بچّی کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے، دکھوں اور ذلّتوں سے بھری ہوئی۔ اور اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ وہ کسی دن ''غیرت'' کے نام پر موت کے گھاٹ اتار دی جائے گی اپنے باپ کے ہاتھوں، یا باپ کی رضا مندی سے چچا کے ہاتھوں۔ ان الفاظ کے ساتھ می لیڈی، میں انسانیت کے نام پر' آپ سے ایک تاریخی فیصلے کی درخواست کرتی ہوں۔لیکن قبل اِس کے کہ میں اپنا بیان ختم کروں میں کچھ نمونے، کچھ جھلکیاں، بطورِ ثبوت پیش کرنا چاہوں گی۔یعنی اُن لڑکیوں اور عورتوں کی تصاویر، جو اس بدنام زمانہ مجرم کے ہیبت ناک مظالم کا شکار ہوئی ہیں۔''

ہال کی روشنیاں مدھم کر دی گئیں اور دیوار پر لگا بڑا اسکرین تصویروں اور منظروں سے بھر گیا۔ دل ہلا دینے والی تصویروں اور بھیانک مناظر کی نہ ختم ہونے والی قطار۔ مَردوں کی ایذا پرستی اور عورت دشمنی کے نمونے ۔ وحشیانہ سلوک کے مرقعے ،معصوم بچیوں پر ڈھائے جانے والے نا قابلِ یقین مظالم کے شاہکار۔ گلا گھونٹنے، خنجر یا کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کرنے، زندہ دفن کرنے، جلانے، سنگسار کرنے، کتّوں کے آگے چھوڑنے، معمولی بات پر ناک کان کاٹنے، تیزاب سے چہرہ جھلسانے، رشتہ سے انکار پر موت کے گھاٹ اُتارنے، بازار میں ننگا گھمانے، عصمت دری کا شکار ہونے والیوں پر کوڑوں کی بارش۔ بچّیوں، عورتوں اور بوڑھیوں پر مظالم کی انتہا۔

پورے ہال میں کہرام مچ گیا، گریہ وزاری، آہیں، سسکیاں، چیخیں۔الامان والحفیظ!

''معزّز ممبرانِ جیوری'' جسٹس نے قدرے بھرّائی ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔

''جب کوئی جج مسندِ انصاف پر بیٹھتا ہے یا بیٹھتی ہے تو عدالت کے جذبات و احساسات خود بخود اس کے شعور میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔ بہر حال یہ میرا فرضِ اوّلیں ہے کہ تمام حقائق و نظائر آپ کے سامنے رکھوں اِس لیے کہ فیصلہ تو جیوری کو ہی کرنا ہے اور چونکہ مدعا علیہ یعنی ملزم کسی قسم کی صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا اس لیے اب مقدمہ کا فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے''۔

ممبرانِ جیوی اپنی نشستوں سے اُٹھے اور فرداً فرداً ایک مخصوص کمرے میں غور وخوص کے لیے داخل ہو گئے۔

کچھ دیر بعد ممبرانِ جیوری اپنے انکلوژر کی طرف واپس آئے، نظریں جھکائے ہوئے۔قتل کے مقدمہ میں جیوری جب بھی سزائے موت کا فیصلہ کرتی ہے تو وہ ملزم کی طرف دیکھنے سے گریز کرتی ہے۔

فیصلہ سنایا گیا۔

''جیوری متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ ملزم کا جرم ثابت ہو چکا ہے۔اور سفارش کرتی ہے کہ مجرم کو پھانسی پر لٹکایا جائے تا دمِ مرگ۔''

یہ کوئی خواب تھا، کوئی واہمہ یا تصوّر کی شعبدہ بازی؟ یقیناً یہ ایک خواب ہی تھا۔لیکن ایک بہت خاص اور اہم خواب، ایک خفیہ پیغام ایک انتباہ ایک غیبی اشارہ جس نے میرے ہوش وحواس ٹھکانے لگا دیے، میرے دل ودماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور مجھے ایک نئے وجود میں ڈھال دیا۔

ایسا کیوں ہے کہ میں اپنی بیٹی سے محبت نہیں کرتا اور لڑکی کی پیدائش پر غضب ناک ہو جاتا ہوں۔ میں غور کرتا ہوں اور جواب کی تلاش میں اپنی روح میں جھانکتا ہوں۔

''سُن او حقیر بندے!'' میرے قلب کی گہرائیوں سے سرگوشی کے انداز میں ایک صدا بلند ہوتی ہے۔''تو اپنی بیٹی سے محبت نہیں کرتا اس لئے کہ تو ایک بزدل، کمزور اور ذلیل انسان ہے۔ تجھ میں ہمت نہیں کہ اپنے معاشرے کا سامنا کر سکے۔ اپنے خود ساختہ پیشواؤں اور اپنے خاندان کے غصیلے اور کم ظرف بزرگوں کا مقابلہ کر سکے۔حقیقت تو یہ ہے اے چھچھورے انسان، تو لالچ کا ایک نا قابلِ نفرت مجسمہ ہے۔شیکسپیئر کے شائی لک کی طرح دولت کا پجاری۔تو ایک سیٹھ، ایک بنیے کی طرح اپنے بچوں سے بھی سود در سود ادائیگی کا منتظر رہتا ہے۔ تجھے اپنے بیٹوں سے بھی محبت نہیں ہے۔تو اپنے ''فائدے'' کی وجہ سے اُنہیں قبول کرتا ہے زیادہ ''منافع'' کی اُمید میں۔ اور تو ایک بہی کھاتا لیئے ایک اکاؤنٹنٹ کی طرح ہر وقت نفع ونقصان اور لین دین کے چکر میں رہتا ہے۔ دوسری طرف نظر ڈال تو تجھے بچوں کی ماں بالکل مختلف نظر آئے گی۔ وہ اپنے جگر گوشوں، بچوں اور بچیوں پر ہر وقت جاں نثار کرنے اور تکالیف برداشت کرنے کے لیے تیار رہتی ہے کسی قسم کے معاوضے یا بدلے کے بغیر۔ یاد رکھ تیرا یہ نظام،

یہ ''مرد معاشرہ'' صرف اور صرف عورت کی وجہ سے چل رہا ہے اور تیرا یہ تہذیب و تمدّن کا قلعہ بھی اُسی کی قربانیوں اور خدمتوں کی بُنیاد پر استوار ہے، مگر کب تک؟ تاریخ انسانیت اب تنگ آ کر کروٹ بدلنے والی ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ بظاہر شاندار محل، یہ قصرِ پُرغرور ایک عبرتناک کھنڈر میں تبدیل ہو جائے یعنی:

دیکھا تھا پچھلے موڑ پر جو قصرِ پُرغرور
ہے سرنگوں وہ بن کے کھنڈر اگلے موڑ پر

نیند کے مزے لے اے مری بچّی اے تجھے فرشتے اور آرام کرائے باوفا خاتون۔ میں یہاں بیٹھا ہوں سُکڑا ہوا، سر جھکائے ہوئے ایک سزا یافتہ کی طرح اپنی خطاؤں کے بوجھ سے دبا ہوا۔ اعترافِ جرم سے لبریز میرے یہ دہکتے اور سُلگتے ہوئے آنسو میرے قصور وار ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میری حماقتوں اور زیادتیوں کا اظہار۔ شرمندگی کے سمندر میں ڈُوبا ہوا میں اپنے ''حاکمانہ'' اور ظالمانہ طرزِ عمل کو یاد کر رہا ہوں جو میں نے باپ اور شوہر کی حیثیت سے روا رکھا۔

رات بہت تاریک ہے لیکن میں تاریکیوں سے نکل کر کرنوں بھرے گلستان میں آ رہا ہوں جہاں خوشبوئیں بھی میرا استقبال کر رہی ہیں۔ میں نور و نغمہ بکھیرتی اس صبح کو ''خوش آمدید'' کہتا ہوں۔ مسرت کی ایک فرحت بخش لہر اب میرے جسم و جاں میں دوڑ رہی ہے۔ اب میں آزاد ہو چکا ہوں۔ صحیح معنوں میں آزاد۔ اوہام اور جہالت کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب میں ایک نئے جذبے، نئے ولولے سے زندگی کے سفر میں آگے بڑھوں گا اور ایسے مردوں کی صف میں شامل ہو جاؤں گا جو واقعی اپنی بیٹیوں (اور بیٹوں) سے محبت کرتے ہیں، انہیں زندگی کی ہر سہولت بہم پہونچا کر بہتر انسان اور بہتر شہری بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہایت گرم جوشی سے اپنی شریکِ حیات کا بازو تھام کر مجروح کا یہ مصرعہ گنگناتے ہیں:

ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا تو چراغ راہ میں جل گئے

اب کوئی احمق یہ نعرہ نہیں لگا سکتا:

FRAILTY THY NAME IS WOMAN

''اے عورت تیرا نام کمزوری ہے''

اس لیے کہ اب یہ تو یہ نعرہ بلند ہو گا:

FORTITUDE THY NAME IS WOMAN

''اے عورت تیرا نام استقامت ہے۔''

مرد معاشرے نے عورت کے خلاف زبردست سازش کی ہے لیکن وہ تو شہزوری اور ہمّت کی بہترین مثال ہے۔ یقیناً عورت یہ کہہ سکتی ہے۔

خُدا کا شکر ہے دل کی بڑی ہوں
ازل سے آسماں تھامے کھڑی ہوں

واقعی اے عورت تو آسماں تھامے کھڑی ہے مگر تیری عظمت وقوّت کو خود پرست مرد نہیں سمجھ سکتا۔ اب میری آنکھیں کھُل گئی ہیں۔ میرے دل کے تمام دریچے وا ہو چکے ہیں۔ گھٹن ختم ہو چکی ہے اور میں ایک منحوس حصار سے باہر آ چکا ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ شوہر اور بیوی کے درمیان کون آتا ہے۔ کون ہم پر حکم چلانے کی جرأت کرتا ہے۔ کون خاندانوں کو تباہ کرتا ہے۔ بچوں سے خوشیاں چھینتا ہے۔ اگر لڑکی کا باپ یا عورت کا خاوند عقل و ہوش سے کام لے کر دلیری دکھائے تو کوئی دیور، کوئی چاچا، کوئی جرگہ یہ ہمت نہیں کر سکتا کہ کسی عورت یا لڑکی کو ظلم کا نشانہ بنائے، یا اُسے اپنے انسانیت سوز قوانین کے تحت ''سزا'' دے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ خواب، یہ رُوح پرور تجربہ صرف مجھ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے بے وقوف اور بزدل مرد (باپ اور شوہر) اس میں شامل ہو رہے ہوں گے۔ ہمارے اُجڑے ہوئے کرۂ ارض کو جنت نظیر بنانے کے لیے۔

## بقیہ: چیدغ

والے اٹھالے گئے ہوں گے۔ نوشین کی حالت دیکھی نہ جاتی اسکے نالہ و فریاد سے کلیجہ پھٹنے لگتا اسکا تڑپنا دیکھا نہ جاتا کالونی کی خواتین اسے سنبھالنے کی کوششیں کر رہی تھیں اتنے میں خبر آئی کہ مجاہد کو سرِ باب تھانے کے انچارج نے بٹھا رکھا ہے۔ ایک جمِ غفیر تھانے پہ حملہ آور ہوا تو تھانیدار نے بڑھ کر استقبال کیا اور غصّے سے بھرے مجمع کو بتلایا کہ اس نے ہی تو فون کر کے اطلاع دی ہے کہ پروفیسر مجاہد اس کا مہمان ہے آ کر لے جائیں۔

''مگر پروفیسر مجاہد یہاں کیسے پہنچے'' پروفیسر بالاچ کو حیرت ہو رہی تھی۔ تھانیدار نے وضاحت کی ''ایک لہڑی دکاندار سے بات بڑھی تو پروفیسر نے اسکے سر پہ دکان میں پڑی ہاکی دے ماری۔ لہڑی تو جنگ وجدل کے شوقین ہیں انہوں نے پروفیسر کو گھیر لیا۔ قریب تھا کہ اسکی تکا بوٹی کر دیتے کہ گشتی ٹیم نے پروفیسر کو بچا لیا۔ سبھی کو تھانے لے آئے، دکاندار کا سر زخمی تھا مگر جب اسے پتہ چلا کہ حملہ آور مشہور پروفیسر مجاہد ہے تو اس نے نہ صرف معاف کر دیا بلکہ رپٹ بھی واپس لے لی'' بات اب تک معمّہ تھی۔ ''مگر دکاندار کو ہاکی کیوں ماری'' میں بتلاتا ہوں۔ پروفیسر چوہے کا پنجرہ تلاش کرتے پہنچا تھا۔

چوہادان دیکھ کر زیادہ بڑے کا مطالبہ کرنے لگا۔ انکار پر مشتعل ہو کر حملہ آور ہو گیا۔ غازی کے ہمدرد کنکھیوں سے ایک دوجے کو دیکھنے لگے۔ بڑا بہت ہی بڑا چوہادان۔ بھلا وہ کس لئے''

تھانیدار ہنس دیا ''کیا بتائیں جی! کہتا تھا اتنا بڑا کہ یونیورسٹی کے طلباء کو اس میں ڈال کے محفوظ کر لوں۔''

# ''سندراں مائی ڈیئر''

شاہد جمیل
(گوجرانوالہ)

تمہارے رنگ محل سے تا حد نظر پھیلے جھونے اور چینے کے ہرے کھیتوں کے بیچ کہیں کہیں سوانک کے پودوں پر لگے ہلکے سبز چکنے بیجوں کی قسم مجھے تم سے محبت ہے۔ کیا میں نہیں دیکھتا تھا کہ تمہیں دور سے کھیتوں میں آتا دیکھ کر گنے کی پوریاں کس کس طرح تمہاری بدن آرائی پر رشک کیا کرتی تھیں۔ سنی کی ڈالیوں پر بندھے گھنگرو تمہیں دیکھ کر چھن چھن تالیاں پیٹتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے تمہاری سکھیوں کے پور پنگھٹ پر کنوئیں کے شفاف پانی میں اپنی پازیبیں دھو کر سوکھنے کیلئے لٹکا گئے ہوں۔ یاد ہے پگڈنڈیوں پر تمہاری قدم بوسی کیلئے بڑھتی کھبل گھاس اور آکاس بیل اور پیلوں کی نازک تن شاخیں تمہاری گوری پنڈلیوں اور گوسفندی ٹخنوں سے الجھ کر چٹک چٹک ٹوٹتیں۔ تمہارے دودھیا گلے کی چمک سے پٹ سن کے پودوں کی چھال چیخ کر ادھڑنے لگتی۔ کماد میں اگی کچرے کی بیلیں تمہارے ہاتھ کے ریشمی لمس کی خاطر کیسے کیسے اپنی گولائیاں تمہاری نظروں کے رستے میں لڑھکا دیتیں اور کس کس طرح خودرو چبڑ کی بیلیں اپنی کسمپرسی پر نوحہ کناں ہوتیں۔ تمہارے ہاتھوں اور پیروں کی مخروطی انگلیاں دیکھ کر بھنڈی کے پودے لاج سے اپنے پھل چھپانے لگتے۔ چنے کے کھیتوں میں اپنی ننھی پیٹیوں میں بند دانے تمہارے ہاتھ سے ہولیں ہونے کو ترستے۔ گرمیوں کا موسم آتا تو تمہارے جمال سے مرعوب ہو کر گیہوں کی بالیاں تانبا ہو جاتیں۔ گھاس پھونس میں دبکے تیتر طرح طرح کی بولیاں بول کر تمہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتے۔ جھاڑیوں میں اکڑوں بیٹھے سفید، کالے اور بھورے خرگوش تمہیں دیکھ کر اشتیاق سے چوکڑیاں بھرتے۔ بیلے میں کھڑے بھینسوں کے گلے تمہیں دور سے دیکھ کر سینگ ہلاتے اور ان کی بھٹنیوں میں سرن سرن دودھ اتر آتا۔ تمہیں دیکھ کر بھیڑوں کے چھیلوں اور بکریوں کے میمنوں کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ کچھ وقت کو اچھل کود اور ممیانا بھول جاتے۔ تمہاری نگاہ ناز کے طفیل دہقانوں کی راہلیں اور اوڑیں ٹیڑھی ہو جاتیں اور تمہاری دراز کمر پر جھولتے پراندے کی خوشبو سونگھنے کیلئے ان کے بیلوں کے نتھنے پھول جاتے۔ تمہاری خوشبو پا کر اصطبل کے گھوڑے بدک جاتے اور بیچاری بچھیریوں کی شامت آ جاتی۔ شاعر اور سنت تمہیں سوچ کر نارسائی کے گیت جوڑتے اور کہانی کاروں کے دل میں ہاہا کار پڑ جاتی۔ تمہارے نین نقش کا خیال کر کے چکوے چکویاں اپنے انڈوں میں اپنے ہونے والے بچوں کے خدوخال سیتے۔ تمہارے قدموں کا بوسہ لینے کیلئے علاقے کی کلر زمینیں اپنا سفید نمک اگلتیں۔ تمہارے پشواز کے بٹنوں کے تناؤ سے ترنجن میں بیٹھی جوانیوں کی سانسیں اتھل پتھل ہو جاتیں۔ تمہارے سرین کی بٹک سے جاڑے میں راہگیروں کے پسینے چھوٹ جاتے۔ مجسمہ ساز ہمہ وقت چوری چوری میدے میں کیسر اور دودھ ملا کر تمہارے نقش و نگار ابھارنے میں مصروف رہتے۔ تمہارے سراپے کا سوچ کر روڈس کی گلیوں میں گتکا کھیلتے لڑکے مرد ہو چلے۔ مون سون کے موسم میں تمہاری پوشاک کے پٹ وا کرنے کیلئے پچھمی ہوائیں تیز چلنا شروع کر دیتیں اور آندھی تمہارا انگرکھا اڑانے آتی۔ تمہارے گال، گردن اور بازوؤں پر لٹکتے ہیرے جواہر اور پانسے کے سونے تمہارے جوبن کی تپش سے آگ کی طرح دھکنے لگتے۔ تمہاری مانگ میں گندے جوہی، گیندے اور گلاب کے پھول اپنی شاخوں سے ٹوٹنے پر بھی رشک آفریں ہوتے۔ سارا چمن رات بھر اوس کے دوش پر تمہارے نشے کیلئے اپنے پھولوں کے کٹورے بھرنے پر معمور ہوتا۔ قطب ستارا ہر روز سحری کے وقت تمہارے دیدار کو آتا اور شب بھر کہکشاؤں میں تمہارے جلوے کی گفتگو ہوتی۔ تمہارے ہونٹوں کی تراش اور تمہارے دہن کا اندام پا کر بڑے مہنت اپنی لنگوٹیاں بھول جاتے۔ پھٹی کے پودے اپنی روئی کو تمہارے رنگ کے مواقف نکھارتے۔ ریشم سے چلمن بنانے والے تصورات میں گوٹہ کناری اور لپے کو تمہاری آغوش میں ڈال کر درست کرتے۔ سادھو لوگ تمہارے ہاتھ سے خیر لینے کی اچھا دل میں رکھتے اور تمہاری منتا کے کارن ان کے کاسے سوکھ جاتے۔ تمہارے حسن کی جھلک پا کر پرندے اپنی افزائش میں جتے رہتے۔ کتنے ہی غریب ہرکارے ہر روز تمہارے تصور میں اپنی بیبیوں کے گھونگٹ الٹتے اور اپنی سانسیں پھلا کر بے دم سو جاتے۔ بظاہر تمہارے دھیان سے گریزاں کتنے ہی قضاء و مشائخ و راہب و سنت اپنے گیان و گمان اور بیان بھول جاتے۔ تمہیں دیکھ کر عشق پیچاں کی بیلیں لہکتیں، کیاریوں میں کونپلیں پھوٹتیں اور پھلواریوں میں پھول کھلتے۔ کتنے ہی بادشاہ خانوں میں شہزادے تم پر شرطیں جیتنے کی تیاریاں کرتے اور اپنی صحت افزائی کے لئے ڈنٹر پیلتے۔ تمہارے دانتوں کی چنبیلی کیلئے شمال و قندھار میں دنداسے لپٹتے اور تمہاری ہنسی کیلئے موتیے کی کلیاں چٹختیں تم سے تخلیے کیلئے مہران اور پورب سے پیام آتے۔ تمہارے روئی جیسے پیٹ کی نرمی کیلئے افغان کے تونبے پھکیاں ہو گئے اور تمہاری نازک نازک ناف اور ہموار پیڑو کی ملائمت کیلئے مشرق کے ارنڈ اور مغرب کے زیتون پہنچے۔ تمہارے حسن کے اعلان کی خاطر شفتل اور شتالے بچوں کے ہاتھوں کی پیپنیاں ہو گئے۔ تمہاری کسک پا کر اہل فراق کے درد لے، سر، تان اور راگ راگنیوں میں ڈھلے۔ تمہارے ماتھے سے مست ہو کر اہل گیان اپنے ماتھے اور تمہارے گھٹنوں سے متاثر ہو کر اہل مذاق اپنے گھٹنے پر بھوؤں کے سامنے ٹیکنے پر مجبور ہوئے۔ غلافوں میں لپٹی دیمک زدہ کتابوں نے تمہارے ذکر سے چوپالوں اور چوراہوں میں

فروغ پایا۔تمہارے نام پرناریوں نے اپنے نہاں سنبھالنے شروع کئے۔تم سوچتی ہوگی کہ میں اس وقت کہاں تھا تو سنو جب تم سوئی ہوئی تھیں تو میں نے چودھویں کے چاند کی روشنی میں تمہیں دیکھا۔تمہارے سانس کے زیرو بم میں قیام کیا اور تمہارے نطق کی پھننگلی کی لالی میں بسرام۔تمہارے حوض کی اینٹ کے شگاف سے تمہارے بام کو چنا اور زیر کی بیونت کی۔کبھی زیر جامہ کروٹ میں ملگجی کر اور کبھی کیلے کے پتے سے بارش کے قطرے کی طرح تمہاری ران پر پھسل کر میں نے تمہاری باس حاصل کی۔تمہارے درس کی خاطر کبھی مجھے کھوپرے کی ٹھوٹھیوں میں دھرا گیا اور کبھی اجوائن کی پوٹلیوں میں باندھا گیا۔کبھی میں تمہارے ہاتھ کی میل بن کر جوگیوں اور فقیروں میں تقسیم ہوا اور کبھی مجھے تمہارے لباس سے تھورمل کر دھویا گیا۔کبھی مجھے تمہارا ہاتھ لگوا کر دیوی کے چرنوں میں ذبح کیا گیا تو کبھی خوان کے دان کی صورت بھیک منگوں کے میلے ہاتھوں پر رکھا گیا۔میں کبھی چڑیوں کے دانے میں بکھرا تو کبھی کوؤں کے کھاجے میں اڑا۔کبھی میں گھڑے سے پانی کی دھار بن کر تم پر نثار ہوا اور کبھی آجا اور سیاں مورے من بسیا کے بول بن کر تمہارے گلابی ہونٹوں سے جھڑا۔کبھی میں نے تمہاری چاہت کے وجدان کا بھوگ لیا اور کبھی گیان کا جوگ اور کبھی سونے پن کا سنجوگ۔

ہاں تو اے سندراں مائی ڈیئر مجھے تم سے محبت ہے۔تم کہوگی کہ اتنی صدیاں بعد میں جنم لینے والا آدمی اتنا عرصہ پہلے پیدا ہونے والی عورت سے کس طرح عشق کرسکتا ہے۔دیکھو بھاگن اگر میرے معدوم کے بعد میری روح کئی اربوں سالوں تک دنیا میں بھٹک سکتی ہے تو ظہور سے قبل کیوں نہیں۔ہم روحیں ہیں، ازل ازل کی زندہ روحیں۔ہمارا ظہور اور معدوم سب اضافی ہیں۔ہم کبھی مرتی نہیں، ہماری صرف ہیئت تبدیل ہوتی ہے کبھی وجود کی شکل میں اور کبھی روح کے انداز میں۔اچھا!اس بات کو چھوڑ، دکھ کی عمیق پرچھائیوں میں اس بات کو بھی کہ مجھے تم سے امٹ محبت ہے۔اس وقت کو یاد کرو جب ترنجن میں اور پن گھٹ پرسکھیاں تمہارے بدن کے خوبصورت حصّوں کو چھیڑ کر اور ان کے نام لے کر تم کو ستایا کرتی تھیں۔ان کی باتیں سن کر تمہارے کانوں کی لوئیں اور تمہارے گال لال ہو جاتے جیسے ان میں سے ابھی خون ٹپک پڑے گا۔کوئی تمہیں انار سے تشبیہ دیتی اور کوئی کچی کیریاں تم پر پھینکتی۔ہم جولیوں کی اس دھینگا مشتی کے بیچ تمہیں کسی باندی نے خبر دی کہ محل کے دروازے پر ایک عجیب فقیر آیا ہے جو کہتا ہے کہ وہ صرف سندراں سے خیر لے گا۔فرط جذبات میں گولی کے منہ سے یہ بھی نکل گیا کہ وہ دیکھنے میں تم سے کہیں زیادہ حسین ہے۔باندی کی بات سن کر پہلے تو تمہیں غصہّ آیا اور پھر تمہارا دھیان اس کی آخری بات میں اٹک گیا۔تم نے خیرات کی تھالی اپنے ہاتھ میں تھامی اور دروازے کی طرف بڑھیں۔دفعتاً تم نے فقیر کو دیکھا تو تمہارے دل میں آجا اور سیاں مورے بن بسیا کے گیت کی لے بلند ہوئی اور تم فقیر کو دیکھتی رہ گئی۔ساری دنیا تمہیں دیکھا کرتی تھی اور اب تم بے حال ہو کر فقیر کو دیکھ رہی تھی۔تمہارے پوچھنے پر فقیر نے بتایا کہ وہ پورن بھگت ہے اور اس کے گرو گورکھ ناتھ نے اسے تم سے خیرات لینے کیلئے بھیجا ہے۔تمہارے پاس کسی چیز کی کمی تو تھی نہیں اور اب تمہیں وہ چیز بھی پورن کے روپ میں مل گئی تھی جس کی تمہیں جنم جنم سے چاہ تھی۔تم نے اسے محبت سے محل کے اندر بلایا، حسب آرزو چکنی چپڑی باتیں کیں، اسے روئی کے گدیلے پر بٹھانا چاہا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ فقیر ہے اور اس کے من میں ان چیزوں کی چاہت نہیں۔اس نے یہ بھی کہا کہ وہ تو پہلے اس طرح کی ایک پھندی سے بڑی مشکل سے مکت ہوا ہے اور اب دوبارہ کسی ایسی چال میں نہ آئے گا۔تم نے اس کے ترت جواب کی پروا نہ کی اور اس کا دامن ہیرے جواہرات سے بھر دیا اور اسے پھر آنے کا کہتی رہی۔وہ ساون کی گھٹا کی طرح آیا اور آناً فاناً تمہارے دل کی پیاسی زمین پر اپنے دیدار کا مینہہ برسا کر اسی طرح لوٹ گیا۔تم نے جاگ کر بے چینی اور کسلمندی سے وہ رات بسر کی۔صبح ہوئی تو تمہاری نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں کہ دن کے پہلے پہر اسی فقیر نے پھر دستک دی۔تم نے باندیوں کا انتظار کئے بغیر لپک کر دروازہ کھولا۔فقیر نے کہا کہ اپنے ہیرے جواہر واپس لے لو، یہ ہم فقیروں کے کام کے نہیں اور یہ کہ اس کے گرو نے صرف بھوجن کی فرمائش کی ہے۔تم نے بڑی تانگ سے فقیر کیلئے کھانا پکایا۔اور اسے ایک بار پھر اپنے پاس رہنے کیلئے کہا مگر وہ نہیں مانا۔تب اس سے مایوس ہو کر تم نے خود گرو گورکھ ناتھ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس سے اس کے چیلے کو مانگنے کا سوچا۔تم نے طرح طرح خوان پکوائے اور سواری لے کر گرو کی طرف چل پڑی۔گرو کے پاس پہنچ کر تم نے خوان دان کئے، پرنام کیا۔اس دوران ناتھ کے سوا لاکھ چیلے جوق در جوق تمہارے دیدار کو امڈ آئے۔تم نے رخ سے نقاب سرکایا تو تمام چیلوں کو جھرجھری آ گئی اور وہ تمام کے تمام اپنے گیان بھول گئے۔ایک گرو اور ایک پورن ہی تھے جو ثابت قدم رہے اور باقی تمام کا تمام ڈیرہ تمہیں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا جیسے یوسف کو دیکھ کر مصر کی عورتوں نے اپنے ہاتھوں پر چھریاں چلالی تھیں۔گرو نے تمہاری خدمت سے نہال ہو کر کہا کہ مانگو تم کیا مانگتی ہو۔تمہارے پاس کسی شے کی کمی نہیں تھی اور یہ موقع بھی تھا کہ تم نے گرو سے پورن کو مانگ لیا۔پورن گرو کا لاڈلا چیلا اور تمام سادھوؤں کا مہنت تھا اور وہ دل سے اسے دور نہ کرنا چاہتا تھا مگر تم سے وعدہ کر چکا تھا اس لئے مرے ہوئے دل کے ساتھ اس نے پورن کو تمہارے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔پورن اگرچہ تمہارے ساتھ نہ جانا چاہتا تھا مگر گرو کے حکم کے آگے بے بس تھا۔جب تم پورن کو ساتھ لے کر چلیں تو تمہاری آنکھوں کی چمک اور تمہارے دل کی حالت دیدنی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے کوئی بادشاہ ملک فتح کر کے آیا ہو۔تمہارے محل میں پہنچ کر بھی پورن کی بیکلی نہ گئی۔وہ بہانے بہانے سے تم سے دور ہٹنے کی کوشش کرتا۔پھر اس نے اکیلے باغ کی سیر کی خواہش ظاہر کی اور تم نے اس کی تمنا کے مطابق اسے سیر کیلئے کچھ باندیوں کی معیت میں بھیج دیا۔ویسے ہی جیسے سسی، پنوں سے کچھ لمحوں کیلئے غافل ہو کر نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔پورن نے بھی نہ واپس آنا تھا اور نہ آیا۔

باقی صفحہ ۸۴ پر ملاحظہ فرمائیے

# سیاہ گلاب

نجیب عمر
(کراچی)

وہ اسکول کا زمانہ تھا۔میں اپنے دوست علیم کے گھر اکثر جایا کرتا تھااور اسکے چھوٹے سے باغ سے خوب لطف اندوز ہوتا۔اس کے والد کو باغبانی کا شوق تھا۔انہوں نے انواع اقسام کے نایاب پودے اور پھول اکٹھے کیے تھے۔ میں نے ڈلھیا کا پھول سب سے پہلے اسی باغ میں دیکھا، یہ بڑا سا گیند نما پھول اگرچہ خوشبو سے عاری ہوتا ہے لیکن باریک پنکھڑیوں سے گتھا دلفریب رنگ میں خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔

میں اکثر گلاب کے پودے کے گرد منڈلایا کرتا تھا۔ایک روز میں چونکا جب میں نے مختلف رنگوں کے گلاب کے درمیان دو سیاہ گلاب دیکھے۔اس پر نظر پڑتے ہی جیسے میں مسحور ہو گیا۔میرے لیے اس پر سے نظر اٹھانا مشکل تھا۔علیم نے کہا اسے جو پہلی دفعہ دیکھتا ہے اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔والد صاحب نے بڑی جدوجہد کے بعد یہ حاصل کیا ہے۔ہمارے یہاں یہ عام نہیں کہیں باہر سے منگوایا ہے اور کہا جاتا ہے کہ قیمتی بھی ہے۔

چند دنوں بعد میں پھر علیم کے باغ میں تھا لیکن سیاہ گلاب ندارد۔ میں نے فوراً اس سے دریافت کیا کہ کہیں اور اٹھا رکھا ہے؟ اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔اس گملے کا پودا اسی سیاہ گلاب کا ہے لیکن اب گلاب نہیں۔میں نے بے ساختہ پوچھا کہ کہاں گیا؟ کہنے لگا دو روز قبل میرے ماموں آئے تھے اور ہم نے شوق سے انہیں بھی یہ پھول دکھائے۔تھوڑی دیر تک دیکھتے رہے اور اچانک دونوں گلاب انہوں نے مروڑ کر توڑ دیے اور کہنے لگے عظیم بھائی کا جواب نہیں کچھ بھی اٹھا کر گھر لے آتے ہیں۔یہ انتہائی نحس ہوتا ہے اسے گھر میں نہیں رکھنا چاہیے۔سارا گھر اس گلاب کے لیے اداس ہے لیکن ماموں جان کے آگے دم مارنے کی گنجائش نہیں۔حتیٰ کہ والد بھی انہوں نے اگرچہ ناراضگی کا اظہار کیا تاہم چپکے رہے اور کہنے لگے پودا تو ہے پھول دہ بارہ کھِل جائیں گے۔

حسبِ معمول چند روز بعد میں پھر علیم کے گھر تھا اور سیاہ گلاب کا ماتم کسی حد تک جاری تھا کہ علیم کی چھوٹی بہن میرے پاس آئی اور کہا جمال بھائی آپ کے لیے ایک گفٹ ہے میں نے کہا دکھاؤ۔اس نے ہاتھ سامنے کر دیا جس میں ایک سیاہ گلاب تھا۔میں نے پوچھا یہ کہاں سے آیا؟ اس نے کہا یہ کپڑے کا بنا ہوا ہے لیکن اصل کے مانند۔ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کو ان گلابوں کے ضائع ہونے کا بڑا دکھ ہے۔اس لیے ہم نے آپ کے لیے بنایا ہے۔واقعی وہ بہت خوبصورت تھا۔ہاتھ لگانے کے بعد ہی پتا چلتا کہ کپڑے کا ہے۔میں نے علیم سے کہا تمہارے ماموں اسے نحس کہتے ہیں۔میں اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں گا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ نحس نہیں ہے قدرت کا حسین عطیہ ہے۔

میڈیکل کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں اپنی پریکٹس شروع کر چکا تھا اور انسانی جلد پر تحقیق اور تخصیصی ڈگری لینے انگلینڈ جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ مجھے اقوامِ متحدہ کے ایک مشن کے ہمراہ تنزانیہ جانے کا موقع ملا اس طرح بیرونِ ملک کے دورے سے پیسہ پس انداز کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے صرف کرنا چاہتا تھا۔

تنزانیہ کے شمال مغرب میں برونڈی کے قریب ایک گاؤں میں ہمارا کیمپ تھا اور اس گاؤں کی حالت افریقہ کے دوسرے گاؤں سے مختلف نہیں تھی۔غربت اور افلاس، خوراک کی قلت اور حفظانِ صحت کی عدم دستیابی نے وہاں کے مکینوں کو مختلف قسم کے امراض میں مبتلا کر دیا تھا۔صبح سے شام تک ہم مریضوں کا معائنہ کرتے۔چار ڈاکٹر ہمہ وقت مصروف رہتے۔مریضوں کو دوا کے ساتھ خوراک بھی دی جاتی جس کی انہیں دوا سے زیادہ ضرورت تھی۔ہم نے انسانوں کی بے بسی اور بے چارگی کا یہ روپ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ہمیں ان سے ہمدردی تھی۔ہم انکے صحت کے مسائل حل کرنا چاہتے تھے لیکن ہمارے وسائل محدود تھے اور ہم دل مسوس کر رہ جاتے۔

ایک روز ایک نوجوان لڑکی دو بچوں کے ہمراہ آئی۔پوچھنے پر بتایا اس کے بھائی بہن ہیں۔ایک کو کالی کھانسی اور دوسرا جلد کی بیماری میں مبتلا تھا۔انہیں چیک کر کے دوا دینے کے بعد لڑکی سے پوچھا تمہیں کیا تکلیف ہے۔بڑی مشکل سے اس نے مترجم کے وسیلے سے بتایا کہ اسے کوئی بیماری نہیں وہ صحت مند ہے۔یہ جان کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔اب جو میں نے اسے غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اسکی کالی رنگت میں ایک عجیب سی جاذبیت تھی اس کا جسم سڈول اور نسوانی کشش سے مالا مال تھا۔اس کی آنکھیں روشن، ہونٹ متناسب، ناک زیادہ موٹے نہیں۔بلا شبہ اپنی کالی رنگت کے باوجود وہ کافی حسین تھی۔اس کا نام بومیانہ تھا۔

کیمپ میں اس کے داخل ہوتے ہی نگاہیں اسکی طرف اٹھنا شروع ہو جاتیں اور وہ سبھوں سے بے نیاز اپنی باری کا انتظار کرتی رہتی۔میرے علاج سے اس کی بہن کی کالی کھانسی میں افاقہ تھا اور اس کا بھائی بھی جلد کی بیماری سے رو بہ صحت تھا۔اب وہ کیمپ کے کسی اور ڈاکٹر کی بجائے میرا انتظا کرتی۔مجھ سے دوا اور خوراک لے جاتی۔مجھے اس سے ہمدردی تھی لہٰذا زیادہ سے زیادہ اس کی اعانت کرتا۔ایک روز مترجم کی معرفت مجھے کوئی پیغام دینا چاہا لیکن مترجم نے اسے جھڑک دیا۔انکی باتیں اگرچہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات مجھے کچھ بتا رہے تھے میں نے مترجم سے پوچھ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔اس نے بتایا کہ اس کے گاؤں کے کچھ آوارہ لڑکے اسے تنگ کرتے ہیں اور اس کی آبرو کے درپے ہیں۔وہ ایک کمزور اور بے اختیار لڑکی کس طرح

اپنی حفاظت کرسکتی اور یہ یہاں آئے دن کا معمول ہے۔ میں نے کہا وہ کیمپ کے باہر میرا انتظار کرے۔ اسپتال بند ہونے کے بعد اس سے تفصیلی معلومات حاصل کروں گا اور اس کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے مقامی لوگوں سے اس لڑکی کے بابت دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ انتہائی خوددار اور پاک دامن لڑکی ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی شخصیت کی جاذبیت میں اس کی پاک دامنی کو دخل ہے۔ بہر حال میں گاؤں جا کر ان لڑکوں سے اگر اسکی حفاظت کرنا چاہوں بھی تو نہیں کرسکتا۔ میں اگر چہ صرف انسانیت کی بنیاد پر اس سے ہمدردی رکھتا تھا۔لیکن لوگ اسے اپنے مطلب کے معنی پہنانے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ لہذا میں نے کچھ مقامی لوگوں کو اس کی حفاظت پر مامور کردیا۔

تقریباً دو ہفتے کے دوران میں بومیانہ کئی مرتبہ اپنے بھائی اور بہن کے لیے دوا لینے آتی رہی۔ میں ہمیشہ اس کی خیریت دریافت کرتا۔ وہ جواباً اپنی خیریت سے آگاہ کرتی لیکن اس کے لہجے کی یاسیت مجھ سے چھپی نہیں رہتی۔

ایک صبح مجھے یہ دل خراش خبر ملی کہ بومیانہ کی حالت بہت خراب ہے۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے کہ چند اوباش اسے اوئل، شب گھر سے اٹھا کر لے گئے، ساری رات اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے اور جانکنی کی حالت میں اسے چھوڑ کر فرار ہوگئے۔ اسے کسی طرح گھر لایا گیا۔ میں بے اختیار وہاں پہنچا۔

اس کی حالت نہایت غیر تھی۔ جسم پر جگہ جگہ زخم کے نشان۔ میرے ذہن میں ایک ہی بات سمائی تھی کہ بومیانہ کو بچانا ہے۔ میں اس کے زخموں کی مرہم پٹی کے ساتھ اس سے بات بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی کچھ بولنا چاہتی تھی۔ مترجم نے بتایا کہ وہ میری مشکور ہے کہ میں نے ہر طرح سے اس کی مدد کی۔ وہ دل سے میرا احترام کرتی ہے لیکن میرے مامور کردہ محافظوں میں سے ایک نے اس کا سودا کرلیا اور اسے چار حیوانوں کے حوالے کردیا۔ اس کے انکار پر وہ تشدد پر اتر آئے۔

میں نے اسے تسلی دی کہ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں میں تمہارا علاج کروں گا اور تم جلد صحت یاب ہو جاؤ گی۔ اس پر پھر غشی کا دورہ پڑا۔ ہم دو ڈاکٹر مسلسل اس کی تیمارداری میں لگے رہے۔ اسے ہوش آتے ہی ڈرپ لگا دیا گیا تا کہ اس کی قوتِ مدافعت میں اضافہ ہو۔ اس چھوٹے سے غیر مستقل اسپتال میں اس سے زیادہ سہولت دستیاب نہیں تھی۔

میں اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ بومیانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زبان کی اجنبیت بھی ایک رکاوٹ ہوتی ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ کسی مترجم کے نہ ہونے کی بنا پر میں اس کے ہاتھ کو ہی تھپکتا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں سمجھا اسے نیند آرہی ہے۔ لیکن مجھے جلد احساس ہوگیا کہ اس کی سانس معدوم ہو رہی ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کا بے جان ہاتھ میرے ہاتھ سے گر گیا۔

میری کیفیت کچھ ایسی تھی کہ میں دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا سارے لوگ بومیانہ کے لیے سوگوار تھے اور اس مظلوم سے ہمدردی رکھتے تھے۔

جب جنازہ اٹھا میں جنازے کے ساتھ ساتھ تھا۔ اسے قریبی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ میرے کیمپ کے ساتھی میری کیفیت کو کچھ کچھ سمجھتے تھے۔ تدفین کے بعد جب اس کی قبر تیار ہوگئی۔ اس کے سرہانے نشانی کی لیے ایک پودا لگا دیا گیا۔

قبر سے سارے لوگ چلے گئے تو میں نے اپنی جیب سے کپڑے کا بنا ہوا سیاہ گلاب جو برسوں سے میرے پاس تھا، سفر اور حضر میں اسے ساتھ رکھتا تھا۔ اس کی تربت پر رکھ دیا۔ یہ مصنوعی پھول میرے نزدیک گلِ سرسبد تھا۔ پھر غمناک آنکھوں کے ساتھ کیمپ لوٹ آیا۔

بومیانہ بلا شبہ تنزانیہ کا سیاہ گلاب تھی جسے چند ہوس پسندوں نے مسل کر رکھ دیا۔

بقیہ

## سندراں مائی ڈیئر

باندیوں نے بتایا کہ وہ ان سے زبردستی ہاتھ چھڑا کر گرو کی طرف بھاگ گیا ہے۔

ذرا نہ طاقت رہی تن میں
گائے سندراں غم کے گیت لوگو
میں تو بھولی پہ تم نہیں بھولنا جی
کر کے جوگیوں سنگ پریت لوگوں
جنگل گئے نہ واپس آئے سندراں کو
جوگی ہوئے ہیں کس کے میت لوگو
قادر یار پیچھا کھڑی دیکھتی تھی
اچھا وقت بھی گیا ہے بیت لوگوں

مجھے وہ وقت یاد ہے جب تم نے رنگ محل چڑھ کر پورن کا سوگ منایا۔ بال نوچے، سینے میں دو ہتھڑ ماری اور ہائے کلاپ کیا۔ تم فرطِ غم سے بے ہوش ہو کر گری اور پھر کبھی نہ اٹھی۔ پھر تمہاری ناک سے لہو کی ایک لکیر نمودار ہوئی اور میرے دل تک کھنچ گئی۔ تمہیں کیا خبر تھی سندراں کہ پورن تو لونا کو بھی بیچ بہار تڑپتا چھوڑ آیا تھا۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا تو تم کبھی اس سے محبت نہ کرتی۔ تمہارے ساتھ تو میرے شاعروں اور قصہ خوانوں نے بھی انصاف نہیں کیا۔ ہمیشہ ہی تمہاری محبت کو پورن کی بھگتی اور لونا کے ادھرم میں لپیٹ کر پیش کرتے رہے۔ میں کیا کروں، مائی ڈیئر سندراں میں کیا کروں!

☆

# خبر ہونے تک

خورشید حیات
(بیلاس پور،بھارت)

میں نے جب کبھی حقیقت کا سامنا کرنا چاہا ہے تو خود کو اپاہج محسوس کیا ہے۔انسان، کتنا بے بس ہے، وقت کے ہاتھوں کا کھلونا، اس پر یہ تیور کہ میں انقلاب لاسکتا ہوں۔زندگی تیز رفتار سے چلتی رہتی ہے اور انسان خواب اور حقیقت کے دوراہے سے گذرتا رہتا ہے۔کبھی اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہر خواب ایک حقیقت ہے اور کبھی لگتا ہے کہ حقیقت ایک خواب ہے۔یہ گتھی بھی عجیب ہے۔کیا کہیں،ہم زندگی کو؟

زندگی کو فرصت نہیں اپنے کاروبار سے کبھی زندگی آگے تو کبھی ہم پیچھے، کبھی ہم آگے تو زندگی پیچھے، بھیڑ چلی جارہی ہے تیز دھوپ میں، بارش میں، منزل کا پتہ نہیں۔ہم بھیڑ کو روک کیوں نہیں دیتے؟

میں= ہم،اور ہم= ہم سب۔

ہم ہم نہیں رہے۔زندگی کی کڑوی سچائیوں کو پانی کی طرح پی رہے ہیں اور جی رہے ہیں ایک اپاہج کی طرح۔شہروں نے دیہاتوں میں بسنے والی آبادی کی خوشیاں چھین لی، انکے حصے کی روشنی چھین لی۔دیہاتوں میں اب کیا رہ گیا۔ہمارے قدم اب گاؤں کی طرف نہیں بڑھتے۔دادا کی حویلی سنسان ہوتی جا رہی ہے اور پیپل کا پیڑ خاموش ہے۔

لوگوں کا ہجوم گاؤں سے شہر کی طرف بھاگا جارہا ہے سکون کی تلاش میں، مگر شہر نے انہیں کیا دیا۔ٹاٹ میں لپٹی زندہ لاشیں، کوڑے کے ڈھیر میں اپنا مستقبل تلاش کرتے معصوم بچے اور بھی بہت کچھ!

ہم سب زندہ لاشیں ہیں جن کے ہاتھ میں قلم ہے وہ بھی، کیوں کہ انکے قلم سے نکلنے والے لفظ اپنا معنی کھوتے جارہے ہیں اور ہمارا احساس مردہ ہو چکا ہے۔

ابھی میں یہ سب غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک نظروں کے سامنے سے کئی تصویریں گذرنے لگیں۔

ایک انسان کے دو ہاتھ غائب تھے

ایک انسان کوڑھی تھا بالکل گلا ہوا۔چلنے پھرنے سے مجبور۔

ایک انسان کی ٹانگیں نہیں تھیں اور وہ ٹرالی چلانے والے کے ذریعہ لے جایا جارہا تھا۔

ایک کا چہرہ مسخ تھا۔

اور ایک کی آنکھیں نہیں تھیں۔۔۔۔

یہ اپاہجوں کی ٹولی بس ایک سمت میں رواں تھی اور میری آنکھیں ان کا محاصرہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔دماغ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب قدرت کے خواب کی تعبیریں ہیں۔

خواب جھوٹا۔تعبیر حقیقی!

قدرت کہانی گھڑ رہی تھی فطرت کہانی سن رہی تھی۔انسان اس کی کہانی میں مختلف رول ادا کررہا تھا۔کبھی بیمار اور کبھی مسیحا۔خود ہی درد بھی ہے،خود ہی درد کا مداوا بھی۔

خوف اور سراسیمگی کی فضا چھاتی جارہی تھی۔تاریکیاں بڑھ رہی تھیں۔مگر انسان کی کاوشیں بھی اپنی جگہ قائم تھیں۔پنڈال پر لکھا ہوا ''اپاہجوں کا بین الاقوامی سال'' بین الاقوامی سطح پر اپاہجوں کے مسائل کا حل پیش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسی دم بیک وقت کئی آوازیں کانوں کو سنائی دینے لگیں۔

مجھے ہاتھ دو۔۔۔۔

میرا کوڑھ دور کرو۔۔۔۔

میرا چہرہ مجھے واپس لا دو۔۔۔۔

مجھ کو آنکھیں دو۔۔۔۔

آواز تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔پورا پنڈال گونج رہا تھا،اور میں محسوس کررہا تھا کہ میرا دماغ ماؤف ہورہا ہے۔ذہن میں کوئی حل نہیں باقی رہ گیا تھا۔عالم بے چارگی میں۔میں نے مائک پر آکر اعلان کیا، ہمارے بادشاہ نے اپاہجوں کے لئے کمبل کا انتظام کیا ہے۔

ابھی میرا اعلان مکمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ بھیڑ میں سے ایک شخص اٹھا اور چیخ چیخ کر گانے اور ناچنے لگا۔وہ پاگل تھا اور اسے دماغ کی ضرورت تھی۔میں وہ دماغ اسے کہاں سے دیتا۔جس دماغ سے وہ سردی اور گرمی کا احساس کرپاتا۔ اس کے لئے کمبل لایعنی تھے۔

اس وقت مجھے محسوس ہورہا تھا کہ انسان، انسان کہاں رہ گیا ہے۔وہ تو اپاہج ہو چکا ہے۔اس کے ہاتھ ٹوٹ چکے ہیں اس کی ٹانگیں کٹی ہوئی ہیں۔اس کا چہرہ مسخ ہے۔آنکھیں بے نور ہیں اور دماغ۔۔۔دماغ مفلوج۔۔۔احساس سے پرے۔۔۔خیالات سے ماورا!

# ''روودادِ حسرت''

## رب نواز مائل

(کوئٹہ)

کتھائیں بھولتی کب ہیں محبت کی
کہ جب اُن سے ہو کچھ رُوداد حسرت کی
کہ جیسے بات تب پُر شور ہوتی ہے
جو سر تا سر ہو گویا وہ کہ نکہت کی
خیالِ یار سے بڑھ کر ہو کیا دُنیا؟
کہ جیسے اُس سے ہی ہو دید جنّت کی
کہ لُٹتا کیوں نہ ہو ممکن یہ ہر ساعت
کہ جب کوشش بھی زوروں پر ہو چاہت کی
کہ مرنا کب کسے آئے غمی میں بھی
کہ جب تک وہ بھی ہو گویا نہ شوکت کی

○

## نعیم الدین نظر

(میر پور خاص)

اے یارِ غار آ جا
ہے انتظار آ جا
پھولوں پہ ہے اُداسی
اے مشک بار آ جا
صدموں میں گھر گیا ہوں
اے غم گسار آ جا
چھایا خزاں کا موسم
جانِ بہار آ جا
عزت مری بڑھانے
اے ذی وقار آ جا
اب تو یقین کر لے
تجھ سے ہے پیار آ جا
کیوں ہو خفا نظر سے
ہے شرم سار آ جا

○

## اخلاق عاطف

(سرگودھا)

حریمِ حنا کی اقامت امر کر گئی ہے مجھے
کوئی خوب صورت معیّت امر کر گئی ہے مجھے
بھرا ہے مرے کاسۂ دید کو یوں کسی شوخ نے
کہ اُس کی مطہّر سخاوت امر کر گئی ہے مجھے
گلابوں نے سُرخی کی خیرات مانگی ہے جن سے سدا
انہیں چومنے کی جسارت امر کر گئی ہے مجھے
مری سوچ پر پھول کھلتے ہیں، اُن گیسوؤں کے لیے
کہ جن کہ مہکتی طراوت امر کر گئی ہے مجھے
صباحت کی مصنوعیت کا ڈسا، مرنے والا تھا میں
مگر کوئی سچی ملاحت امر کر گئی ہے مجھے
میں تنہا ٹھٹھرتا ہوا تھا رواں، وقت کے گال پر
کوئی جادوانہ حرارت امر کر گئی ہے مجھے
ستارا صفت کر گئے ہیں مجھے جستجو زاویے
کہ عاطف چمکنے کی حسرت، امر کر گئی ہے مجھے

○

## پرواز انبالوی

(بھارت)

پلکیں تو مری کب سے اُٹھیں گردِ سفر سے
منزل کی جھلک مٹ نہ سکی پھر بھی نظر سے

دو دن کے لئے اور ترے شہر میں ہم ہیں
اتنا نہ ہمیں دیکھ محبت کی نظر سے

ہر جھونکے میں ہے جانی سی پہچانی سی خوشبو
شاید یہ ہوا آئی ہے اپنے ہی نگر سے

ستانے دے کچھ دیر ابھی اے غمِ ہستی
میں لوٹ کے آیا ہوں بہت لمبے سفر سے

یوں ٹوٹی ہے اُمیّد کہ جیسے کوئی راہی
رک جائے سرِ شام کہیں رات کے ڈر سے

کیسے تری پہچان میں آؤں گا مرے دوست
تُو نے مجھے دیکھا ہی نہیں اپنی نظر سے

پرواز ! محبت میری نس نس میں بسی ہے
یہ مٹ نہ سکے گی کبھی کردارِ بشر سے

## رومانہ رومی

(کراچی)

چاندنی چٹکی مرے گھر، رات کے پچھلے پہر
جاگ اُٹھے دیوار اور در، رات کے پچھلے پہر

جب بھی وعدہ آخرِ شب آنے کا کرتے ہو تم
نیند کو لگ جاتے ہیں پر، رات کے پچھلے پہر

باقی جب رہتی نہیں اُمید کی ، کوئی کرن
جھکتا ہے سر ترے در پر، رات کے پچھلے پہر

اوس کی مانند اکثر دیکھتی ہوں میری آنکھ
خود بخود ہو جاتی ہے تر، رات کے پچھلے پہر

جب تری یادوں کی پروازوں کے گھیرے ہے مجھے
پھڑ پھڑائے بازو و پر، رات کے پچھلے پہر

جب تصور سے کبھی باہر وہ آتا ہی نہیں
نور ہو جاتا ہے کیوں گھر، رات کے پچھلے پہر

سنتی آتی ہوں، مگر میں نے کبھی دیکھا نہیں
جاگتے ہیں سیکڑوں شر، رات کے پچھلے پہر

رات اندھیری تھی تو کیا جلنے لگا تھا خود بخود
اِک چراغ سجدۂ سر، رات کے پچھلے پہر

خالقِ ارض و سما کا جب خیال آیا مجھے
تھی سرِ بستر ثناگر، رات کے پچھلے پہر

جب تصور میں مرے ہوتا ہے وہ جانِ بہار
رومی ! آخر کیوں لگے ڈر، رات کے پچھلے پہر

## شگفتہ نازلی

(لاہور)

عجیب رات تھی، تارے مرے سرہانے رہے
کوئی تو بات تھی، تارے میرے سرہانے رہے،

یہ جانتے تھے کہ پھیلی ہوئی ہے تاریکی
وہ کیسی گھات تھی، تارے مرے سرہانے رہے،

ہمیشہ سے وہ رہے دوست اور مرے ہمدم
عدو کو مات تھی، تارے مرے سرہانے رہے،

وہ رات کٹتی رہی سوچوں، صرف سوچوں میں
نئی سی بات تھی، تارے مرے سرہانے رہے،

اندھیری رات میں لگتا تھا جُوں دریچہ کھلا
انوکھی جہات تھی، تارے مرے سرہانے رہے،

گزشتہ خواب میں سارے جہاں کی سیر ہوئی
یہ کیا سوغات تھی، تارے مرے سرہانے رہے!

○

## احمد ظہور

(اسلام آباد)

آشنا نغموں سے ہوتا ہے ربابِ زندگی
باب غم بھی ہو اگر جزوِ کتابِ زندگی

غم سے تصویرِ مجسم ہے سرابِ زندگی
آتشِ غم سے ہے روشن آفتابِ زندگی

سازِ غم کی لے پہ ہو رقصاں تو پاتا ہے دوام
موت کے بحرِ تلاطم پر حبابِ زندگی

موت تو بس اک وصیلہ ہے وصالِ ذات کا
زندگی سے جو اُٹھاتی ہے نقابِ زندگی

صحن کی مٹی سے ذکرِ گلستاں بھی گر نہ ہو
پھر کھلیں گے کیسے آنگن میں گلابِ زندگی

جو سمندر تھیں کبھی آنکھیں وہ صحرا ہو گئیں
اب کہاں ٹپکے گا ان آنکھوں سے آبِ زندگی

کشتِ دل بھی اب تو ہے بنجر زمینوں کی طرح
کب نجانے آ کے برسے گا سحابِ زندگی

بعد مرنے کے بھلا دینا ہے کیا ہم کو حساب
زندگی بھر تو دیا ہم نے حسابِ زندگی

کتنی تحریریں ادھوری رہ گئیں زیرِ قلم
بند ہونے کو ظہور اب تو ہے بابِ زندگی

کیا لکھوں کیسے لکھوں کیونکر لکھوں میرے ظہور
وقت نے تو سب بدل ڈالا نصابِ زندگی

## صابر عظیم آبادی

(کراچی)

مسافر کوئی راہ بھٹکا ہے کیا
اجالے کے پیچھے اندھیرا ہے کیا

زمانے کو تم یاد کرتے ہو کیوں
زمانہ تمہیں یاد کرتا ہے کیا

اجالا ہے پھیلا ہُوا بام تک
کوئی عکس آنگن میں اترا ہے کیا

فضا عطر آگیں ہوا مشکبو
اسی راستے سے وہ گزرا ہے کیا

جو جاتے ہوئے گھورتا ہے مجھے
وہ رشتے میں کچھ میرا لگتا ہے کیا

مژہ کے سلگتے ہوئے چرخ سے
ستارہ کوئی رات ٹوٹا ہے کیا

خطا پر خطا جس سے ہوتی رہی
وہ خود کو فرشتہ سمجھتا ہے کیا

میں پھر سے سنبھلنے کے قابل نہیں
کسی نے مجھے مار ڈالا ہے کیا

گیا ہے جو صابر تمہیں چھوڑ کر
یہ نقشِ کفِ پا اُسی کا ہے کیا

## نوید سروش

(میر پور خاص)

اور تو کچھ نہیں ہاں پاسِ وفا جاتا ہے
آپ کا کیا ہے کوئی شخص مرا جاتا ہے

اک صدا، عکس و خیالات کی آہٹ سُن کر
ایک دیوانہ اُسی سمت بڑھا جاتا ہے

یہ حقیقت ہے کہ جب مل کے بچھڑتا ہے کوئی
مری پلکوں پہ چراغوں کو جلا جاتا ہے

کیوں نہ اُس شخص کی عظمت کو کریں لوگ سلام
جو رہِ حق میں سرِ دار چلا جاتا ہے

راز یہ بادِ صبا سے کبھی پوچھیں گے سروش
اک دیا کون سرِ راہ جلا جاتا ہے

○

## عزیزنبیل

(دوحہ،قطر)

معجزے کا در کھلا اور اک عصا روشن ہوا
دور گہرے پانیوں میں راستہ روشن ہوا

جانے کتنے سورجوں کا فیض حاصل ہے اُسے
اُس مکمّل روشنی سے جو ملا روشن ہوا

آنکھ والوں نے چرالی روشنی ساری تو پھر
ایک اندھے کی ہتھیلی پر دیا روشن ہوا

ایک وحشت دائرہ در دائرہ پھرتی رہی
ایک صحرا سلسلہ در سلسلہ روشن ہوا

مستقل اک بے یقینی، اک مسلسل انتظار
پھر اچانک ایک چہرہ جابجا روشن ہوا

آج پھر جلنے لگے بیتے ہوئے کچھ خاص پل
آج پھر اک یاد کا آتش کدہ روشن ہوا

جانے کس عالم میں لکھّی یہ غزل تم نے نبیلؔ
خامشی بجھنے لگی، شہرِ صدا روشن ہوا

## ندیم ہاشمی

(کراچی)

اپنے خوابوں کی زندگی ہے ابھی
دیکھ سپنوں سے دوستی ہے ابھی

اپنے ہونے کا ہے بیاں زندہ
اپنے رشتوں کی بندگی ہے ابھی

خوشبوؤں کا وقار ہے قائل
پھول تیری بھی آگہی ہے ابھی

اُس نے سیکھا نہیں چلن کوئی
اُس کے لہجے میں سادگی ہے ابھی

کیسے ظلمت فریب دے گی ہمیں
جب ستاروں کی روشنی ہے ابھی

کتنی بے بس ہیں زیست کی راہیں
کتنا مجبور آدمی ہے ابھی

جس طرف جائیں اب تو لگتا ہے
خوف کی بھیڑ سی لگی ہے ابھی

## زاہدہ عابد حناؔ

(اسلام آباد)

چلے نہ دو ہی گام بھی
کہ ہو گئی ہے شام بھی

جو مسکرائے دو گھڑی
چکا رہے ہیں دام بھی

غرور کر نہ خود پہ تُو
یہ پختگی ہے خام بھی

بتوں کے ناز چھوڑ دے
تُو لے خدا کا نام بھی

گرا کے دل پہ بجلیاں
پلا رہے ہیں جام بھی

بجا کے سامنے ہیں وہ
ذرا جگر کو تھام بھی

وہ دلربا سی یاد کیا!
بھلا دیا ہے نام بھی

وفا ہو یا جفا حناؔ!
کسی کو ہے دوام بھی؟

○

# ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط......۱۰

## میرے لکھنے کی ابتدا

میں نے گزشتہ اقساط میں عرض کیا ہے کہ نہ صرف ہمارے گھر کا بلکہ ہمارے پورے خاندان ہی کا ماحول شعروادب اور موسیقی سے وابستہ تھا۔ مجھے بچپن ہی میں اردو کے تمام مشاہیر کے نام اور بڑی حدتک انکے کام سے واقفیت ہوگئی تھی۔ میرے بڑے بھائی کم عمری سے شاعری کرتے تھے، خاندان میں بھی کئی بزرگ شاعر تھے مگر نثر پر سوائے میری ایک دور کی رشتہ دار رضیہ فصیح احمد کے، کسی نے طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ بہر حال جب کبھی ہمارے یہاں رات کو وقت گذاری کے لئے کوئی مشہور ناول پڑھا جاتا تھا تو میں اس بات کے خواب دیکھتا تھا کہ کبھی میں بھی اسی طرح لکھوں گا اور میری کتابیں بھی گھر گھر پڑھی جائینگی۔ اس وقت میں شوکت تھانوی، ایم اسلم، قیسی رامپوری اور رشید اختر ندوی سے بہت متاثر تھا۔ اگرچہ گھر میں تاریخی ناول بھی پڑھے جاتے تھے مگر مجھے ان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا اور میں نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا کہ ایک روز میرے دوست اشفاق نے مجھے اپنا ایک مضمون ''حب الوطنی'' دکھایا جو وہ اخبار انجام میں بھیجنا چاہتا تھا۔ محمد عثمان آزاد کی ادارت میں انجام اس وقت پاکستان کا سب سے زیادہ باوقار اور ہر دلعزیز اخبار تھا۔ اسکا یہ مضمون اخبار میں شائع بھی ہوگیا۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا اور میں نے سوچا کہ اب مجھے بھی لکھنا چاہئے۔ میں نے چند ہی روز میں ایک کہانی لکھ کر امروز کے بچوں کے صفحے کے لئے روانہ کی جو فوراً شائع ہوگئی۔ اس وقت میں ساتویں جماعت میں تھا۔ اس کے بعد کئی کہانیاں مختلف اخباروں کے بچوں کے صفحے پر شائع ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ میں خود کو اتنا بڑا ادیب سمجھنے لگا کہ اگلے ہی سال جب میں آٹھویں جماعت میں آیا ہی تھا میں نے ایک ناول ''ان دیکھے راستے'' لکھا۔ یہ انتہائی ناپختہ، بڑی حد تک حماقت آمیز اور بچگانہ سی چیز تھا اور اپنی کم عمری کے باوجود عشق ومحبت سے بھرپور تھا۔ سب نے پڑھ کر میرا خوب مذاق اڑایا پھر بھی میں اسکو میرپور خاص کے واحد کتاب گھر، جو کبھی کبھی چھوٹی موٹی کتابیں شائع کردیا کرتا تھا لے کر گیا۔ انہوں نے اسے یہ کہہ کر رکھ لیا کہ ہم دیکھیں گے۔ دو دن بعد انہوں نے کہا کہ اچھا لکھتے ہو مگر ابھی کچھ اور دن صرف اچھا ادب پڑھو اور لکھنے کی مشق کرتے رہو۔ میرا تو دل ٹوٹ گیا اس پر میری کلاس کے ایک لڑکے حبیب نے، جو کتابت کرتا تھا اور سیاہ رنگ کی روشنائی سے بالکل ایسا لکھتا تھا جیسے چھپی ہوئی کتاب ہو، محبت اور خلوص کے مارے میرے ناول کو کئی دنوں میں نہایت مشقت سے لکھ کر اور باقاعدہ جلد بندی کر کے مجھے تحفے میں دیا۔ میں تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا بس ایسا ہی لگتا تھا کہ کوئی سچ مچ میں چھپا ہوا ناول۔ میں نے اسے کئی لوگوں کو دکھایا۔ مگر جن چیزوں کا لڑکوں نے بہت مزاق اڑایا اور اسمیں میرا دوست اشفاق بھی شامل تھا (کہ اگرچہ میرے لئے اسکا خلوص اور محبت اپنی جگہ تھا مگر اسکی حس مزاح بڑی بیدار تھی) وہ یہ تھا کہ اول تو اس ناول کا عنوان جو ''ان دیکھے راستے'' تھا لڑکے اسے مجھے چڑھانے کے لئے ''اندھے کے راستے'' پڑھتے تھے۔ پھر وہ پاکستان کے شمالی علاقوں کے پس منظر میں لکھا گیا تھا (کیونکہ اس دور کے زیادہ تر رومانی ناول جو میں نے پڑھے تھے نینی تال وغیرہ کے پہاڑی پس منظر ہی میں تھے) جبکہ میں نے اسوقت تک وہ علاقے نہیں دیکھے تھے۔ تو میں نے کوہ مری میں بھی نینی تال کی طرح جھیلیں دکھائی تھیں اور نتھیا گلی میں موٹر رکشا چلوائے تھے۔ بہر حال میرا خوب تماشہ بنا مگر میں لکھنے سے باز نہیں آیا اور اس وقت سے آج تک کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہا ہوں۔ وقت کے ساتھ پختگی بھی آگئی اور جب میری بھابی بیاہ کر آئیں تو وہ اردو ادب میں ایم اے کر رہی تھیں۔ مجھے انکی کتابوں کا ایسا چسکا لگا کہ اپنی سائنس کی کتابوں سے زیادہ انکی کتابیں چاٹتا رہتا تھا جس سے تحریر میں کچھ سنجیدگی آگئی اس دوران میرے کئی مضامین اخبار جنگ کے ہفتہ وار ایڈیشن میں اور کچھ افسانے رومان کراچی اور شمع لاہور میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد بھابی کی ہی کورس کی کتابوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ کئی سنجیدہ تنقیدی مضامین لکھے جو مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوئے۔ ایک زمانے میں تو اردو ادب سے اس قدر لگاؤ ہو گیا تھا کہ میڈیکل کالج میں داخلے کے باوجود ڈاکٹری چھوڑ کر واپس میرپور خاص آ گیا تھا کہ اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کرونگا اور درس وتدریس میں ساری زندگی بتاؤنگا مگر پھر اماں اور کچھ دوستوں کے سمجھانے کی وجہ سے دو ہفتے کے بعد دوبارہ میڈیکل کالج جا کر پڑھائی شروع کی۔

## موسیقی

اس کے علاوہ ایک اور صلاحیت جو خدا نے مجھے عطا کی تھی وہ بھی میرے لئے بڑی پریشانی کا باعث بنی۔ ہمارے خاندان میں موسیقی کا رواج تھا اور گاہے گاہے موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ اعلی معیار کی غزلیں گائی جاتی تھیں خاندان میں کئی لوگوں نے سنجیدگی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی اور موسیقی کے اچھے ذوق کا ہونا مہذب ومتمدن ہونے کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی اور میری بڑی بہن بھی اچھا گاتی تھیں خاص طور سے وہ یہ غزل

تم نغمہ ماہ و انجم ہو تم سوز تمنا کیا جانو
تم سوز محبت کیا سمجھو تم دل کا تڑپنا کیا جانو

بہت ہی اچھے ترنم سے گاتی تھیں۔ میں بھی کبھی کبھی گا لیا کرتا تھا مگر مجھے گانا گانے یا گانا سنانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ مگر ماسٹر چوہدری بشیر صاحب مجھے کبھی کبھی کسی خالی پیریڈ میں کہتے کہ گانا سناؤ۔ میری تو جان پر بن جاتی اور میں بڑا پیر پٹختا اور جز بز ہوتا مگر وہ نہیں چھوڑتے۔ کبھی کبھی جب میں بہت ضد پکڑتا کہ نہیں گاؤنگا تو وہ مجھے بنچ پر کھڑا کر دیتے کہ جب تک گانا نہیں سناؤ گے چھٹی نہیں ملے گی۔ پھر لڑکے میری منتیں کرتے کہ بھئی سنادو کہ ہماری بھی چھٹی نہیں ہو رہی۔ پھر میں انتہائی بے دلی سے کوئی گیت گا کر چھٹی کر لیتا۔ سالوں بعد ۱۹۶۳ میں ٹنڈو جام ایگریکلچرل کالج میں سندھ کے انٹر کالج میوزک مقابلے میں میں نے اور مشتاق (جو غضب کا ماؤتھ آرگن بجاتا تھا) کی ٹیم نے شاہ عبداللطیف کالج کے لئے اول انعام کی ٹرافی جیتی جسکی تصویر پرنسپل ایف ایم ماجد صاحب کے ساتھ تھی جو پچھلے کچھ سالوں تک میرے پاس تھی۔ مگر اس وقت چوہدری بشیر صاحب کی کلاس میں مجھے گانے کے تصور سے ہی بخار چڑھنے لگ جاتا تھا۔ اسی طرح میرے پڑوس میں بسم اللہ خان کی بڑی بیٹی آسیہ آپا جو میری بہن سلطانہ آپا کی ہم عمر تھیں اور مجھ سے سگی بہنوں جیسی ہی محبت کرتی تھیں، مجھ سے گانا سننے کی فرمائش کرتیں اور جب میں ٹھنکتا ہوا انکو گانا سنانے سے انکار کر دیتا تو وہ اپنے دوپٹے سے میرے پاؤں صحن میں پڑے پلنگ سے باندھ دیتیں اور کہتیں جب تک تم گانا نہیں سناؤ گے میں تمہیں نہیں کھولونگی۔ ہائے مجھے آج یہ سب لوگ کیسے یاد آ رہے ہیں کیسی محبتیں انہوں نے مجھے دیں۔ آسیہ آپا شاید ۱۹۵۶ میں شادی ہو کر کلکتہ چلی گئیں اور پھر میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔

### تقریریں اور مباحثے

میں اپنی چرب زبانی اور لفاظی کے لئے یوں تو اسکول میں مشہور تھا مگر میں نے اپنی اس خداداد صلاحیت کو تعمیری طور پر کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ ہمارے نئے اسکول کی عمارت کے مرکز میں ایک بڑا ہال تھا جس کے اوپر ایک گیلری بھی بنی ہوئی تھی۔ اس میں ہر دو ہفتے بعد دوپہر کو گیارہ بجے تقریری مشقیں ہوتی تھیں اور پھر سال کے آخیر میں باقاعدہ طور پر تقریری مقابلے ہوتے تھے۔ ایک بار پھر میرا دوست مرزا اشفاق بیگ میرے لئے اس بات کا محرک بنا کہ میں بھی تقاریر میں حصہ لوں۔ اس نے مجھ سے پہلے تقریروں میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ بھی اچھا بولتا تھا مگر اسکے انداز میں گھن گرج اور روانی نہیں تھی وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا۔ اس نے ہی مجھے اس بات کی ترغیب دی کہ میں تقریروں میں حصہ لوں۔ پہلی دفعہ جب میں بولنے کے لئے اسٹیج پر چڑھا جس پر ہیڈ ماسٹر آرائیں اور دوسرے سینئر ماسٹر صاحبان بیٹھے تھے تو میرے پاؤں کانپنے لگے۔ میں اسوقت ساتویں جماعت میں تھا اور بڑی کلاسوں کے لڑکے بھی بولنے والوں میں شامل تھے ادھر سننے والے لڑکوں کا ایک سیلاب میری نظروں کے سامنے تھے، پھر لڑکوں کو ہوٹنگ کی مکمل آزادی تھی اور ہر مقرر پر خوب خوب آوازیں کس رہے تھے۔ میں نے اپنی تقریر خوب رٹی ہوئی تھی۔ میں نے لرزتی آواز اور کپکپاتے قدموں سے اپنی تقریر شروع کی اور ابھی پہلا ہی پیراگراف بولا تھا کہ میں باقی رٹی ہوئی تقریر بھول گیا۔ بس پھر تو لڑکوں نے وہ شور مچایا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا مشکل سے اسٹیج سے نیچے اترا اور ایسا چھپا چھپا کر بھاگا کہ سیدھے گھر کی راہ لی۔ یہ پہلا تجربہ نہایت حوصلہ شکن تھا۔ کئی دن لڑکوں نے خوب مزاق اڑایا کہ میاں ہر چیز میں رستم بننے کی کیوں کوشش کرتے ہو۔ بہرحال کچھ ماسٹروں اور خاص طور سے چوہدری بشیر، کچھ میرے دوست اشفاق اور کچھ اپنے بڑے بھائی کی حوصلہ افزائی کے بعد میں نے دوبارہ تقاریر میں حصہ لینا شروع کیا اور پھر اللہ نے اس شعبہ میں اس قدر کامیابی عطا کی کہ میڈیکل کالج کے آخری سال تک درجنوں انعامات جیتے۔ شاید میرے میڈیکل کالج کے زمانے میں حیدرآباد کے سٹی کالج میں ہونے والا مقابلہ جس میں کراچی سے ظہور الحسن بھوپالی اور شفیق پراچہ نے حصہ لیا تھا وہ واحد مقابلہ تھا جس میں مجھے کوئی انعام نہ ملا ورنہ اللہ تعالی نے ہر مقابلے میں مجھے کسی نہ کسی انعام سے نوازا۔ (شفیق پراچہ اور ظہور الحسن بھوپالی بڑے پائے کے مقرر تھے۔ شفیق پراچہ بعد میں کراچی کے کمشنر ہوئے اور بھوپالی جمیعت الاسلام کے جنرل سکریٹری ہوئے اور اسمبلی کے ممبر اور سندھ کی کابینہ میں وزیر بھی ہوئے۔ انہیں بعد میں سیاسی وجوہات کی بنا پر قتل کر دیا گیا) اسکول میں میرے علاوہ اسلم اعوان اور چندر نوتانی بھی اوّل درجے کے مقرر تھے۔ چندر سے بعد میں گہری، نہایت گہری دوستی ہوگئی جسکا تذکرہ بعد میں آئیگا۔ اسکے علاوہ اظہر سلیم بھی بہت اچھا مقرر تھا مگر وہ میونسپل اسکول سے تھا اور عام طور سے میرا مدمقابل ہوتا تھا۔

### تصویر کشی کا شوق اور سکالرشپ

ساتویں جماعت میں ایک کل سندھ اسکالرشپ کا امتحان ہوتا تھا۔ اس میں یوں تو ہر لڑکا بیٹھ سکتا تھا مگر پورے ضلع تھرپارکر سے صرف دس لڑکوں کو انکی کارکردگی کی بنا پر وظیفہ ملتا تھا جو میٹرک تک دیا جاتا تھا۔ اگرچہ وظیفے کی رقم صرف ساڑھے بارہ روپئے مہینہ تھی مگر یہ نہ صرف ایک بڑے اعزاز کی بات تھی بلکہ اس سے طالب علم کی مالی مدد بھی ہو جاتی تھی (یہ وہ زمانہ تھا جب بڑے افسران کی تنخواہ تین سو روپئے ہوتی تھی) میں تو ہمیشہ ہی سے مالی طور پر تنگ دست رہا تھا مگر میری بڑی تمنا تھی کہ میں ایک کیمرہ خریدوں کیونکہ مجھے فوٹوگرافی سے دلچسپی تھی مگر سستا ترین کیمرہ چالیس روپئے کا تھا۔ سلطان بھائیجان کے ایک دوست دیدار، بہت اچھی فوٹوگرافی کرتے تھے۔ نہ صرف وہ تصویریں کھینچتے تھے بلکہ اپنے خود کے شوقیہ ڈارک روم میں انہیں ڈیویلپ بھی کرتے تھے۔ میں بھی کبھی انکے ساتھ کھڑا ہو کر کاغذ پر تصویر کے ابھرنے کا منظر حیرت بھری آنکھوں سے دیکھا کرتا تھا۔

بہرحال یہ امتحان ہوا، شاید کئی سو لڑکے اس میں بیٹھے تھے۔ اسکے نتیجے سے کوئی دس دن پہلے ہم چند لڑکے ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ مجھے آج بھی خوب یاد ہے کہ جب نتیجے کے متعلق قیاس آرائیاں

کی جارہی تھیں تو اشفاق نے کہا'' بھئی ایک تو میں ہوں جسے وظیفہ ملے گا اب باقی نولڑکوں میں تم لوگ یا شہر کے دوسرے لڑکے فیصلہ کرلیں'' میں اسکی خوداعتمادی سے بہت متاثر ہوا۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے ماسٹروں کی نظر میں ضلع کا دوسرالڑکا میں ہوتا مگر سچ یہ ہے کہ مجھ میں اس قدر خوداعتمادی نہیں تھی کہ میں اپنے متعلق یہ کہہ سکتا۔ بہر حال نتیجہ نکلا اور میں بھی وظیفہ کا حقدار پایا گیا۔ اسی کہ ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ وظیفہ کی رقم آٹھ مہینے بعد یک مشت ملے گی۔ آٹھ مہینے بعد ہمیں اسکول کے دفتر سے مبلغ سوروپئے ملے۔ اس خوشی کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اتنی بڑی رقم۔۔ جوصرف میری تھی، نہ میں نے کبھی پہلے دیکھی تھی نہ ہی میں نے اسکا تصور کیا تھا۔ میں نے فوراً پہلے امّاں کو جاکر یہ خوش خبری سنائی اور رقم انکی جھولی میں ڈال دی میری امّاں نے مجھے جو دعا دی وہ مجھے اب بھی یاد آتی ہے کہ وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی کہ ''بیٹا۔ اللہ تمہیں اتنا دیگا کہ رکھ رکھ کر بھولا کروگے''۔ انہوں نے مجھے رقم واپس کی اور کہا کہ جاکر کیمرہ خریدلوں۔ میں نے فوراً علوی جنرل اسٹور سے سب سے کم قیمت کا ''کوڈک کا بے بی براؤنی'' کیمرہ خریدا اور بھان سنگھ آباد کے قبرستان کے پاس پانی کے ایک بہت بڑے جوہڑ کے کنارے (جوجھیل جیسا لگتا تھا) غروب آفتاب کی کئی تصویریں لیں۔ مجھے صرف مناظر کی تصویر کشی کا شوق تھا۔ اس طرح میرے اس شوق کی ابتدا ہوئی جو آج بھی جاری ہے۔ میری کھینچی ہوئی کچھ تصویریں FLICKR.COM پر سرچ ونڈو میں MFALAM ٹائپ کرکے دیکھی جاسکتی ہیں۔

کیڈٹ کالج میر پور خاص/ پٹارو

بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ پاکستان کا مشہور کیڈٹ کالج پٹارو، جسکے فارغ التحصیل ہمارے موجودہ صدر زرداری بھی ہیں پہلے میر پور خاص میں قائم ہوا تھا۔ ۱۹۵۷ء کے آخیر میں اس عمارت میں جو بعد میں شاہ عبداللطیف کالج کے حصے میں آئی حکومت نے کیڈٹ کالج قائم کیا۔ یہ نئی اور عظیم الشان عمارت تھی اسکا اپنا کیمپس تھا جس میں کھیل کے میدان، ٹینس کورٹ، رہائشی بنگلے اور طلبہ کا ہوسٹل شامل تھا۔ اسکی سربراہی کے لئے ایک انگریز فوجی افسر کرنل کومب COOMB کا انتخاب کیا گیا۔ کوشش کی گئی تھی کہ اسکا معیار اور نصاب بالکل انگلینڈ کے کیڈٹ کالجوں جیسا ہو۔ آٹھویں جماعت کے لڑکوں سے پہلے سال کی شروعات کی گئی۔ پورا شہر اس سے بیحد متاثر تھا اور لوگوں کی نظروں میں اس ادارے کے لئے بیحد عزت اور وقار تھا اسکے ساتھ اس کالج سے ایک پر اسراریت بھی وابستہ تھی کیونکہ اس کی حدود میں جانے کی ممانعت تھی حتیٰ کہ طلبہ کے والدین بھی صرف اجازت ہی سے وہاں جاسکتے تھے۔ طلبہ بھی خاص خاص ایام ہی میں گھر واپس آتے تھے کیونکہ یہ مکمل طور پر رہائشی اسکول تھا۔ ایک دن اسکے طلبہ کا ایک گروپ کراچی جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر آیا، سب لڑکے بہت خوبصورت نیوی بلیو بلیزر پہنے اور کالج کی ٹائی لگائے چمکدار بوٹ پہنے انتہائی نظم وضبط کے ساتھ گاڑی کا انتظار کررہے تھے۔ تمام لوگوں کی نظریں ان پر جمی تھیں اور انہیں اسقدر تعجب سے دیکھ رہے تھے جیسے یہ کسی اور ملک کے باشندے ہوں۔ سنا تھا کہ اس کی ماہانہ فیس ہی ڈیڑھ سو روپئے ہے۔ یہ اس دور میں بہت بڑی رقم تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر طالب علم میں صلاحیت ہو تو اسے مفت داخلہ مل سکتا ہے اور دیگر خراجات کے لئے وظیفہ بھی ملے گا۔ پہلے بیچ میں تو نہیں مگر دوسرے بیچ میں داخلے کے لئے میرے دوست اشفاق نے اس کے مقابلے کا امتحان دیا اگرچہ اسکے حالات بھی بالکل میرے جیسے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ وہ ان اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا مگر اسے خود پر اعتماد تھا۔ اسنے امتحان پاس کیا اور وہ، جب ہم نویں کلاس میں تھے ہمارا اسکول اور میرا ساتھ چھوڑ کر کیڈٹ کالج میں چلا گیا۔ ایک ہی سال بعد جب ہمارے اسکول میں ایک تقریری مقابلہ ہوا جس کے ساتھ ہی جنرل نالج کا بھی مقابلہ تھا تو کرنل کومب ججوں یا شاید مہمانوں میں شامل تھے۔ جب مجھے پہلا انعام ملا تو انہوں نے مجھے بلا کر اس بات کی پیشکش کی کہ اگر میں کیڈٹ کالج میں داخلہ چاہتا ہوں تو وہ مجھے بھی وظیفہ دینے پر تیار ہیں۔ میں نے تو اس کالج کی سخت اور نظم وضبط سے بھرپور زندگی کے متعلق سن رکھا تھا کیونکہ اشفاق کے علاوہ میرا ایک کزن فرقان علوی بھی اسی کالج میں تھا۔ میں تو ہمیشہ سے آزاد پنچھی رہا ہوں اس لئے میں نے ان سے شکریہ کے ساتھ معذرت چاہ لی۔ اسکے علاوہ مجھے سرکاری نوکریوں اور خاص طور سے ایسی ملازمتوں سے بڑی حد تک نفرت تھی جن میں کسی بھی قسم کی یونیفارم کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے گھر کا سیاسی ماحول ایسا تھا کہ میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان ملازمتوں میں رہ کر ایمانداری اور انسانیت کو اپنا شعار بنانا بڑی حد تک ناممکن ہے۔ طاقت کا نشہ بہت جلد اچھے انسان کو بھی گمراہ کردیتا ہے۔ مگر اشفاق نے کلی طور پر کیڈٹ کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی اور بعد میں پاکستان نیوی میں کمیشن لیا۔ ہماری دوستی اور اسکے شاندار کیرئر کی مزید تفصیلات جن پر مجھے فخر ہے، آئندہ ابواب میں آئینگی۔ بعد میں یہ کالج سندھ کے ضلع دادو میں پٹارو کے مقام پر منتقل کردیا گیا۔ مجھے یقین ہے اس میں سیاسی ہاتھ تھا کہ کسی بااختیار شخص کے ذاتی مفاد کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا تھا۔

شرارتیں

شریر تو میں اس قدر تھا کہ میری امّاں شعر پڑھتی تھیں
شرارت کے پتلے ہیں ننھے میاں
بھری بوٹی بوٹی میں ہیں شوخیاں

مگر یہاں کچھ ایسی شرارتوں کا ذکر ہے جو بڑی حد تک مضر اور خطرناک ہوسکتی تھیں۔ ہمارے گھر میں کوئی بڑی تقریب تھی۔ نیم کے نیچے دور دور تک سفید چاندنیاں بچھی تھیں۔ جگہ جگہ بجلی کے بڑے بڑے قمقمے لٹکائے گئے تھے۔ کھانے کے بعد قوالی کا بھی پروگرام تھا۔ میں شاید نو سال کا تھا۔ مجھے کہیں سے ربر کی ایک لمبی سی رسی مل گئی تھی۔ میں نے اس کے ایک سرے کو چائے کے کپ کے کنڈے میں باندھا اور اسکو سر کے اوپر گھمانے لگا۔ ربر کی لچک کی وجہ

سے جتنی زور سے گھماتا تھا کپ اتنی ہی دور جاتا تھا۔کئی لوگوں نے منع کیا کہ بھئی یہ کسی کے لگ جائیگا مگر میں کہاں ماننے والا تھا۔میری چھوٹی بہن دردانہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے وہ شاید دوڈھائی سال کی تھی اسکے بال قدرتی طور پر سنہرے اور رنگ بہت گورا ہے دونوں بالوں میں ربن باندھے وہ بالکل چینی کی گڑیا لگ رہی تھی۔اس شام وہ پیاری سی فراک پہنے تھی۔اسے میرا یہ کرتب بہت اچھا لگا اور وہ بھاگتی ہوئی میرے طرف بڑھی ادھر ربر کی رسی میرے طاقت سے گھمانے کی ٹینشن برداشت نہ کرسکی اور ٹوٹ گئی۔کپ اس سے نکلا اور راکٹ کی طرح پوری قوت سے دردانہ کے چہرے پر لگا اور پاش پاش ہوگیا اسکی چیخ نکلی اور ہم نے یہ دیکھا کہ ثانیوں میں اسکا پورا چہرہ اور آنکھیں لہولہان ہوگئیں۔گھر میں کہرام مچ گیا۔یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ چوٹ کہاں لگی ہے۔خیال تھا کہ دونوں آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔کسی نے برف کا بھیگا تولیہ اسکے چہرے پر رکھا اور ہسپتال کی طرف بھاگے مگر اتوار کی شام تھی سارے ڈاکٹروں کے شفا خانے بند تھے۔پھر سب کو خیال آیا کہ قریب ترین نیوٹاؤن میں ڈاکٹر اے آر خان ہیں( یہ وہی جگہ ہے جہاں بعد میں گلاب خان تاج نے اپنا گھر اور مارکٹ بنایا )ہم انکے یہاں پہنچے۔وہ میرے کنبے سے واقف تھے بچارے گھر کے کپڑوں میں نیچے اتر آئے اور کلنک کھولا ، زخم صاف کیا اور کئی ٹانکے لگائے۔خدا کا شکر ہے کہ آنکھیں بچ گئیں۔پہلی دفعہ امّاں نے مجھے بہت سے کوسنے دئے اور کہا کہ یہ گھر کی تباہی کا سبب بنے گا۔محفل تو درہم برہم ہوہی گئی اور قوالی کا پروگرام بھی کینسل ہوگیا۔خدا کا شکر ہے وقت کے ساتھ یہ زخم بھر گیا اور اسکا نشان بھی بہت ہی کم رہ گیا۔اس شام کی یاد مجھ پر اب بھی کپکپی طاری کردیتی ہے۔

میری بڑی بہن کو الجبرا اور جیومیٹری پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر مولانا خدا بخش آیا کرتے تھے۔وہ عجب مزاحیہ قسم کا حلیہ بنائے رکھتے تھے۔جھبڑی داڑھی، ناک کی پھنگ پر چشمہ، جناح کیپ آنکھوں تک جھکی ہوئی اور اٹنگا پاجامہ۔پھر بات کرتے ہوئے نچلا جبڑا آگے نکال کر بات کرتے تھے۔ میں نے ایک دن جب وہ جوش وخروش سے کوئی تھیورم سمجھا رہے تھے ابّا کی ٹوپی اور چشمے کے ساتھ روئی کی داڑھی لگائی اور انہی کا حلیہ بنا کر انکے سامنے جا کھڑا ہوا اور نچلا جبڑا آگے نکال کر انکی نقل کرنے لگا جس پر میری بہن کی بہت زور سے ہنسی نکل گئی۔ماسٹر صاحب بیحد ناراض ہوئے اور یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل گئے کہ اب اس گھر میں قدم نہیں رکھونگا۔سنا تھا کہ ان سے اچھا ماسٹر اس مضمون میں نہیں تھا۔میری بہن روئیں کہ انہی سے پڑھوں گی ورنہ میٹرک میں فیل ہوجاؤں گی لیکن وہ واپسی پر تیار نہیں تھے۔ میری امّاں کو انکی بہت خوشامدیں کرنی پڑیں۔بڑی مشکل سے وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ جب وہ پڑھانے آئینگے تو فیروز گھر میں نہ ہو۔انکے حسب الحکم انکے آنے سے پہلے مجھے اپنی ممانی کے یہاں جانا پڑتا تھا۔

ہمارے گھر میں ایک قد آدم شیشے کی الماری تھی جس میں چینی کے برتن سجے تھا۔اسکے دو پٹ تھے۔اگرچہ اس الماری کا قد مجھ سے اونچا تھا مگر میں اچک کر اس کے ایک پٹ پر لٹک جاتا تھا اور جھونکے لے لے کر جھولا کرتا تھا۔گھر کے ہر شخص نے ڈانٹا تھا کہ کسی دن بہت زور سے گرونگا مگر مجھے اس میں بہت مزہ آتا تھا اور جب گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا تو میں پھر یہی حرکت کرتا تھا۔ایک دن جب میں اسکے پٹ پر جھول رہا تھا یہ ساری الماری مجھ پر آگری۔خدا کا شکر تھا کہ جب اتنی بھاری الماری اپنے برتنوں کے ساتھ مجھ پر گری تو جس پٹ پر میں لٹکا تھا وہ کھلا ہوا تھا اس لئے مجھے معمولی خراش آئی مگر سارے چینی کے برتن اور الماری کے دروازوں میں لگا شیشہ چکنا چور ہوگیا۔مجھے معلوم تھا کہ آج میں امّاں کے ہاتھوں قتل کردیا جاؤنگا اسلئے گھر سے بھاگ کر اپنی ممانی کے یہاں پناہ لی۔پورا دن انکے یہاں خوف سے کانپتے گذارا شام کو میری ممانی اور انکے بڑے بیٹے مجھے ساتھ لیکر واپس ہمارے گھر آئے اور میری امّاں سے وعدہ لیا کہ وہ مجھے ماریںنگی نہیں۔امّاں نے مجھے خونی نظروں سے دیکھا اور صرف یہ کہا کہ یہ لڑکا گھر میں کوئی عزت کی چیز نہیں رہنے دیگا اور ایک دن اس گھر کی تباہی کا سبب بنے گا۔یہ بات وہ پہلے بھی کہہ چکی تھیں۔اللہ کا شکر ہے کہ انکی یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی اور انکے کوسنے مجھے دعائیں بن کر لگے۔

### اسکول کے دیگر اساتذہ

ہمارے سکول کے کچھ دوسرے اساتذہ کا تذکرہ ضروری ہے۔ آرائیں صاحب اور چوہدری بشیر کے علاوہ رحیم صاحب اور شفیق صاحب لڑکوں میں مقبول تھے۔شفیق صاحب الجبرا کے ماہر تھے اور بہت دل لگا کر الجبرا پڑھاتے تھے۔انکی دونوں ہاتھوں کی درمیانی اور انگوٹھی والی انگلی پیدائشی طور پر جڑی تھی جو ہم لڑکوں کے لئے حیرت کی بات تھی۔اس کے علاوہ جب وہ الجبرا کے سوال کے آخیر میں جواب پر پہنچتے تو بڑے فخر اور ڈرامائی انداز سے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہتے تھے SOLVED اس وقت انکی انگلیوں کی یہ چیز بہت واضح ہوجاتی تھی۔رحیم صاحب بھی الجبرا پڑھاتے تھے مگر شفیق صاحب کی طرح مقبول نہیں تھے۔مسیح صاحب جغرافیہ کے ٹیچر تھے اور انہوں نے اپنے ذاتی شوق اور کوششوں سے بہت اعلی درجہ کا جغرافیہ ہال بنایا تھا۔اس میں دیواروں پر چہار طرف نقشے اور دوسری جغرافیائی علامتوں کی تصاویر تھیں۔ یہ سب لڑکوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ سامنے کی دیوار پر جہاں بورڈ ہوتا ہے وہاں ایک بہت بڑے سائز کا دنیا کا نقشہ تھا جس نے بڑی حد تک دیوار کو گھیر لیا تھا۔یہ پری میٹرک کے لڑکے تعظیم نے بنایا تھا مگر یہ بہت اچھا یا تکنیکی طور پر صحیح نہیں تھا۔میں جب پری میٹرک میں آیا تو میں نے مسیح صاحب سے اجازت لیکر اسی سائز کا ایک نقشہ بنایا۔اسکی تیاری میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی اور کئی دن ہمارے صحن میں اسکے کاغذ اور رنگ بکھرے رہے۔مگر جب میں یہ نقشہ تیار کرکے لیکر گیا تو اگرچہ مسیح صاحب نے اسکی بڑی تعریف کی مگر اسکو لگانے میں ٹال مٹول کرنے لگے۔کئی دن کے بعد بھی جب یہ نقشہ نہیں لگایا گیا تو میں نے ان سے پوچھا۔اس پر انہوں نے کہا کہ اگرچہ تعظیم

اب اسکول چھوڑ کر جا چکا ہے مگر جب یہ ہال بنا تھا تو اس نے بڑی محنت سے یہ نقشہ بنایا تھا مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہو رہا کہ اب اسکا نقشہ ہٹا کر تمہارا نقشہ لگا دوں۔ میرا نقشہ نہیں لگایا گیا اور اسٹور روم میں ڈال دیا گیا مگر مجھے اسکا کوئی غم نہ ہوا بلکہ مجھے مسیح صاحب کی یہ بات اچھی لگی کہ انہوں نے مروت اور روائت نبھائی۔ مسیح صاحب کے علاوہ میں قیصر صاحب سے بھی متاثر تھا وہ انگریزی بہت اچھی پڑھاتے تھے۔ جعفری صاحب فزیالوجی اتنی اچھی پڑھاتے تھے کے بعد میں میڈیکل کالج میں بھی ہمارے استاد اتنی اچھی طرح یہ مضمون نہیں پڑھا پاتے تھے۔ میرے اسکول کے آخری زمانے میں شمشاد صاحب اردو کے ٹیچر تھے۔ وہ اردو ادب پر بہت حاوی تھے اور ہماری کلاس کے معیار سے بہت اونچی اردو پڑھاتے تھے مگر انکا دل اسکول کی ٹیچری پر مطمئن نہیں تھا اور وہ جلد کالج میں لیکچرر ہو کر چلے گئے مگر انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ وہ مجھے مستقل لکھنے کی ترغیب دیتے رہے۔

آخیر میں ایک ایسے ٹیچر کا ذکر ضروری ہے جن کو خدا نے ایسی صلاحیت دی تھی کہ میں آج بھی سوچتا ہوں کہ اگر اللہ نے انہیں کسی اور ملک میں پیدا کیا ہوتا تو وہ شاید بہت شہرت و دولت کماتے۔ یہ تھے ہمارے ڈرائینگ کے استاد لال محمد بلوچ۔ میں نے دنیا کے بڑے بڑے اور مشہور میوزیم دیکھے ہیں اور مشہور زمانہ پینٹنگز دیکھی ہیں ہر جگہ مجھے لال محمد صاحب یاد آئے۔ وہ نہ صرف واٹر کلر، آئیل پینٹنگ اور پینسل سے قیامت خیز تصاویر بناتے تھے بلکہ صرف کوئلے سے بھی انتہائی حیرت انگیز اسکیچ کھینچتے تھے۔ انکی ایک تصویر میرے ذہن سے نہیں مٹتی جس میں ایک سمندری طوفان اور بادلوں سے گھرے آسمان کے درمیان ایک جہاز دکھایا گیا تھا جسکے بادبان پھڑ پھڑا رہے تھے اور کچھ تیز ہوا کی وجہ سے پھٹ چکے تھے۔

میرے یہ تمام استاد آج بھی میری یادوں میں زندہ ہیں اور میں انکو بڑی عزت سے یاد کرتا ہوں کہ میری شخصیت کی تعمیر اور میرے مستقبل کی کامیابی میں ان سب کا بڑا ہاتھ ہے۔

## چوہدری بشیر سے علیحدگی

چوہدری بشیر صاحب کو ہماری کلاس اس قدر پسند آئی کہ جب ہم ساتویں پاس کر کے آٹھویں کلاس میں آئے تو انکے کہنے پر آرائیں صاحب نے انہیں بھی ہمارے ساتھ پروموٹ کر کے آٹھویں کا استاد بنا دیا۔ اس کے بعد جب ہم نویں میں داخل ہوئے تو انہوں نے پھر آرائیں صاحب سے یہی درخواست کی کہ انہیں آگے بڑھا کر نویں میں بھی ہمارا استاد بنا دیا جائے اور آرائیں صاحب نے انکی بات مان کر انہیں پھر ہمارے اوپر مسلط کر دیا۔ میں اس بات پر بڑا جز بز ہوا۔ باقی لڑکے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں کچھ دوسرے اساتذہ سے بھی مستفیض ہونا چاہئے مگر کسی میں ہمت نہ تھی۔ ایک دن میں نے کلاس میں کھڑے ہو کر بشیر صاحب سے کہہ دیا کہ تین سال سے ہم صرف آپ سے پڑھ رہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ہم کچھ دوسرے ٹیچرز سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ انہوں نے کہا کس سے؟

میں نے کہا ''مسیح صاحب سے یا قیصر صاحب سے'' اس وقت تو وہ کچھ نہیں بولے مگر پھر کئی ماہ انہوں نے کلاس میں بہانے بہانے سے میرے کان مروڑے، کان مروڑتے تھے اور طعنے کے طور پر کہتے تھے کہ ''ہم تو مسیح صاحب سے پڑھینگے۔۔ ہم تو قیصر صاحب سے پڑھینگے'' بہر حال جب نویں پاس کر کے ہم دسویں میں گئے (سندھ میں میٹرک گیارھویں کا ہوتا تھا) تو بشیر صاحب نے ہمارے ساتھ مزید جانا مناسب نہ سمجھا اور مسیح صاحب ہمارے کلاس ٹیچر مقرر ہوئے مگر مجھے ایمان داری سے یہ کہنا پڑیگا کہ مسیح صاحب کے ساتھ ہمارا جو وقت گذرا وہ مایوس کن تھا اور زیادہ تر لڑکے اس سے غیر مطمئن رہے۔ وہ بہت اچھے ٹیچر نہیں تھے اور مزاج کے بھی بہت گرم تھے۔ پھر نویں کے بعد اشفاق بھی کیڈٹ کالج چلا گیا تھا اس لئے بھی ہمارا تعلیمی معیار وہ نہیں رہا جو بشیر صاحب کے ساتھ تھا۔

## فش پونڈ میں پکنک

میر پور خاص میں تقسیم ملک سے پہلے ریواچند گارڈن، لال چند گارڈن اور میونسپل پارک عوام کی تفریح کا سامان فراہم کرتے تھے مگر تقسیم کے بعد مہاجرین کے قافلے آئے اور بے گھر ہونے کی وجہ سے انہوں نے ریواچند اور میونسپل پارک میں جھونپڑیاں ڈال کر انہیں برباد کر دیا تھا۔ اب صرف فروٹ فارم رہ گیا تھا جہاں ہمارا کنبہ پورا پورا دن گذارتا تھا۔ یہاں میلوں مختلف قسم کے پھلوں کے درخت تھے۔ ان میں آموں کے درخت اور انکی فصل آج بھی میر پور خاص کی وجہ شہرت ہے۔ مگر ہم لوگ ایک ہی جگہ جا جا کر اکتا چکے تھے۔ پھر ہمیں کسی نے بتایا کہ میر پور خاص سے کچھ دور مشہور زمیندار فقیر محمد منگریو کا باغ فش پونڈ ہے۔ آئندہ خاندانی پکنک اس باغ میں منانے کا پروگرام بنایا گیا۔ میرے ماموں زاد بھائی نے ایک چھوٹی بس کرائے پر لی، بوریوں میں بھر کر خربوزے ساتھ لئے گئے۔ کئی قسم کی آموں کی پیٹیاں اٹھائی گئیں۔ خواتین نے قیمہ پراٹھے، شامی کباب اور انڈے کا خوگینہ بنایا۔ ہم باغ میں پہنچے۔ اس باغ کے چاروں طرف ایک بیحد خوبصورت نہر بہتی تھی جس کے کناروں کو سرخ اینٹوں سے پختہ کیا گیا تھا اس میں رنگین مچھلیاں تیر رہی تھیں (شاید اسی وجہ سے اسکا نام فش پونڈ رکھا گیا تھا)۔ باغ کے اندر جانے کے لئے اس نہر کے اوپر کئی جگہ خوبصورت پل بنائے گئے تھے۔ پھر اصلی باغ کے حصے میں سر سبز لان تھا اور کئی جگہ ایسے گوشے بنائے گئے تھے کہ ان کے اوپر جالیوں کی چھتیں تھیں جن پر رنگ برنگے پھولوں کی بیلیں چڑھیں تھیں۔ دن بھر کھیل کود جیسے ستولیہ، کوڑا جمال شاہی، اور والی بال شامل تھی کھیلے گئے ان میں خواتین نے بھی شرکت کی، پھر برف میں دبے خربوزے اور آم کھائے گئے۔ اتنا مزہ آیا اور یہ باغ اس قدر پسند آیا کہ فیصلہ کیا گیا کہا آئندہ کراچی سے ہمارے رشتہ دار اگر میر پور خاص آئے تو انہیں متاثر کرنے کے لئے اس باغ کو فخر سے دکھایا جائیگا۔

### متفرقات

اس باب کے اختتام پر چند عام چیزوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ میر پور خاص میں میونسپل کمیٹی کے انتخابات بڑے زور شور سے ہوتے تھے۔ میری والدہ ان میں بہت فعال تھیں۔ مبارک علی جن کی ڈیکوریشن کی دکان تھی، ڈاکٹر نذیر جو برطانوی فوج کے ریٹائرڈ کیپٹن تھے اور ایک تاجر رشید احمد الیکشن میں حصہ لیا کرتے تھے۔ میری والدہ نے کبھی مبارک علی کے لئے کام کیا اور کبھی رشید احمد کے لئے۔ ۔ڈاکٹر نذیر میونسپل کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے اور ایک زمانے میں انکے نام پر میر پور خاص میں ایک چھوٹی سڑک بھی تھی۔

اسی زمانے میں ریلوے ڈرامہ کلب نے ریلوے مسافر خانے میں اسٹیج لگا کر بہت اعلی پیانے پر تاریخی ڈرامے بھی کئیے تمام اداکار ریلوے کے ملازمین تھے۔ اسکی کامیابی کا سہرا ریلوے ڈاکٹر صفیر الحسن صاحب کے سر تھا وہی ہدایت کار کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسٹیج کی تمام تزئین اور مناظر کے پردوں کی پینٹنگ شفیع پینٹر نے کی تھی۔ اس میں مبارک علی، بشیر سائیکل مارٹ والے اور میرے بھائی نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ اسکے بعد ریلوے ڈرامہ کلب تو ٹوٹ گیا مگر بشیر سائکل مارٹ والے نے اپنے طور پر ڈرامہ کلب قائم کیا اور کئی ڈرامے اسٹیج کئے۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور اسکی بہن زیب النساء کی کہانی پر ایک ڈرامہ بہت مقبول ہوا تھا۔ سنا ہے کہ انہیں اداکاری کا اسقدر چسکا لگا کہ انہوں نے ایک دفعہ کراچی جا کر فلموں میں بھی کام کرنے کی کوشش کی (واللہ عالم بالصواب)

میر پور خاص میں ایک نابینا گلوکار ظہور تھا۔ مشہور تھا کہ وہ بہت چنیدہ چنیدہ غزلیں گاتا ہے۔ مگر شہر میں اسکی زیادہ پذیرائی نہیں ہوتی تھی۔ کسی طرح میری والدہ کو اسکا پتہ چل گیا انہوں نے ہمارے گھر میں اسکی ایک نجی نشست رکھی۔ واقعی اس نے سماں باندھ دیا۔ سیماب اکبر آبادی کی یہ غزل

نسیم صبح گلشن میں گلوں سے کھیلتی ہوگی

میں نے سب سے پہلے اسی سے سنی تھی۔ اسکے بعد ہمارے خاندان کے دوسرے لوگوں نے بھی اسے کئی دفعہ مدعو کیا۔

اسوقت میر پور خاص میں صرف دو پکچر ہاؤس تھے، ماموں جی کا فردوس سنیما اور پیلس سنیما، بہت بعد میں تصویر محل اور پھر اسکے بھی کئی سال بعد قائم ٹاکیز بنا۔ ہمارے کنبے نے ان سنیماؤں میں کئی فلمیں دیکھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شرفا کا فلم دیکھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ شام کی اچھی اور خوشگوار تفریح سمجھی جاتی تھی۔

اسی سال یعنی نویں جماعت میں میری ملاقات سانگھڑ سے آنے والے ایک بیحد ذہین، انتہائی اصول پسند، وقت کے پابند اور اس کم عمری کے باوجود نمازی پرہیز گار لڑکے عبدالرشید غوری سے ہوئی جو اسکول، کالج، میڈیکل کالج اور پھر ہاؤس جاب کے دوران میرا ساتھی رہا۔ اس سے دوستی اور قرابت داری کا ایسا رشتہ بندھا جو گزشتہ سال لبیا میں اسکی ناگہانی اور بے وقت موت ہی پر ٹوٹا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اسکی موت کے باوجود جذباتی اور ذہنی طور پر وہ رشتہ اب بھی نہیں ٹوٹ سکا ہے۔

☆

## آہ!
## صلاح الدین پرویز

نئی دہلی، 28 اکتوبر 2011 (پریس ریلیز)۔ صلاح الدین پرویز کے انتقال سے اچانک دھکا سا لگا۔ ان کے اُٹھ جانے سے اردو کا جو نقصان ہوا ہے اس کا احساس آگے چل کر ہوگا۔ پچھلے تین چار برسوں سے ان کی علالت کی خبریں مل رہی تھیں لیکن خیال تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ صلاح الدین پرویز ایک غیر معمولی فنکار تھے۔ ان کی تخلیقات سے جو ذہن سامنے آتا ہے وہ معمولی ذہن نہیں ہے۔ وہ جتنے ذہین و فطین تھے اتنے لا اُبالی بھی تھے۔ انھوں نے زندگی کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا اور خود کو بے دریغ خرچ کیا۔ آج یہاں اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے صلاح الدین پرویز کے انتقال پر تعزیت کرتے ہوئے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اپنے دیرینہ تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شعر و ادب میں صلاح الدین پرویز نے ایک نہیں کئی بیش بہا تخلیقات پیش کیں جن میں عجیب و غریب شعوری و لاشعوری فشار ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے غالب پر ان کی بے مثال نظموں کا مجموعہ 'بنام غالب' سامنے آیا۔ اردو، فارسی، عربی، ہندی متعدد زبانوں پر ان کی گرفت حیرت انگیز تھی۔ وہ چونکہ روشِ عام کے فنکار نہیں تھے اور زمانے سے ہٹ کر چلتے تھے، زمانے نے بھی ان کے پہچاننے میں دیر کی جس کا ان کو شدید احساس تھا۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ صلاح الدین پرویز اپنی وضع اور اپنی سطح کا اکلوتا انسان تھا۔ شاعر ادیب تو آتے رہیں گے، صلاح الدین پرویز جیسا البیلا شاعر پھر نہیں آئے گا۔

☆

# ''بے یقینی کی گھٹا''

## کنسلٹنگ کلینک آغا خان یونیورسٹی

محمود شام
(کراچی)

پاس اور آس کی شاخوں پر لٹکتے
پیلے پڑتے، کہیں پھیکے، کہیں رنگیں چہرے
بے یقینی کی گھٹا امڈی ہوئی آنکھوں میں
فائلیں کانپتے ہاتھوں میں
نگاہیں الجھی
کرسیاں پہیہ لگی
گود لیے جانوں کو
ماں کی آغوش میں کھیلتے ہوئے کچھ تازہ گلاب
باپ کے آخری برسوں کو سنبھالے بیٹا
کوئی بیٹی کسی ممتا کو سہارا دیتی
کرب ماتھے پہ
نگاہوں میں اُمید
ہونٹ ہلتے ہوئے مصروف دعا رہتے ہیں
ایک آواز کسی نام کا پیغام لیے
نبض پہ جب انگلیاں رکھ دیتے ہیں مہرباں
پیار سے دیکھتی ہیں جب بھی مسیحا بہنیں
آس کی شمعیں ہر انگ میں جل اٹھتی ہیں
زندگی اپنی مہک بانٹ کے خوش ہوتی ہے

○

## سالِ فیض ۲۰۱۱ء

یُونس صابر
(پشاور)

واہ کیسا خوش گلو وُہ جس نے چھیڑی ہے غزل
جھوم جھوم اُٹھا کلامِ فیض سے اُردو محل

ہر کوئی چاہے کہ ہو نغمہ سرا مہدیؔ حسن
گا تا جائے اور سُنیں ہم فیضؔ کا شیریں سخن

فیضؔ بے شک غالب و اقبالؔ کی آواز ہے
شاعرِ درد آشنا، مزدُور کا دمساز ہے

آبرو لوح و قلم کی، وہ بڑا انسان تھا
عالمی شہرت کا حامل فخرِ پاکستان تھا

دیس میں ہوتا یا بیرونِ وطن ہوتا کہیں
وہ کبھی اپنی پشوری سجنوں کو بھُولا نہیں

ربط خاص و عام سے تھا عاشقانہ فیضؔ کا
مجھ سا بے حرف و ہُنر بھی ہے دوانہ فیضؔ کا

سر زمیں رحمانؔ بابا اور خٹک خوشحالؔ کی
خیر مانگے فیضؔ سائیں کے مبارک سال کی

زِندہ دل لاہور سے تا ماسکو یادیں تری
نگری نگری، انجمن در انجمن باتیں تری

○

## ''گمشدہ زندگی''

یوگیندر بہل تشنہ
(کیلی فورنیا)

گُمشدہ زندگی جیتے ہو، اور کرتے ہو خود سے سمجھوتے
لمحۂ موجود میں رہ کر گزرے وقتوں میں سانس ہو لیتے
جذبِ احساس میں بہکر، برسوں پہلے لئے اپنے فیصلے
سراہتے ہو، گاہے ردّ کرتے ہو، اور ماضی کے دریچوں سے
جھانکتے ہو، کلام کرتے ہو، اور اک عجیب سی جھنجھلاہٹ میں
کسقدر روانی سے کہتے ہو اکثر
''خوشگوار زندگی جینے کی خاطر، کچھ تو کھونا ہی پڑتا ہے تشنہؔ''!
ہمارے پُرکھوں نے بھی صدیوں پہلے
ایسے ہی اَن چاہے فیصلے لئے ہوں گے، اپنی اولاد کی
بہتر زندگی کے لئے!!
اور آج اُس کی بھی طوطن اپنایا، اولاد کی خاطر،
اور کر دیا باور، تاریخ دہراتی ہے خود کو، یُگ میں!!
اب کِسے ڈھونڈتے ہو تم گھر میں
کسکی یاں تلاش کرتے ہو،
پھر تم بھی تو گھر میں کبھی نہیں ہوتے!!!

○

## دُنیا دیکھی ہے

عبدالرحمٰن عبد
(نیویارک)

کھیل تماشا دیکھی ہے
ہم نے دنیا دیکھی ہے

انساں بے بس دیکھے ہیں
بَستی مَلبہ دیکھی ہے

پیاسے مرتے دیکھے ہیں
بہتی گنگا دیکھی ہے

نرم شگفتہ جسموں کی
قیمت پیسہ دیکھی ہے

بچوں کی لاشوں کے بیچ
سہمی گڑیا دیکھی ہے

ملت، باعزت، خود دار
ہوتے رُسوا دیکھی ہے

لٹتی دیکھی ہیں گودیں
روتے ممتا دیکھی ہے

محرومی میں لوگوں کی
حالت کیا کیا دیکھی ہے

میلے، تہذیبیں، تہوار
سب کچھ دیکھا دیکھی ہے

دنیا کی مت بات کرو
ہم نے دنیا دیکھی ہے

## اندرکاشور

قیصرنجفی

(کراچی)

بارہا پہنی ہے زنجیر حوادث میں نے
بارہا ضبط کی ٹوٹی ہیں طنابیں میری
بارہا وقت نے ہاتھوں میں دیا دامن یاس
بارہا گل ہوئیں اُمیّد کی شمعیں میری

صحن ماضی میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
دفن ہیں آج بھی جن میں مری آنکھیں مرے خواب
حال ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح گدلا ہے
وقتِ آئندہ کی آغوش میں ہے سیلِ سراب

میں نے سوچا تھا مگر یوں بھی نہیں سوچا تھا
زندگی زا نوئے حالات پہ سو جائے گی
اس قدر شور بپا ہوگا مرے اندر بھی
میری آواز بھی اس شور میں کھو جائے گی

❍

## ناقۂ جاں

منظورثاقب

(فیصل آباد)

اسی خیال میں رہتا ہوں میں تو سرگرداں
اے میری ناقۂ جاں! میں ترے لئے اے کاش!
جھلستی ریت کے اس بے کنار صحرا میں
کہیں پہ ابر کا ٹکڑا کہیں پہ آبِ خنک
کہیں پہ راہ میں سایہ اُگا کے رکھ سکتا

ترے لئے ہے مرے دل میں احترام بہت
فصیلِ جبر کے تو آہنی حصار میں ہے
تو رستہ پاٹ رہی ہے کسی کی منزل کا
تجھے تو اپنی بھی مرضی پہ اختیار نہیں
ستارے عرش سے نوچے گئے ترے، تاکہ
تجھے مقامِ سفر کا بھی کچھ پتا نہ چلے

اے میری ناقۂ جاں! اس کڑی تمازت میں
ترے لئے میں کروں بھی کیا کروں آخر؟
نحیف جسم کا اک سایہ ہے سو حاضر ہے
بجائے آب یہ اشکِ رواں بھی حاضر ہیں
لبوں پہ میرے دعائیں ہیں اور اک خواہش
فصیلِ جبر سے تجھ کو رہائی مل جائے
خود آپ اپنی تو منزل کا انتخاب کرے
زمیں کا حسن سبھی تیری دسترس میں ہو
ستارے عرش کے رستے کی تیرے گرد بنیں
تجھے جہاں میں حقیقی مقام مل جائے
وہی خدا کے خلیفہ کی شان مل جائے

❍

## اک اور پت جھڑ!

(۲۰۱۱ء کے نام)

پروین شیر
(کینیڈا)

مدتوں سے کھڑا ہے یہاں
اک پرانا شجر
اس کی ٹہنی کو تھامے ہوئے
آج پھر
زرد رو ایک پتہ لرزتا ہوا
ٹوٹ کر گر رہا ہے گئی رت کے خاشاک پر!
اس کے بوڑھے خمیدہ بدن پر ہیں
سوکھی رگوں کی جو پگ ڈنڈیاں
لے کے جاتی ہیں ماضی کی دہلیز پر
اس کی لرزش کی آہٹ میں ہیں
ان گنت داستاں کے اُفق
جن پہ ہے آنسوؤں اور خوشی کی دھنک
سلسلہ ہے یہی
اس شجر کی لچکتی ہوئی شاخ سے
ٹوٹ کر پھر سے گر جائے گا
خشک پتوں کے انبار پر
دوسرا زرد رو برگ
پھر سے کہے گا وہی داستاں!!

○

## ایک نظم

(صلاح الدین پرویز کے لئے)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(بہار، بھارت)

استعارہ کے بگولے
روح کی پنہائیوں میں
کھو گئے ہیں۔۔۔
اب کسی تحریک پر
تم تال دے سکتے نہیں
ہاں تمہارے ناولوں میں
درد میں ڈوبی ہوئی
بچے جواں کی گونج
احساسات سے
دامن چھڑا سکتی نہیں
یاس کی تاریکیوں میں ڈوب کر
آنسو بجھا سکتے نہیں
راستے کے پیچ و خم سے
تم ہوئے آزاد اب تو
ہاں مگر زندہ رہو گے
شاعری سے!

○

## ''کتابیں پیار کرتی ہیں''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

کتابیں ساتھ رہتی ہیں
کسی بھی سمت جانا ہو، وہ استقبال کرتی ہیں۔۔۔
کہیں پہ غم کی بارش ہو، دلاسہ بڑھ کے دیتی ہیں۔۔۔
کہیں خوشیوں کے چرچے ہوں، بڑا مسرور کرتی ہیں۔۔۔
ہماری ہم سفر بن کر، ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔۔۔
تغافل پر ہمارے وہ، کبھی برہم نہیں ہوتیں۔۔۔
بدلتے تیوروں کو دیکھ کر، افسردہ رہتی ہیں۔۔۔
مگر بک شیلف پہ رکھی، ہماری راہ تکتی ہیں۔۔۔
توجہ پانے کو قاری کی، صفحے پھڑ پھڑاتے ہیں۔۔۔
قریب آنے پہ لگتا ہے، کہ جیسے وہ بلاتی ہیں۔۔۔
جونہی چھو لیں، ورق پلٹیں، تو یُوں تسکیں لٹاتی ہیں۔۔۔
کتابیں دوست ہوتی ہیں۔۔۔
کسی غم خوار مونس کی طرح، ڈھارس بندھاتی ہیں۔۔۔
ہمارے پونچھ کے آنسو، ہمیں مُسکاں لوٹاتی ہیں۔۔۔
بھلا کے بے رُخی اور کجروی، ہم کو مناتی ہیں۔۔۔
گلے ہم کو لگاتی ہیں، ہمیں جینا سکھاتی ہیں۔۔۔
ستارے اور جگنو کی طرح وہ جگمگاتی ہیں۔۔۔
کتابیں پیار کرتی ہیں۔۔۔!

○

## شاعر کا لختِ جگر

شوکت جمال
(ریاض، سعودی عرب)

میرے گھر میں تُو جو اے نورِ نظر پیدا ہوا
خوش نصیبی ہے تری، شاعر کے گھر پیدا ہوا
تیری بہنیں اور بھائی سب کے سب ہیں نابکار
ایک لشکر گو کہ تجھ سے پیشتر پیدا ہوا
ذوقِ شعر و شاعری بالکل کسی میں بھی نہیں
اُن میں سے ہر ایک بس جیسے صفر پیدا ہوا
باپ کے نقشِ قدم پر تُو چلے گا، ہے یقیں
میرے جیسا دیدہ ور، بارِ دگر پیدا ہوا
لوگ تیری شاعری سن کر کہیں گے برملا
میؔر پھر پیدا ہوا ہے، پھر جگؔر پیدا ہوا
چاہتے تو تھے مرے اغیار، تُو پیدا نہ ہو
پھر بھی یہ ہمّت ہے تیری تُو اگر پیدا ہو
میں بڑا حیران تھا اور سوچتا تھا بار بار
کس طرح یہ صاحبِ علم و ہنر پیدا ہو
آخرش عقدہ یہ کھولا ماں نے تیری ایک دن
کیا جتن کرنے پہ یہ جانِ پدر پیدا ہوا
پی گئی تھی گھول کر آزاؔد کی ''آبِ حیات''
تب کہیں گھر میں مرے تجھ سا پسر پیدا ہوا

○

# ہم ہی دہشتگرد ہیں

جہانگیراشرف
(برمنگھم، یوکے)

کابل کے دریاؤں سے
فاٹا کے کوہساروں تک
لیبیا کے صحراؤں سے
کشمیر کی آبشاروں تک
بصرہ کی درگاہوں سے
اقصیٰ کے میناروں تک
ہمارا خون ہی بہتا ہے
اور قاتل ہم سے کہتا ہے
تم بڑے بے درد ہو
تم دہشگرد ہو

مساجد پر مزاروں پر
مدارس پر تہواروں پر
گاؤں گوٹھ بازاروں پر
بچوں بوڑھوں بیماروں پر
خودکش حملے کراتا ہے
میزائل بھی برساتا ہے
پھر بھی غصے رہتا ہے
اور عالمی وحشی کہتا ہے
تم بڑے بے درد ہو
تم دہشگرد ہو

گوانتانا موبے میں
ہم کو وہ اسیر کرے
پاؤں میں زنجیر پہنائے
رُوح کی تکفیر کرے
عقائد کی ہنسی اُڑائے
دین کو بے توقیر کرے

اُبوغریب کے زنداں میں
ننگے جسم تسخیر کرے
جب فتح کا جشن مناتا ہے
تو ڈیڈ باڈی ڈانس کراتا ہے
پھر بھی خفا وہ رہتا ہے
اور تہذیب کا دشمن کہتا ہے
تم بڑے بے درد ہو
تم دہشتگرد ہو

سِکّوں کی جھنکاروں پر
وہ ہمیں نچاتا ہے
اسلحے کے انباروں سے
وہ ہمیں ڈراتا ہے
کبھی جہادی سبق پڑھاتا ہے
کبھی روشن خیال بناتا ہے
ہم اُسی راہ پر چلتے ہیں
جو راہ وہ دکھاتا ہے
پھر بھی نالاں رہتا ہے
اور ہم سے وہ کہتا ہے
تم بڑے بے درد ہو
تم دہشتگرد ہو

جب ہم میں ہمت طاقت زُور نہیں
علم و ہنر اور شعور نہیں
اُس کے زور کا توڑ نہیں
اور اپنی اس حالت کو بدلیں
اس پر کوئی غُور نہیں
پھر ٹھیک ہی وہ کرتا ہے
ٹھیک ہی فرماتا ہے
ہم بڑے بے درد ہیں
ہم ہی دہشتگرد ہیں

○

# ''موت آواز دے رہی ہے مجھے''

نندکشور وکرم

(دہلی، بھارت)

**یوں** تو اگر ہم تاریخ اُردو ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں کئی ایسے برگزیدہ و نامور شاعر مل جائیں گے جنہوں نے کثرتِ مے نوشی کی علت میں گرفتار ہو کر اپنے آپ کو موت سے ہمکنار کر دیا مگر اُن میں سے ہمارے دَور کے دو شاعر اسرار الحق مجازؔ اور نریش کمار شادؔ کو ہم نے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے شراب کے نشے میں چور، بدمست، لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے ہوئے کسی سڑک یا گلی میں بڑی ناگفتہ بہ حالت میں دیکھا ہے جنہوں نے ضرورت سے زیادہ شراب پی پی کر آخر اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا۔ ان کے بارے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ اس قدر بے تحاشہ اور اندھادھند شراب نہ پیتے تو شاید وہ طویل عمر تک زندہ رہتے اور اُردو ادب کو اپنی کئی مزید شاہکار تخلیقات سے سرفراز کرتے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں مجازؔ ایک ذہین اور باشعور شاعر تھے اور دنیائے ادب میں جلد ہی انہوں نے اپنی منفرد شاعری سے ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور آسمانِ شعر و ادب پر ایک درخشندہ ستارہ بن کر چمکنے لگے تھے۔ ان کے شعری مجموعے ''آہنگ'' کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی مگر دنیاوی معاملے میں انہیں محرومیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا جس کے کارن انہوں نے بے دریغ شراب پی پی کر اپنے آپ کو قبل از وقت موت سے دوچار کر لیا اور صرف ۴۶ سال کی عمر میں ۵ردسمبر ۱۹۵۵ کو لکھنؤ کے بلرام پور ہسپتال میں بڑی کسمپرسی کی حالت میں انتقال کر گئے اور دوسرے دن ہزروں سوگوار دوستوں عزیزوں، مداحوں اور پرستاروں کی موجودگی میں انہیں نشاط گنج کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

بلاشبہ ان کی قبل از وقت موت سے اُردو ادب ایک نامور شاعر سے محروم ہو گیا جس سے اُردو ادب کی کئی توقعات وابستہ تھیں۔ ورنہ ابھی اُن کے مرنے کے دن نہ تھے۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس شاعر پر سینکڑوں لڑکیاں دل و جان سے فریفتہ تھیں۔ جو اس کی شاعری پر اس قدر فریفتہ تھیں کہ وہ اُس کی شعری تخلیق ''آہنگ'' کو خود ہی نہیں پڑھتی تھیں بلکہ عید بقرعید پر سہیلیوں کو بطور تحفہ بھی دیا کرتی تھیں مگر افسوس ان میں سے ایک بھی ان کی رفیقِ حیات یا محبوبہ نہ بن سکی اور وہ دل میں ہزاروں ارمان لئے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ مگر اس کے لئے کون ذمہ دار ہے معاشرہ لڑکیاں یا خود مجاز؟

ہسپتال بھرتی ہونے سے ایک دن پیشتر شام کو مجاز اپنی باغ و بہار طبیعت کے مطابق اپنے دوستوں سے بذلہ سنجی میں مصروف رہے اور پھر کہا جاتا ہے کہ رات کے بارہ بجے کے قریب وہ اپنے چند ہم مشرب ساتھیوں کے ساتھ لال باغ کے ایک دیسی شراب خانے پر شراب لینے کی غرض سے پہنچے اور پھر کوئی دو تین گھنٹے اپنے ہم مشربوں کے ساتھ گلاس بھر بھر کر پینے میں منہمک رہے۔ اور جب وہ لگ بھگ بے ہوش ہو چکے تھے تو اُن کے ساتھی تین بجے کے قریب انہیں وہیں دکان کے آنگن میں چھوڑ کر گھر چلے گئے جہاں انتہائی سرد رات میں پڑے رہنے کی وجہ سے وہ نمونیہ اور فالج کا شکار ہو گئے۔ دکان کے مالک نے ایک قریبی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو اس نے ڈبل نمونیہ تجویز کیا۔ پھر دوپہر کے قریباً انہیں بلرام پور ہسپتال پہنچا گیا۔

ہسپتال کے ڈاکٹروں نے ڈبل نمونیہ کے مدنظر انہیں پینسلین کے انجکشن لگانے شروع کر دئے اور جب شام کو ہسپتال کے ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا تو اس نے تشخیص کیا کہ ان کے جسم کے داہنے حصے میں فالج کا اثر ہو گیا ہے۔ اور دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھئیے کہ ان تین دنوں میں ان کے گھر والوں نے ان کی کوئی خیر خبر نہیں لی کیونکہ نشے کی حالت میں گھر سے کئی کئی دن تک غائب رہنا ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ ان کے لئے معمول سا تھا۔ اس طرح کے میخواروں کے والدین اور عزیز ان کے گھر سے غائب ہونے یا کسی گلی کوچے میں بے ہوش ہو جانے کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد آ رہا ہے جواں مرگ شاعر نریش کمار شادؔ جو اکثر دہلی کے کسی کوچہ و بازار میں بدمستی یا بے ہوشی کے عالم میں پائے جاتے تھے۔ جن دنوں میں اولڈ سیکریٹریٹ میں پبلی کیشن ڈویژن کے ماہنامہ ''آج کل'' سے بطور مدیر معاون وابستہ تھا تو ایک دن جب ہم لوگ لنچ میں سیر کر کے واپس اپنے کمرے میں آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ شادؔ نشے کے عالم میں عرش ملسیانی صاحب کی کرسی پر براجمان اول فول بک رہے ہیں اور سامنے بوتل رکھی ہوئی ہے۔ خیر ہم نے بڑی مشکل سے انہیں وہاں سے ہٹایا۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ایک بار وہ بالکل ہمارے کمرے کے سامنے ہی میدان میں بے ہوش پائے گئے۔ تب عرش ملسیانی صاحب نے مجھے کہا کہ اسے تیمار پور چھوڑ آؤ۔ شادؔ اس وقت ایسی حالت میں تھے جیسے بے جان لاش ہوں۔ دو تین آدمیوں نے مل کر انہیں بڑی مشکل سے آٹو پر لادا اور میں انہیں چھوڑنے تیمار پور ان کے گھر لے گیا۔ کوارٹروں میں مَیں نے ان کے گھر کا پتہ پوچھا اور آٹو کو وہاں لے گیا۔ کوارٹر کے باہر شادؔ کی بیوی چارپائی پر بیٹھی کسی عورت سے محوِ گفتگو تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ شادؔ صاحب آٹو میں بے ہوش پڑے ہیں مگر وہ اس جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے کہنے لگی۔ ''لے آؤ''۔ میں نے اور آٹو والے نے بڑی دقت و دشواری سے شادؔ کو آٹو سے باہر نکالا اور اندر کمرے میں لٹا دیا۔ مگر اس کی بیوی کے دل میں اس کے لئے کوئی ہمدردی نہیں

تھی، وہ پاس کھڑی محوِ تماشا رہی۔ اور جب میں نے اُسے آٹو کو تین چار روپے کرایہ دینے کے لئے کہا تو اس نے بڑی بے دلی سے پیسے دیئے جیسے کہہ رہی ہو جب یہاں تک لائے ہو تو کرایہ بھی تم ہی دے دو۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے عادی میکساروں کے گھر والوں کے لئے ان کا گلی محلوں میں بدمست حالت میں گھومنا، بہکنا، لڑکھڑانا، بے ہوش ہو کر گر پڑنا عام سی بات بن کر رہ جاتی ہے۔ بہرحال کسی جان کار نے مجاز کو ہسپتال میں دیکھ کر ان کے گھر والوں کو اطلاع دی مگر جب تک گھر والے پہنچے ڈاکٹر ان کی زندگی سے مایوسی کا اعلان کر چکے تھے اور آکسیجن کے ذریعے ان کی سانس کی آمد و شد کو قائم رکھنے کی آخری کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

لیکن سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور مجاز کسمپرسی کی حالت میں اس دنیائے فانی سے رختِ سفر باندھ کر رخصت ہو گئے۔ حالانکہ اُن کی عمرابھی رخصت ہونے کی نہیں تھی مگر اُن کے ہم مشربوں اور ہم پیالہ و نوالہ ساتھیوں نے مل کر اُن کی زندگی کو موت کے منہ میں دھکیلنے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ لوگ سچ کہتے ہیں سنگت انسان کو خراب کر دیتی ہے اور مجاز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اُس کے ساتھیوں نے اسے شراب پلا پلا کر آخر اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ بے وقت موت سے دوچار ہو گئے۔ اور آسمانِ ادب کا یہ درخشندہ ستارہ وقت سے پہلے ہی غروب ہو گیا۔

لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ مجاز فطری موت نہیں مرے تھے بلکہ کثرتِ شراب نوشی، لا اُبالی پن، غیر منضبط زندگی نے انہیں وقت سے پہلے ہی موت کی آغوش میں دھکیل دیا تھا، تو غلط نہ ہوگا۔ حقائق کے مطالعہ سے بھی ہم پر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ مجاز مرے نہیں تھے بلکہ انہوں نے خودکشی کی تھی اور اس کا ذمہ دار کون تھا مجاز، سماج، حالات یا ان کے سنگی ساتھی؟

میرا خیال ہے کہ اس کے لئے اُن کی زندگی کے واقعات و حوادث پر ایک نظر ڈالیں تو یہ بات ہم پر پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

مجاز جنہیں اُردو شاعری کا جان کیٹس کہا جاتا ہے، ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود تبلیغ اور پروپیگنڈے سے دُور دُور رہے۔ دوسرے کئی ترقی پسندوں کی طرح اُن کی شاعری کا محور بھی حسن و عشق رہا۔ تاہم اُن کی ابتدائی نظموں میں بھی سرکشی اور بغاوت کی بجلی کوندرہی تھی۔ اُنہوں نے عورت کو بھی انقلاب اور بغاوت کی راہ دکھائی۔

مجاز تعلیم کی تکمیل کے بعد زندگی کی جدوجہد میں جُٹ گئے۔ شاعری نے انہیں بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا مگر دنیاوی معاملات میں وہ بھٹک گئے۔ لا اُبالی پن، بے راہ روی کثرت شراب نوشی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔

جہاں ملازمت کی وہاں ٹک نہ سکے۔ انہوں نے ملازمت ترک کی یا انہیں نکالا گیا؟ جو بھی ہو۔ اس کا اُن کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔

۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے دہلی آ کر آل انڈیا ریڈیو کے ماہنامہ ''آہنگ'' سے دو سال تک وابستہ رہے۔ مگر پھر انہیں اس سے الگ کر دیا گیا۔ شاید اُن کے لا ابالی پن، غیر انضباطی رویے اور شراب نوشی اس کی وجہ ہو، تاہم ان کے بعض محققین کا کہنا ہے کہ وہ بخاری برادران کے صوبائی تعصب اور تانا شاہی کے کارن وہاں نہیں ٹک سکے؟ مگر یہ کوئی نیا الزام نہ تھا یہ الزام تو اکثر غیر پنجابی ادباء و شعراء بخاری برادران خصوصاً پطرس بخاری پر لگاتے رہے ہیں کیونکہ اُن کے عہد میں پنجاب کے جتنے بھی نامور اور ممتاز شعراء و ادبا تھے سارے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ تھے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، اپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی......اُن دنوں سبھی کی آماجگاہ یہی آل انڈیا ریڈیو دہلی ہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ معروف ادیب اور ماہنامہ ساقی کے مدیر ''شاہد احمد دہلوی نے بھی اس سلسلے میں ریڈیو کے سربراہ کو شکایت کی تھی اور پطرس بخاری سے جواب بھی مانگا گیا تھا مگر جب بخاری صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ نے دوست نوازی کی بنا پر پنجاب کے سارے دوست ادیبوں کو یہاں کیوں اکٹھا کر لیا ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا۔ مَیں یہاں اپنے دوست نہیں تو کیا اپنے دشمنوں کو یکجا کرتا کہ نہ تو وہ خود کام کرتے اور نہ مجھے کرنے دیتے۔

اس ملازمت کے جانے کا مجاز کو بے حد صدمہ ہوا۔ مایوسی اور ناکامی کی حالت میں وہ دہلی سے مجبوراً لکھنؤ چلے گئے مگر اس واقعے سے ان کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا اور اس غیر معمولی ذہنی اذیت کا اظہار انہوں اپنی طویل نظم ''دلی سے واپسی'' میں یوں کیا ہے:

رخصت اے دلی! تری محفل سے اب جاتا ہوں مَیں
نوحہ گر جاتا ہوں میں، نالہ بہ لب جاتا ہوں
یاد آئیں گے مجھے تیرے زمین و آسماں
رہ چکے ہیں، میری جولاں گاہ تیرے بوستاں

کیا کہوں کس شوق سے آیا تھا تیری بزم میں
چھوڑ کر خلدِ علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں
کتنے رنگیں عہد و پیماں توڑ کر آیا تھا مَیں
دل نوازانِ چمن کو چھوڑ کر آیا تھا مَیں

دل شکستہ مجاز دہلی سے لکھنؤ پہنچے۔ گھر کے حالات بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ والد ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں گھر میں بیکار بیٹا کیسا لگتا ہوگا۔ ہم سبھی جانتے ہیں؟ شاید انہوں اپنے آپ کو نئے حالات میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی۔ مگر بے سود۔

پھر وہ لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایم اے کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے، مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ اور انہوں نے اپنی پڑھائی منقطع کر دی۔ اسی دور میں ترقی پسند رسالہ ''نیا ادب'' منظرِ عام پر آیا جس کے مدیران سردار جعفری اور سبطِ حسن کے ساتھ وہ بھی شامل تھے۔

۱۹۴۱ء میں ان کی دماغی حالت ٹھیک نہ رہی لیکن رو بہ صحت ہونے

پر وہ دہلی آکر پبلی کیشن ڈویژن میں بطور لائبریرین کام کرنے لگے مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر نہ تک سکا۔اور۱۹۴۴ء میں یہ ملازمت بھی چھوٹ گئی۔

نوکری نہ رہنے کا ایک اور جھٹکا۔ مایوسی اور ناکامی نے انہیں اندر سے شاید توڑ دیا۔اور پھر عشق کے میدان میں بھی انہیں منہ کی کھانی پڑی۔محبوبہ چند جلوے دکھا کر اوجھل ہوگئی۔وہ محبوبہ جس کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا:

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں! کس سے محبت ہے
مَیں جس دنیا میں رہتا ہوں، وہ اُس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے ، پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں،گہر افشانیاں اس کی
وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے،ماہِ طلعت ہے
میرا ایماں ہے،میری زندگی ہے ،میری جنت ہے
میری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اس کی

اُس کی تابانیوں نے مجاز کی آنکھوں کو خیرہ ضرور کیا مگر اس کے بعد وہ ان سے دور ہوگئی کیونکہ وہ ایک ایسی امیر زادی کے دامِ عشق میں گرفتار ہوئے تھے جس کا ملنا کارِ دشوار تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس شعلہ رو نے مجاز کو جھلسا تو دیا لیکن اس کی جلن پر مرہم رکھنے کو راضی نہ ہوئی۔دراصل وہ خاتون ایک امیر تعلیم یافتہ اور اعلیٰ خاندان کی لڑکی تھی۔اگرچہ وہ پردے کی پابند نہیں تھی مگر وہ مجاز کے عشق کی پینگ کو اتنا زیادہ بڑھنے کی اجازت کیسے دے سکتی تھی کہ بالآخر رفیقِ حیات بننے کی نوبت آجائے۔وہ کچھ مدت آنکھ مچولی کا کھیل کھلتی رہی پھر اچانک اس سے دور ہوگئی......اور مجاز عشق کے اس کاری صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔

زندگی میں تین بار مجاز دماغی بیماری کا شکار ہوئے اور ایک بار تو رانچی کے پاگل خانے میں بھی رہے۔

عصمت چغتائی کے الفاظ میں گرلز کالج میں مجاز کے نام کی لاٹریاں ڈالی جاتی تھیں اور اس کے اشعار تکیے کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے اور کنواریاں اپنے مستقبل میں ہونے والے بیٹوں کے نام اسی کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں، نہ جانے کس ارمان کے بدلے میں۔۔۔؟

ہوسکتا ہے کہ اس میں عصمت نے کچھ مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہو؟ مگر کچھ حد تک ہو بھی سکتا ہے۔مگر وہ مجاز کی نہیں اس کی شاعری کے سحر میں گرفتار تھیں ۔جیسے لوگ اداکاروں اور فنکاروں کے فن کے گرویدہ و پرستار ہوتے ہیں؟ عملی زندگی میں ان کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔اور وہ زمانہ ایسا نہیں تھا کہ لڑکیاں کھلے طور پر اپنے عشق کا اظہار کریں۔اور ان دنوں لومیرج تو شاذ و نادر ہی ہوا کرتی تھی بلکہ والدین کی مرضی کی شادیاں ہوا کرتی تھیں۔اور کسی لڑکی میں جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ماں باپ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرے۔ساحر لدھیانوی کو بھی اس کا احساس تھا تبھی تو اُس نے کہا تھا:

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

اور اگر بالفرض کوئی لڑکی مجاز سے شادی کے لئے تیار بھی ہوتی تو کیا کوئی والدین اپنی دخترِ ارجمند کی شادی کسی بے روزگار، شراب کی علت میں گرفتار سے کر دیتے۔نہیں ہرگز نہیں۔

مجاز کی موت ایک عظیم سانحہ ہے۔جس میں صرف شراب کا ہی دخل نہیں ہے بلکہ اس کے ہم مشرب دوستوں کا بھی ہے جو اُس اس کی بذلہ سنجی اور شاعری کی وجہ سے اسے پلاتے تھے۔وہ جانتے تھے کہ شراب نوشی اس کے لئے زہر ہلاہل ہے مگر اس کے باوجود وہ اسے پیہم پلاتے رہے......

''ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟''

ناکامیوں اور مایوسیوں نے مجاز کو زندہ در گور کر دیا۔وہ جیتے جی مر گئے۔اور زیادہ سے زیادہ شراب پینے لگے اپنی ناکامیوں اور مایوسیوں کو بھلانے کے لئے۔

اور پھر......ملازمت کے میدان میں بھی اُنہوں نے مسلسل ناکامی کا منہ دیکھا۔

وہ چاہتے تھے اُن کا اپنا گھر بار ہو۔اُن کی ایک بیوی ہو، بچے ہوں مگر افسوس جس شخص پر بے شمار لڑکیاں جان دیتی تھیں اور جس سے شادی کرنے کی آرزو رکھتی تھیں کوئی بھی آگے نہ بڑھی کہ اس کا ہاتھ تھام لے۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے بے اندازہ شراب کا استعمال شروع کر دیا اور آخر اس نے اس کی جان لے لی۔

اگر ان ناکامیوں اور محرومیوں کی وجہ سے شراب کا سہارا لینے کے بجائے اُنہوں نے اس سے اپنے تخلیقی جوہر نمایاں کرنے میں صرف کیا ہوتا تو شاید آج اس نے ہمیں ''آوارہ'' ایسی کئی شاہکار نظمیں عطا کی ہوتیں مگر اس کے بجائے وہ زہر کی صورت میں شراب کے جام اپنے اندر انڈیلتا رہا جنہوں نے سمِ قاتل بن کر اسکی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا۔

ان دنوں کی مجاز کی ناگفتہ بہ حالت کا نقشہ عصمت چغتائی نے بعد ازاں ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:۱۹۴۴ء میں اچانک ریڈیو اسٹیشن پر ملے۔یہ وہ زمانہ تھا کہ مجاز کا ستارۂ شاعری ڈوب چکا تھا۔ریڈیو اسٹیشن پر کوئی مشاعرہ تھا۔تمام شعراء تو موجود پر آپ نہ جانے کہاں غائب؟ شکر ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے لوگ آپ کو سمیٹ لائے اور کرسی پر ٹکا دیا۔اب حلیہ ملاحظہ ہو۔میلا چست پاجامہ کان میلیا جیسا۔اس پر بے ٹکا سا اوور کوٹ۔گلے میں چیکٹ مفلر اور......واہ! مائیکروفون پر جا کر نہ جانے کیا اول فول بکنے لگے۔کلیجے میں آتش لاوے کی طرح کھول رہا تھا۔آنکھوں کی پتلیوں کو قرار نہ تھا۔ایک پاؤں زمین پر تو دوسرا آسمان پر۔کبھی ایک دائیں تو دوسری بائیں کونے میں۔ایک ہاتھ مشین کی سی رفتار سے بالوں کی ایک ریت آلود لٹ کو بار بار کنپٹی پر سے اُٹھائے جا رہا تھا۔اور وہ

بے حیائی سے گرے جا رہی تھی۔اب خوش الحانی شروع۔اللہ جانے کیوں اور کیا بکنا شروع کیا۔بیچ بیچ میں دانت بھینچ کر کیا لیکچر دیتے تھے۔ٹہلتے ہوئے مائیکرو فون سے دُور نکل گئے۔واپس لانے پر بگڑ کر بیٹھ گئے۔

کیا ایسے شخص کو کوئی ریڈیو افسر یا عام مشاعرے کا ناظم برداشت کرے گا کہ کوئی شاعر چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، آ کر اس میں ہڑبونگ مچا دے؟ سنا ہے کئی بار ایسا ہوا۔ساحر نے ایک بار بمبئی کے فیمس سینے لیبارٹری کی کینٹین میں مجھے اور مرحوم اظہار ملیح آبادی کو بتایا تھا کہ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن پر جب مجاز کا نام پکارا گیا تو معلوم ہوا کہ مجاز غائب ہیں۔ بقول ساحر وہ انہیں ڈھونڈنے گئے تو وہ کینٹین میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ساحر بڑی مشکل سے اسے ریڈیو اسٹیشن لائے مگر وہ آنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔

درحقیقت مجاز اپنے آپ کو سماج کے مطابق بنانے کے اہل نہیں رہے تھے اور سماج کے لئے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی فرد کے خیالات وافکار کے مطابق خود ڈھل جائے؟ انہیں ملازمتیں بھی ملیں لیکن وہ ان کی پابندیوں اور انضباط کے دائرے میں نہ رہ سکے۔اور اپنی بے قاعدگی اور لا اُبالی پن کی وجہ سے ان کی خلاف ورزی کرتے رہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملازمت کے میدان میں ناکام ہو گئے۔کیونکہ ہمارے معاشرے......ہمارے سماج میں آپ کی لیاقت اور علمیت وفضیلت سے عزت نہیں ہوتی بلکہ اس سے ہوتی ہے کہ آپ کیا کماتے ہے اور آپ کے پاس کتنا پیسہ ہے۔اگر آپ ایک عظیم شاعر ہیں تو اپنی جگہ۔سماج کو اس سے کیا لینا؟ اگر کوئی پوچھے کہ آپ کیا کرتے ہیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ شاعری یا افسانہ نویسی کرتے ہیں بلکہ یہ جواب دینے پر وہ یہی پوچھے گا کہ ارے بھئی کام کیا کرتے ہو؟ آپ کے جانکاروں یا رشتہ داروں کے نزدیک افسانہ نویسی یا شاعری کوئی کام نہیں۔اس لئے بڑا شاعر ہونے پر بھی مجاز اس میدان میں ناکام رہے کیونکہ ان کے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔اور ایک حد تک وہ سماج کی نظر میں آوارہ، بے روزگار اور حد سے زیادہ پینے والے میخوار تھے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ صرف ۴۶ سال کی عمر میں مجاز اس دنیا سے رخصت ہو گئے جبکہ ان کی مرنے کی عمر نہ تھی۔لیکن مجاز کو معلوم تھا کہ جلد ہی موت سے وہ گلے ملنے والے ہیں تبھی تو انہوں نے بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا:

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر واعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں میں
موت آواز دے رہی ہے مجھے

شاید موت نے انہیں آواز نہیں دی تھی بلکہ اُنہوں نے موت کو خود لبیک کہا تھا اور آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تھا اور وہ مرے نہیں تھے بلکہ کثرت مے نوشی سے انہوں نے اپنی صحت کو بگاڑ کر ایک طرح سے خودکشی کر لی تھی۔

☆

## فضائے زندگی

ہے دل کی وادیوں میں جب سے اُن یادوں کی آہٹ سی
فضائے زندگی میں دُور تک ہے جگمگاہٹ سی

اگر خاموش سے ہونٹوں پہ بکھرے ہیں کئی نغمے
کسی کی مست آنکھوں میں بھی ہے اک گنگناہٹ سی

بسا اوقات دل میں رقص کرتی ہے ہر اک لمحہ
کبھی ماضی کی پُروائی کبھی فردا کی آہٹ سی

زبانِ خامشی میں ہو کہ نظروں کے اشاروں میں
ہو کوئی بات بھی اُس کی، ہے اُس میں کھلکھلاہٹ سی

دلِ افسردہ کیا ہے رُوح تک سرشار ہو جائے
وُہ نغمے چھیڑ دیتی ہے کسی کی مسکراہٹ سی

کسی کی یاد جب بھی دل سے ہم آغوش ہوتی ہے
مرے جذبات میں ہوتی ہے اکثر سنناہٹ سی

یقیں سے کہہ نہیں سکتا کہ کب تک انقلاب آئے
مگر محسوس ہوتی ہے بڑی شدت سے آہٹ سی

ہیں نغمہ ریز اُن نظروں سے مل کر یہ مری نظریں
کہ جیسے گلستاں میں پنچھیوں کی چہچہاہٹ سی

یہ دُنیا ہے جنابِ عرشؔ اس کا ظرف کیا کہئے
اسے حق بات سے ہوتی ہے اکثر تلملاہٹ سی

عرش صہبائی (جموں کشمیر)

# ورثہ

## ''کھڑیا گلاب''

### سینہا

جے کڑیئے تُوں
حیاتی والے جوڑے اندر
پھُل سجانا چاہویں
تاں
اتھری ٹہنی اُتّوں لاہ کے
کھڑیا گلاب سجا
بندا کھیاں
تے بند بلھیاں دے
پھُلاں نیں تاں
کوئی گل نہیں ترے سنگ کرنی
اونہاں تاں اڑیئے
ساری حیاتی
چُپ دی بُکل مار کے رہنا ایں
جے کڑیئے تُوں
میری گل نہیں منّی
میرے اکھراں توں پروان نہ کیتا
تاں ویکھ لویں
اونہاں
بندا کھیاں تے بند بُلھیاں دے پھُلاں وانگ
ساری حیاتی
تُوں وی کڑیئے
کِھڑ کِھڑ ہسلوں
سکدی رہیں گی

حنیف باوا (جھنگ)

### سورج مُکھی

جے غالبؔ دے شعر نوں سچا
من لیئے تاں
فِرنئیں بھُل
خشا منڈیاں دی
ڈھیری وچوں
نکلیا ہوسی
ایدا پھُل

○

### اِک منظر نامہ

باہر اُلانی منجی اُتے
پچھلی صدی دا اِک کیلنڈر
مڑیا تڑیا، کھول ریا سی
ساہ دیاں گنڈاں
اَخ تھُو، اَخ تھُو، اَخ تھُو،
اندر نقشی صوفے اُتے
نویں صدی دے وزٹنگ کارڈ
چہک رہے سن، مہک رہے سن
چاروں پاسے کھلری ہوئی سی
ساہواں دی خشبو

○

نورزمان ناوک
(تلہ گنگ)

# ''اے محبت زندہ باد''

دنیا کا ہر دن، ہر تاریخ، ہر مہینہ اور ہر سال کسی نہ کسی حوالے سے اہمیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔گیارہ دسمبر دو ہزار گیارہ اس حوالے سے اہم ترین دن ہے کہ برصغیر کے نامور اور سدا بہار اداکار یوسف خاں المعروف دلیپ کمار اس جہانِ ناپائیدار میں اسی دن پیدا ہوئے تھے۔ دلیپ کمار نے جس قدر معیاری اور منتخب فلموں کے ذریعے اداکاری کا اک نیا اسکول آف تھاٹ قائم کیا وہیں شہرت و ناموری کو جس قدر اونچائی اور استقامت سے تھامے رکھا اُس کی مثال ملنا انتہائی مشکل ہے۔یوں تو ہر سال دلیپ صاحب کی سالگرہ پر اُن کی اداکارہ بیگم سائرہ بانو خاص اہتمام کیا کرتی ہیں۔اس بار گیارہ، گیارہ کے حوالے سے سائرہ بانو کے علاوہ پورے بالی وُڈ نے اپنے دور کے نابغہ روزگار اداکار کی سالگرہ کو یادگار بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔چونکہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے اس اہم تقریب کو دلیپ صاحب کے پرستاروں تک اُس طریقے سے نہیں پہنچایا جس طرح دلیپ صاحب کا حق اور اُن کے پرستاروں کے اشتیاق کا تقاضا تھا۔ذیل کی سطور میں ہم نے ''تخلیقی وجدان'' کو بروئے کار لاتے ہوئے سالگرہ کی اس اہم اور دلپزیر تقریب کی تمثیل آپ تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔اس کوشش کو اہلِ فن کس نظر سے دیکھتے اور اسے ادب کی کس صنف اور خانے میں سجاتے ہیں، یہ وہ بہتر جانتے ہیں۔۔۔

**گلزار جاوید**

بظاہر یہ خوبصورت، دیدہ زیب اور کشادہ ہال ایک نظر میں دیکھنے والے کو فوری طور پر اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے۔جس قدر آسانی سے اس کی خوبصورتی اور سج دھج دیکھنے والوں کے دلوں کو موہ رہی ہے، اُس قدر یہ کام سادہ، سہل اور آسان نہ تھا۔اس اہم تقریب کی تیاری کے لیے چنیدہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جو اس ہال کے در و دیوار کے خوبصورت رنگوں، میچنگ پردوں، قیمتی فرنیچر اور دیدہ زیب آرائش و زیبائش کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے ماضی کی نامور اداکارہ سائرہ بانو کی رہنمائی میں شب و روز محنت اور جستجو میں مصروف رہی ہے۔اس خاص اور اہم تقریب کی تیاری میں کس قدر محنت، وقت، وسائل اور احباب کا تعاون شاملِ حال رہا وہ الگ موضوع ہے، اُس کا بیان بجائے خود مفصل تحریر کا متقاضی ہے۔اس یادگار دن کو دلیپ صاحب کے شایانِ شان اور پُر وقار بنانے کے لیے شبانہ روز محنت کے باوجود آخری دن یعنی تقریب سے کچھ دیر قبل تک سائرہ بانو اور اُن کے تکنیکی و تخلیقی شرکائے کار فرنیچر کی سیٹنگ، پھولوں کا انتخاب، مشروبات و فوکہات کی ترتیب و پیشکش کیک کے ڈیزائن، سائز پر تبادلہ خیال کے علاوہ کراکری، کٹلری، آرکسٹرا اور مہمانوں کے استقبال کے حوالے سے متحرک دکھائی دے رہے ہیں۔

دلیپ صاحب کے چاہنے والوں کی محنت و لگن کے باعث سالگرہ کی تقریبِ سعید کا وقت آن پہنچا ہے۔سائرہ بانو نے فٹنس اور فگر کو برقرار رکھتے ہوئے وقت کے بے رحم تھپیڑے کو خود سے دُور رکھنے کی کوشش میں کامیاب نظر آ رہی ہیں۔کالے رنگ کی ساڑھی کے ساتھ ہلکے سلیٹی رنگ کے بلاؤز اور سلور کلر کے سینڈل میں اُن کا حُسن دیکھنے والے کی آنکھ کو حیران کر رہا ہے۔دلیپ صاحب نے گہرے نیلے رنگ کے سوٹ کے ہمراہ، ہری اور نارنجی لائنوں کے ساتھ نیوی بلو رنگ کی ٹائی سفید قمیض کے اوپر باندھی ہوئی ہے۔دلیپ صاحب کی خواہش ہے کہ وہ وقتِ مقررہ پر ہال کے مین گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر آنے والے ہر مہمان کا خود استقبال کریں۔دلیپ صاحب کے بلند مقام، طویل عمری اور ناسازیٔ طبع کے پیشِ نظر استقبالیہ کمیٹی دلیپ صاحب سے درخواست کرتی ہے کہ وہ تقریب کی ابتداء سے ہال کے دروازے پر کھڑے ہونے کے بجائے کم و بیش نصف مہمانوں کی آمد کے بعد ہال میں داخل ہو کر مخصوص کُرسی پر تشریف رکھیں۔مہمان خود آ کر باری باری دلیپ صاحب سے ملیں گے تو اس طرح مہمانوں کو دلیپ صاحب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے اور گفتگو کرنے کا موقع میسر رہے گا۔

لیجیے جناب! مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ استقبالیہ کمیٹی سائرہ بانو کی سربراہی میں آگے بڑھ کر ہر مہمان کا خوش دلی سے استقبال کر رہی ہے۔ سائرہ بانو مہمانوں سے ہاتھ ملا کر اور HUG کر کے اُن کا حال احوال دریافت کرتی اور مہمان کو ساتھ لے کر اُن کی منتخب جگہ پر بٹھا کر دوسرے مہمان کے استقبال میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ مہمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہیلو، ہائے، نمستے، آداب، السلام علیکم کے آوازوں میں دھیمی دھیمی گفتگو اور بلند قہقہے محفل کو روایتی رنگ دینے لگے ہیں۔ ہر چند مہمان ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف ہیں مگر ہر کوئی باری، باری دلیپ صاحب سے ملنے اور گفتگو کرنے کا آرزومند ہے۔

جوں ہی دلیپ صاحب امیتابھ بچن، ابھیشک بچن، جیا بہادری، دھرمیندر اور ہیما مالنی کے ہمراہ ہال میں داخل ہوتے ہیں تو اُن کا استقبال پھول نچھاور کر کے کیا جاتا ہے جو پہلے سے تمام شرکائے محفل کی میزوں پر دستیاب ہیں۔ پس منظر میں دلیپ صاحب کی فلم ''رام اور شام'' کے گیت

بار بار دن یہ آئے، بار بار دل یہ گائے

تم جیو ہزاروں سال، یہ میری ہے آرزو

کی دھن آرکسٹرا پر سنائی دے رہی ہے۔ شرکائے محفل زبان اور ہونٹ ہلا کر گانے میں شریک ہوتے ہیں اور تالیاں بجا کر دلیپ صاحب کا استقبال کرتے ہیں۔

امیتابھ بچن: Attention Please!، آج کی اس خاص محفل کے بہت ہی خاص مہمان، یوسف بھائی عرف دلیپ کمار صاحب کی خواہش ہے کہ سالگرہ کی تقریب شروع کرنے سے پہلے اُن تمام فنکاروں کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی جائے جو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں (شرکائے تقریب اپنی اپنی کُرسیوں سے کھڑے ہو کر ایک منٹ کی خاموشی اختیار کرتے ہیں جس کے فوری بعد دھرمیندر آگے بڑھ کر دلیپ کمار کو سالگرہ کی مبارک باد دیتے ہیں تو دلیپ کمار اُنہیں سینے سے لگا لیتے ہیں)

دلیپ کمار: میرا دھرم، میرا ایمان، میری جان (دھرمیندر کا ماتھا چومتے ہوئے)

دھرمیندر: میں تو آپ کے قدموں کی خاک ہوں (دلیپ کمار کے گھٹنے کو ہاتھ لگانے کی کوشش)

دلیپ کمار: جب جب میں تمہیں دیکھتا ہوں نا دھرم! مجھے راجندر یاد آ جاتا ہے، کس قدر خوبصورت جملہ کہا تھا ظالم نے ''گھر ہو یا اسٹوڈیو، دونوں جگہ پُوجا کرتا ہوں''، تم بھی جس محنت اور لگن کے ساتھ نصف صدی سے انڈسٹری کی خدمت کر رہے ہو یہ بھی تو ایک طرح کی پوجا ہی ہے۔

امیتابھ: آپ درست فرما رہے ہیں یوسف بھائی (الفاظ چبا کر) فرق صرف اتنا ہے کہ راجندر بھیّا، دیوتاؤں کے پجاری تھے اور اپنے دھرم پھاجی (پوز دے کر) دیویوں کے پجاری ہیں، شما چاہتا ہوں (دھرمیندر کی جانب دونوں ہاتھ جوڑ کر، ہیما مالنی سے داد چاہتے ہوئے)

دھرمیندر: امیت! اگر تم نے یش کی فلم ''وقت'' دیکھی ہوتی تو تم یہ بات کبھی نہ کرتے!

امیتابھ: کیوں جی! ''وقت'' فلم میں ایسی کیا خاص بات ہے؟

دھرمیندر: ''جن کے گھر شیشے کے ہوتے ہیں، وہ دُوسروں کے گھروں پر پتھر نہیں مارتے''۔

امیتابھ: دھرم پھاجی، آپ بھی کمال کرتے ہیں! کہاں آپ کے محل دو محلے، کہاں غریب کی کٹیا (کن آنکھیوں سے ریکھا کی جانب دیکھتے ہوئے)

شتروگھن سنہا: دھتّو! اری او دھتّو! اری کا کرت ہو بھوجائی (سوناکشی کا ہاتھ تھامے ہوئے ہال میں داخل ہو کر سائرہ بانو کو تلاش کرتے ہیں) او ہمار بھیّا نظر نہیں آوت ہیں؟

دلیپ کمار: ارے، ہم ادھر ہیں رے منّا (شترو دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیم بجالاتے ہیں) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ پکّے پکّے سیاست دان بن گئے ہیں!

شتروگھن سنہا: وجہ؟

دلیپ کمار: بھئی دیکھو نا! ہمارے گھر آتے ہو تو سائرہ کو دھتّو کہہ کر پکارتے ہو، ہیما جی کے گھر جاتے ہو تو اُنہیں دھنّو کہہ کر مخاطب کرتے ہو، دریافت کرنے کی بات یہ ہے کہ جینتی مالا کے گھر جا کر آپ کیا کہتے ہیں؟

شتروگھن سنہا: میرا تو خیال تھا (گردن گھما کر سوناکشی کو دیکھتے ہوئے) یہ فہرست بہت دُور تک جائے گی (قہقہے کے بیچ سلمان خان آ کر دلیپ صاحب کے گھٹنے چھوتا ہے)

دلیپ کمار: سلمان خان، کامیابی کی ضمانت، ہیروئنوں کی جان! کیسے ہو سلّو؟ تمہاری والدہ نمبر دو ہیلن جی اور سلیم میاں کو دیکھ کر ہمارا خیال تھا کہ تم نہیں آسکو گے!

سلمان خان: (پھر سے دلیپ صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر) یہ کیسے ہو سکتا ہے سر، آپ یاد کریں اور میں نہ آؤں!

دلیپ کمار: ارے یہ تم نے کیا سر، سر کی رٹ لگا رکھی ہے، سیدھے سیدھے انکل کیوں نہیں بولتے!

سلمان خان: ارے سر! آپ کا یہی تو کمال ہے کہ آپ نے، کل ہونے ہی نہ دی، ہمیشہ آج کو زندہ رکھا ہے، صرف آج کو (مکّا بنا کر)

دلیپ کمار: شریر کہیں کا (سلمان کا گال تھپ تھپا کر)

دھرمیندر: شریر نہیں یوسف بھائی، شیطان کہیے، شیطان! بلکہ مہا شیطان (کترینہ کیف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) کیوں کترینہ! تمہارا کیا خیال ہے؟ (ویرو کی آواز نکال کر)

ریکھا: NOT AGAIN, NOT AGAIN یہ فاؤل ہے، اپنی باتوں میں ہمیں مت گھسیٹیے، پلیز!

سلمان خان: دھرم پھاجی! شِششوں کے لیے آپ کے منہ سے ایسے شبد، اچھے نہیں لگتے (والد سلیم خان کی طرف پیٹھ کر کے دھیمی آواز میں)
دھرمیندر: یار! ہم تو خود یوسف بھائی کے شِشیے ہیں، ہم کسی کو کیا شِشیے بنائیں گے!
وحیدہ رحمٰن: یہ اُستاد، شاگرد کی تکرار اسی طرح جاری رہی تو سالگرہ کی محفل، علی بابا چالیس چور کی ٹولی بن جائے گی!
گوندہ: Correct, Hundred & One percent Correct (مخصوص ڈانسنگ انداز میں)
عامر خان: زیادہ بڑھ، بڑھ کے مت بولو چیچی بھیا، آپ بھی کوئی چھوٹے فنکار نہیں!
گوندہ: تمہاری جان اگر بھینس کا دودھ برداشت کر سکتی تو ہم یہ ضرور پوچھتے، کہ بھیا! ہم نے آپ کی کونسی والی بھینس چرائی ہے؟
سلمان خان: بھینس تو تب چراتے نا جب رانی کھیت کی گولیاں کھانے سے فرصت ہوتی (رانی مکھر جی ہڑ بڑا کر لباس درست کرنے لگتی ہے)
گوندہ: یہ لو! چھاج تو چھاج، چھلنی بھی بولنے لگی (ناک سے باریک آواز نکال کر)
دلیپ کمار: بھئی اس طرح کے الفاظ، کم از کم تمہارے منہ سے بھلے نہیں لگتے، عامر خان کو معمولی مت سمجھو، اس نے اتنی چھوٹی عمر میں بڑی بڑی کامیابیاں سمیٹی ہیں۔
شاہ رُخ: سر! سر (ہال میں داخل ہوتے ہوئے) ڈائیلاگ اس طرح نہیں ہے!
دلیپ کمار: تو پھر آپ بتلا دیجیے! کس طرح ہے ڈائیلاگ (ہاتھ کے اشارے سے شاہ رُخ کو مخاطب کرتے ہوئے)
شاہ رُخ: اونہہ، ہوں، میں، میرے خیال میں (دونوں ہاتھ پھیلا کر اٹکتے ہوئے) ڈائیلاگ، کچھ اس طرح ہونا چاہیے (منہ سکوڑتے ہوئے سوچتا ہے) آں آں آں ''بڑی سی عمر میں، چھوٹے سے قد میں، موٹی موٹی کامیابیاں، کیسے سمیٹیں'' (کرن راؤ کی طرف دیکھ کر انجان بنتے ہوئے)
عامر خان: سر تو، ڈائیلاگ کے بادشاہ ہیں، جو بھی کہو گے، فٹا فٹ بول دیں گے، پر تمہاری طرح بریک کہاں سے لائیں گے (زور کا قہقہہ، کچھ لوگ تالیاں بھی بجاتے ہیں، شاہ رُخ کھسیانا ہو کر سائرہ بانو کی جانب چل پڑتا ہے)
دلیپ کمار: عامر! ایک بات تو بتلاؤ، تمہارا یہ فیصلہ مجھے بہت بھلا لگا کہ تم نے اپنے نومولود بیٹے کا نام مولانا کے نام پر رکھا ہے، یہ فیصلہ تمہارا ہے یا کرن کا؟
عامر خان: (کرن راؤ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) سر! دونوں کا۔
ریکھا: یہ مولانا کون ہیں؟
شترو گھن سنہا: حیرت ہے! آپ آزاد بھارت کے پہلے Minister Information مولانا ابوالکلام آزاد کو نہیں جانتیں! بہت بڑے عالم، سیاست دان اور ادیب تھے۔
ریکھا: Wonderfull
سلمان خان: سر! یہ آئیڈیا، عامر نے میرا چرایا ہے!
دلیپ کمار: (حیرت سے) وہ کس طرح؟
سلمان خان: سر! میں نے، بہت پہلے سے سوچا ہوا ہے کہ میں اپنے بیٹے کا نام اپنے Father کے نانا کے نام پر، رشید احمد صدیقی رکھوں گا!
ڈمپل کپاڈیا: وہ کیوں بھئی؟
دھرمیندر: He was a Great Intellectual & scholar of urdu literature.
ڈمپل کپاڈیا: Oh! I See
سلیم خان: نانا کا نام، تمہارے نام کے ساتھ شامل ہے نا!
سلمان خان: مگر میں، اپنے بیٹے کا نام، صرف اور صرف اُن کے نام پر رکھنا چاہتا ہوں۔
ایک آواز: پھر تو دوسرے بیٹے کا نام کرشن چندر رکھنا لازمی ہے!
شاہ رُخ: آنٹی، آنٹی! کیسی ہیں آپ؟ میرا مطلب ہے، السلام علیکم (گوری کو ہاتھ سے گھسیٹتے ہوئے)
سائرہ بانو: یہ آنٹی کس کو کہہ رہا ہے (گوری کو مخاطب کر کے)
شاہ رُخ: آنٹی کو! اور کس کو (شرارت سے تالی بجا کر)
سائرہ بانو: چل بے، بڑا آیا آنٹی کہنے والا! میں تو تجھے اپنے ساتھ ہیرو لے کر فلم اناؤنس کرنے والی ہوں، بشرطیکہ گوری کو کوئی اعتراض نہ ہو!
شاہ رُخ: گولی مارو جی، گوری شوری کو (گوری کی جانب آنکھ دبا کر) بادشاہو! انڈین فلم انڈسٹری نے آپ سے بڑھیا گوری آج تک پیدا نہیں کی، فائنل، ایک دم فائنل (سیدھے ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھا جوڑ کر)
سائرہ بانو: یُو۔۔۔بدمعاش۔۔۔فریبی!
شاہ رُخ: اپریل فُول بنایا تو اُن کو غصّہ آیا (بسواجیت کے انداز میں سائرہ بانو کا ہاتھ پکڑ کر ڈانس کرتا ہے اور تمام مہمان تالیاں بجا کر داد دیتے ہیں)
دلیپ کمار: ویلکم، سواگتم، خوش آمدید (رندھیر کپور، رشی کپور، نیتو سنگھ، رنبیر کپور، کرشمہ کپور، کرینہ کپور کو دیکھ کر) میرا راج آ گیا!
راجیش کھنہ: راج آ گیا؟
دلیپ کمار: بھئی راج پریوار کا مطلب راج ہی ہوا نا! یہ ڈیّو، میرا مطلب ہے رندھیر! یہ لوگ اس قدر جلد بڑے ہو کر، اتنے بڑے بڑے بچوں کے باپ بن گئے، ہماری زبان پر اب تک چھٹ پنے کے نام ہی چڑھے ہوئے ہیں، میں جب جب تم لوگوں کو دیکھتا ہوں (رندھیر کو مخاطب کر کے) تو مجھے راج بہت یاد

آ تا ہے، سچ پُوچھو تو آج میں اُسے بہت مِس کر رہا ہوں، وہ بھی کیا زمانہ تھا(ٹھنڈی آہ بھرکر)"انداز" کی تکمیل کے دوران، ہم دونوں ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

کرینہ کپور: Grand Paa بہت شرارتی تھے؟

دلیپ کمار: بہت زیادہ، راج اکثر اُس تھپّڑ کا ذکر ضرور کرتا جو اُسے شرما جی نے ابتدائی دنوں میں مارا تھا(کیدار ناتھ شرما کی طرف اشارہ) ساتھ ہی یہ بھی کہتا تھا کہ اُس تھپّڑ نے راج کی زندگی بدل کر رکھ دی۔

کرشمہ کپور: Really ?

دلیپ کمار: میں بھی اکثر(کرشمہ کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے)نتن بوس، محبوب صاحب اور بمل دا کے قصّے سنایا کرتا، جن کی محنت اور توجہ نے مجھے یوسف سے دلیپ کمار بنادیا۔

راجیش کھنہ: راج صاحب اور آپ کی زندگی بدلنے میں تو بہت سے پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں یوسف بھائی!

دلیپ کمار: (ٹھنڈی آہ بھرکر اُچٹتی نظر سائرہ بانو کے چہرے پر ڈالتے ہیں) نامکمل افسانوں کے ذکر سے کیا حاصل؟

رنبیر کپور: انکل! معمولی تحفہ قبول کیجیے(دلیپ صاحب کے پیر چھوکر)

دلیپ کمار: تحفہ کبھی معمولی یا غیر معمولی نہیں ہوتا، تحفہ ہمیشہ، انمول اور بیش قیمت ہوتا ہے، کیا ہوتا ہے(رنبیر کو مخاطب کرکے)

رنبیر: جی، بیش قیمت اور انمول۔

دلیپ کمار: بھئی وہ کیا کہتے ہیں، رندھیر! میرے بچوں کی شکل میں تم اتنے ڈھیر سارے تحفے لے آئے ہو پھر یہ تحفے "چہ معنیٰ دارد"۔

رندھیر کپور: جی۔۔۔۔(حیران ہوکر)

دلیپ کمار: میرا مطلب ہے کہ دو، دو تحفوں کی کیا تُک بنتی ہے؟

رِشی کپور: سالگرہ کا تحفہ اِن کی طرف سے ہے(کرشمہ، کرینہ کی طرف اشارہ) میری اور بھائی کی جانب سے یہ(پیکٹ بڑھاتے ہوئے) آپ کے پشاور والے گھر کو National Heritage بنانے کی خوشی میں ہے، By The Way انکل! ہم دونوں بھائی پیدا ممبئی میں ہوئے ہیں مگر جب بھی پشاور کا ذکر آتا ہے ہمارے دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے! What do you think?(رندھیر کپور کو مخاطب کرکے)

رندھیر کپور: I think you are right

دلیپ کمار: ہو آؤ نا! دونوں بھائی ایک بار پشاور، کیا امر مانع ہے جانے میں، ویزہ وغیرہ کا مسئلہ ہو تو میں پاکستانی ہائی کمیشن کے نام چٹھی دے سکتا ہوں۔

رِشی کپور: بس انکل! جب اوپر والے کی مرضی ہوگی، آپ کو ضرور تکلیف دیں گے(چونک کر) آپ نے حکومتِ پاکستان کو شکریہ کا خط لکھا کہ نہیں؟

دلیپ کمار: میرے شکریہ ادا کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے! شکریہ تو حکومتِ ہند کو کرنا چاہیے، یوسف خان کو دلیپ کمار کی شناخت کس نے دی؟ ہندوستان نے، یہ مان، سمّان، آپ لوگوں کا پیار، سب ہندوستان کی دین ہے، میری عزت میرے وطن کی عزت ہے، میں نے لکھا ہے اُنہیں شکریے کا خط، پر بھائی ہماری حکومت کو بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔ سُنا ہے! پشاور کی حکومت پھاپھا جی کا گھر، میرا مطلب ہے آپ لوگوں کا آبائی گھر بھی قومی ورثہ قرار دے رہی ہے، ہماری حکومت کو ایک نہیں دو خط لکھنے چاہیئے۔

رندھیر کپور: جی جی، جی انکل۔

امیتابھ بچن: یوسف بھائی درست فرما رہے ہیں، نشانِ امتیاز ہو یا یوسف بھائی کے گھر کو، قومی ورثہ قرار دیا جائے، دونوں میں ہماری عزت اور ہمارا مان سمّان ہے، پورے ہندوستان کا سر فخر سے بلند ہونا چاہیے کہ آج ہمارے بیچ، اتنا مہان کلاکار موجود ہے، جسے دیش کے ساتھ ودیش میں بھی مانا جاتا ہے۔

جتندر: نشانِ امتیاز کیا ہوتا ہے؟

دھرمیندر: یہ پاکستان کا سب سے بڑا سول ایوارڈ ہے۔

سنیل شیٹھی: یہ کب ملا یوسف بھائی کو؟

دھرمیندر: میرے خیال ہے، انیس سو اٹھاسی میں، کیوں یوسف بھائی، ٹھیک ہے نا؟

دلیپ کمار: غالبًا یہی سال بنتا ہے!

شتروگھن سنہا: ارے یہ دو سپر اسٹار کب دھماکہ کریں گے(رنبیر اور کرینہ کو مخاطب کرکے)

رنبیر: (چونک کر) جی سر؟

شتروگھن سنہا: میرا مطلب ہے، یہ دونوں، سپر ہٹ فلم، کب دے رہے ہیں؟

کرینہ: بہت جلد انکل، بہت جلد(ریلیکس ہوتے ہوئے)

راجیش کھنہ: وہ آئے، وہ آئے جنھوں نے شعلے کے ڈنکے بجائے(رمیش سپّی کو دیکھتے ہوئے)

دلیپ کمار: (چاروں طرف سر گھماکر) میں بھی تو کہوں، گھر اتنا روشن کیسے ہو گیا!

رمیش سپّی: یہ تو آپ کے چہرے کا نور ہے(دلیپ کمار کو اُٹھنے سے منع کرتے ہوئے)

دلیپ کمار: ارے کیوں شرمندہ کرتے ہو رمیش جی! بھائی ہم تو بہت گناہگار آدمی ہیں، بہت گناہگار!

رمیش سپّی: یہ کہہ کہ آپ مجھے گناہگار کر رہے ہیں۔

دلیپ کمار: ہم آپ کو کیا گناہ گار کریں گے، ہم نے تو آپ سے بہت ساری معذرت کرنا ہے، آپ کی فلم بیسویں صدی کی بہترین فلم قرار پائی اور میں مبارک باد دینے حاضر نہ ہو سکا، یقیناً میں بھی قصوروار ہوں مگر مجھ سے زیادہ قصوروار، وہ ڈاکٹر ہیں جنھوں نے میری نقل وحرکت پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔

رمیش سپّی: آپ اور آپ کا پیغام، میرے لئے دونوں، تبرک کا درجہ رکھتے ہیں، یہ تو سب جیوری کی مہربانی ہے وگرنہ گزشتہ صدی میں، ہماری فلم انڈسٹری نے ''شعلے'' سے زیادہ بڑی اور بامقصد فلمیں بنائی ہیں۔

دلیپ کمار: مثلاً؟

رمیش سپّی: مثلاً (سوچتے ہوئے) محبوب صاحب کی ''مدر انڈیا'' گرودت صاحب کی ''پیاسا'' راج صاحب کی ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' دیو صاحب کی ''گائیڈ'' راجندر کمار کی ''امن'' اور سب سے بڑھ کر آپ کی عظیم فلم ''مغلِ اعظم''۔

دلیپ کمار: یہ تو آپ کا کرم ہے کہ آپ مجھ کو اس لائق گردانتے ہیں، اصل میں ''مغلِ اعظم'' کا کریڈٹ کے۔آصف مرحوم، پھاپھاجی (پرتھوی راج) نوشاد صاحب، شکیل صاحب اور (لمبا سانس لے کر) مدھوبالا کو جاتا ہے (سائرہ بانو کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوتے ہیں جنہیں دلیپ صاحب بھانپ لیتے ہیں) رمیش جی ایک بات بتلایئے! (شوخی سے) یہ ویرو کے کریکٹر میں آپ نے دھرم ہی کو کیوں منتخب کیا؟ ہماری طرف آپ کا دھیان نہیں آیا؟

رمیش سپّی: وہ، دراصل، بات یہ ہے۔۔۔

امیتابھ بچن: انہیں ایک ہٹے کٹے، ہرفن مولا، دل پھینک عاشق کی ضرورت تھی (رمیش سپّی کا جملہ اچک کر، دھرمیندر کو چھیڑنے کی کوشش)

دھرمیندر: امیت کی بات اگر درست مان لی جائے تو پھر ٹھاکر کا کردار، یوسف بھائی کے لیے ضرور وقف ہونا چاہیے تھا۔

دلیپ کمار: کیوں بھئی دھرم، کیوں؟ مرحوم سنجیو کمار کی حق تلفی پر کیوں تُل گئے ہو تم؟ ایک بات بتلاؤ! کیا ہماری طرف سے تمہاری خاطر مدارت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟

دھرمیندر: کیوں شرمندہ کرتے ہیں یوسف بھائی! آپ کے ساتھ لونگ ڈرائیو اور دہی گلچے کی ضیافت سے بڑھ کر اور کیا خاطر ہو سکتی ہے؟

سائرہ بانو: جی ہاں! یہ اُنہی بدپرہیزیوں اور بداحتیاطیوں کا کارنامہ ہے (ناگواری سے دلیپ صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

امیتابھ بچن: سنجیو جی نے، ٹھاکر کا کریکٹر لاجواب طریقے پر کیا ہے مگر یوسف بھائی کی بات ہی اور ہے!

دلیپ کمار: میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آج میرے دوست، بیٹھے بٹھائے، مجھے ہیرو سے ولن بنانے پر کیوں مُصر ہیں؟

شتروگھن سنہا: ہرعمر کا اپنا چارم، اپنا انداز اور اپنا مزاج ہوتا ہے۔

دلیپ کمار: ملاحظہ فرمایئے! یہ ایکٹنگ کے بیچ، عمر اور مزاج کہاں سے آ گیا؟ ایکٹر وہی بڑا ہوتا ہے جو کسی بھی عمر میں کوئی بھی کردار عمدگی سے نبھائے، کیوں جیا تمہارا کیا خیال ہے! میں دیکھ رہا ہوں، تم بہت دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی ہو؟

جیا بہادری: ایسی تو کوئی بات نہیں بھائی صاحب! میں آپ لوگوں کی باتیں انجوائے کر رہی ہوں۔

امیتابھ بچن: وہ، بات یہ ہے، یوسف بھائی! جب سے یہ دادی بنی ہیں نا! تب سے سنجیدہ رہنے لگی ہیں۔

جیا بہادری: اور آپ زیادہ شوخ ہو گئے ہیں۔

دلیپ کمار: کیوں برخوردار! تمہارا کیا خیال ہے؟ کون ٹھیک کہہ رہا ہے (ابھیشک کو مخاطب کر کے)

ابھیشک بچن: شاید دونوں (کندھے اُچکا کر)

شتروگھن سنہا: شکر ہے! اس محفل میں، ایک سے دو سیاست دان تو ہوئے (قہقہہ)

راجیش کھنہ: سیاست دانوں کی تعداد کا صحیح علم تب ہوتا جب ایش یہاں موجود ہوتی!

سائرہ بانو: سچ! ایش کی کمی بہت محسوس ہو رہی ہے!

دھرمیندر: (گلاس بھرتے ہوئے) تو پھر ہو جائے ایش کے نام کا جام!

لیش چوپڑا: اِسے تو موقع ملنا چاہیے!

امیتابھ بچن: یونہی تو نہیں بنتی، صدی کی بہترین فلم!

دلیپ کمار: اچھا! ہمیں علم ہوتا تو ''مغلِ اعظم'' میں اس گُر کو ضرور آزماتے! کیوں سلیم! تمہارا کیا خیال ہے؟

سلیم خان: جی، جی یوسف بھائی۔

عامر خان: ابھی بھی کیا بگڑا ہے، اب دوہرا لیجیے!

دلیپ کمار: کم بخت وقت، بڑی ظالم چیز ہے (ٹھنڈی آہ بھر کر) اس عمر میں، ہیرو کا رول کون آفر کرے گا ہمیں؟

مہیش بھٹ: اپنے گھئی صاحب ہیں نا!

دلیپ کمار: اس عمر میں، گھئی صاحب، مجھے ہیرو کے طور پر کاسٹ کر لیں گے؟

گووندہ: یہی تو کمال ہے گھئی صاحب کا سر! لائٹس اور کیمرے کا استعمال اس فنکاری سے کرتے ہیں کہ کبھی کبھی تو ہیرو کا کام ہیروئن سے اور ہیروئن کا، ہیرو سے لے لیتے ہیں۔ ایم۔ایف۔حسین صاحب کی زندگی نے وفا نہیں کی وگرنہ گھئی صاحب نے اُنہیں مادھوری جی کے ساتھ ہیرو کاسٹ کرنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔

دلیپ کمار: مادھوری جی سے اجازت کے بغیر؟

شتروگھن سنہا: یوسف بھائی! آپ ایک مرتبہ حامی تو بھریئے، پھر دیکھئے انڈسٹری کی تمام ہیروئنز، آپ کے ساتھ کام کرنے کے لیے، کس طرح لائن میں لگتی ہیں! کیوں کترینہ جی (قہقہہ)

کترینہ کیف: Why Not!

سلمان خان: پریانکا جی آپ؟

پریانکا چوپڑا: My Pleasure
دیپیکا پڈکون: میں بھی تیار ہوں (اُچھل کر ہاتھ ہلاتی ہے)
ڈمپل کپاڈیا: ماں کے کریکٹر کے لیے میں تیار ہوں!
جوہی چاولہ: میں کیہا جناب! بہن شہن دے رول واسطے، پنجاب دی کُڑی نوں نا بُھلنا!
شاہ رُخ: بیٹے کے کریکٹر کی بات کوئی کیوں نہیں کرتا (اِٹھلا کر)
رنبیر کپور: (شاہ رُخ کی جانب کالر کھڑے کر کے) میں ہوں نا!
جتیندر: بڑے بھائی کا کریکٹر نکلتا ہو تو میں حاضر ہوں!
راجیش کھنہ: یار جیتو! میری سفید داڑھی کا تو کچھ خیال کرو!
جتیندر: باپ کا رول تبھی تو نہیں مانگا (قہقہہ)
کرن جوہر: اس کا مطلب ہے! سارے ایوارڈز گئے ہاتھ سے!
شتروگھن سنہا: کرن پلیز! ایوارڈز کا نام مت لو، ایوارڈ کے نام سے، وحشت ہونے لگی ہے، جس کو دیکھو ایوارڈ لیے چلا آ رہا ہے (امیتابھ کے چہرے پر ناگوار تاثرات) اب تو لوگ انڈسٹری بعد میں جوائن کرتے ہیں، ایوارڈ پہلے مل جاتا ہے اور پھر، ایوارڈز دینے والوں کے Motive کا بھی پتہ نہیں لگتا کہ کون لوگ ہیں، کیوں ایوارڈز دے رہے ہیں، ایوارڈز دینے کا Criteria کیا ہے؟
دلیپ کمار: (موضوع کی نزاکت بھانپ کر) کیوں گھئی صاحب! آپ کا کیا خیال ہے، یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی؟
سبھاش گھئی: Of course Sir ! Why Not
دلیپ کمار: ہماری ایک شرط ہے!
سبھاش گھئی: حکم کیجیے سر!
دلیپ کمار: ہیروئن ہماری پسند کی ہوگی (سائرہ بانو کا ہاتھ تھام کر)
وحیدہ رحمٰن: مجھے تم سے اس بے وفائی کی اُمید ہرگز نہ تھی یوسف میاں!
دلیپ کمار: چاند، چودھویں کا ہو یا پندرہویں کا، ہوتا بے وفا ہے (قہقہہ) کیوں شیاما! تمہارا کیا خیال ہے؟
شیاما: میری گواہی آپ کے حق میں، پہلے مانی گئی ہے، جواب مانی جائے گی (ترچھی نظر سے سائرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے)
شتروگھن سنہا: حاضرین و ناظرین! آپ لوگوں سے میری درخواست ہے کہ خوشی کے اس موقع پر کسی بھی طرح کی بے وفائی کا ذکر ہرگز نہ کیا جائے وگرنہ ہماری دھنّو اداس ہو جائے گی (سائرہ بانو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)
گوندہ: نین لڑ جئی ہے، نین لڑ جئی ہے (گاتے ہوئے دلیپ صاحب کے انداز میں ڈانس کرتا ہے)
دھرمیندر: ارے وہ نظر نہیں آ رہے، اپنے پنکج اُدھاس، شہنشاہِ غزل!
پنکج ادھاس: دھرم صاحب! ہمیں دیکھنے کے لیے، نگاہ بلند اور سخن دلنواز ہونا چاہیے۔

امیتابھ بچن: بھئی آپ اُدھر کیا کر رہے ہیں، اِدھر آئیے، اِدھر (دلیپ صاحب کے قریب بُلاتے ہوئے) حضور! آپ بھی تشریف لے آئیے (عدنان سمیع کو ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے) یار! تم ہمیشہ وقت پر غائب ہو جاتے ہو (گلوکار ہنس راج کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے) ہاں تو دیویوں اور سجنو! آپ سب سے درخواست ہے کہ اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو کر، کیک کاٹنے کی تقریب میں شریک ہو جائیے، ایک بنتی آپ سے اور ہے کہ اس وقت آپ لوگوں کو جس قدر بھی دعائیں اور پراتھنائیں یاد ہیں وہ سب یوسف بھائی کی صحت، سلامتی اور درازیٔ عمر کے لیے، اپنے من میں دھرا ڈالیے، اور اس یقین اور آتم وشواس کے ساتھ کے اوپر والا ہماری دعائیں اور پراتھنائیں قبول کرتے ہوئے ہمارے وقت کے Living legend دلیپ کمار صاحب کو سدا سلامت اور خوش حال رکھے (ہاتھ کے اشارے سے سنگرز کو گانا شروع کرنے کی تاکید)
پنکج اُدھاس: (ہاتھ میں پکڑے ہوئے مائیک کو منہ کے قریب کرتے ہوئے)

بار بار دن یہ آئے، بار بار دل یہ گائے
تم جیو ہزاروں سال، یہ میری ہے آرزو

(عدنان سمیع اور ہنس راج مصرع اٹھاتے ہیں اُن کے ساتھ شرکائے محفل بھی شریک ہو جاتے ہیں جونہی یہ گانا ختم ہوتا ہے تالیوں کی گونج میں دلیپ صاحب پر پھول نچھاور کیے جاتے ہیں اور طرح طرح کی بوتلوں کے کارک کھلنے کی آوازوں میں دلیپ صاحب دولہا کی مانند شرماتے ہوئے پہلے دھرمیندر اور پھر امیتابھ بچن کو قریب بلاتے ہوئے کیک پر چھری چلاتے ہیں)
راجیش کھنہ: دوستاروں کا ملن (گلوکاروں کو ہاتھ کے اشارے سے ہدایت دیتے ہوئے)
پنکج اُدھاس:

دوستاروں کا زمیں پر ہے ملن آج کی رات
ساری دنیا نظر آتی ہے دلہن آج کی رات

(پہلے گیت کی طرح اس گیت میں بھی عدنان سمیع اور ہنس راج پنکج اُدھاس کا ساتھ دیتے ہیں اور شرکائے محفل تالیاں بجا کر گیت میں شامل ہو جاتے ہیں، اس کے بعد دلیپ صاحب کی فلموں کے مشہور گیتوں کی فرمائش کا ایک طویل سلسلہ جاری ہو جاتا ہے، اِن گیتوں کی مشہور دھنوں پر تمام ادا کار الگ الگ اور جوڑوں کی شکل میں محوِ رقص ہو جاتے ہیں، جوں جوں محفل کا اختتام قریب آ رہا ہے لوگوں کا اشتیاق بڑھتا جا رہا ہے، شرکاء کے اسرار پر فلم مغلِ اعظم میں محمد رفیع کا گایا ہوا مشہور گیت گایا جاتا ہے)

زندہ باد، اے محبت زندہ باد
دولت کی زنجیروں سے رہتی ہے تُو آزاد

(اس گیت کے دوران منظر کچھ ویسا ہی جذباتی بن جاتا ہے جیسا فلم کے اندر پکچرائز کیا گیا ہے، گلوکاروں کے ساتھ سبھی لوگ اونچی اور بلند آواز

# ایک صدی کا قصہ
## کیدار شرما
### دیپک کنول
(ممبئی، بھارت)

کیدار شرما کا جنم 12 اپریل 1910 کو پنجاب کے ایک گاؤں ناروال میں ہوا جو کہ تب متحدہ پنجاب کا ایک صوبہ تھا اور اب وہ پاکستان کے پنجاب کا صوبہ ہے۔ وہ غربت وافلاس کے سایے میں پلا بڑھا۔ اُسکے دو بھائی اسی ناداری کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ اُسکے بھائی روگھناتھ اور ویشناتھ کا بچپن میں ہی دیہانت ہوا۔ اُسکی ایک بہن تاروتپ دق کی نذر ہوگئی۔ اُسکے خاندان میں تین ہی ایسے خوش قسمت بچے تھے جو موت کو چکمہ دینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ یہ خوش قسمت خود کیدار شرما اُسکا چھوٹا بھائی ہمت رائے شرما (جو بعد میں کیدار شرما کے ساتھ معاون کے طور پر کام کرتا رہا جب تک وہ ایک رائٹر کی حثیت سے منظر عام پر نہ آیا) اور چھوٹی بہن گوروتھی۔ کیدار شرما نے اپنی ابتدائی تعلیم بیج ناتھ ہائی اسکول امرتسر میں حاصل کی۔ اسی اسکول میں اُسکا رجحان فلاسفی، مصوری اور شاعری کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے گھر کی مالی حالت کو سدھارنے کے لئے کیدار شرما دیوی دیوتاؤں اور فلمی ہستیوں کی تصویریں بنا کر انہیں امرتسر کے ہال بازار کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔ ایک بار جب دیوالی کا تیوہار آیا تو اُسکی چھوٹی بہن کا دل بھی پٹاخے چھوڑنے کے لئے مچل اُٹھا۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اپنی اکلوتی بہن کی فرمائش پوری کرنے کے لئے کیدار شرما نے کسی دیوی دیوتا کی پینٹنگ بنائی اور ہال بازار جا کر اُسنے یہ پینٹنگ نو روپے میں بیچی جسمیں چار روپے کی فریم بھی شامل تھی۔ یہ پیسے لے کر وہ مٹھائی کی دوکان کی طرف بھاگا۔ پہلے اُس نے مٹھائی لی پھر بہن کے لئے پٹاخے خریدے اور اس طرح اُس کے پریوار نے بھی دیوالی منائی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد اُس پر فلموں کا بھوت سوار ہوا اور وہ گھر سے بھاگ کر بمبئی پہونچ گیا۔ بمبئی میں کئی مہینے تک گرد پھانکنے اور جوتیاں چٹخانے کے بعد جب اُسے فلموں میں کوئی کام نہ ملا تو وہ مایوس اور دل شکستہ ہوکے واپس امرتسر لوٹ آیا اور یہاں پر اُسنے ہندو سبھا کالج میں داخلہ لیا جہاں پر اُسنے ایک ڈرامہ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس سوسائٹی کے تحت اُس نے کئی ڈرامے پیش کئے۔

ایک دن 'Temperance movement' کے سربراہ نے اُسکا ایک ناٹک دیکھا۔ وہ اس ناٹک سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس نے کیدار شرما کو ایک خاموش فلم پرڈیوس کرنے کی پیش کش کی جسمیں اُسے شراب نوشی کے منفی اثرات دکھانے کے لئے کہا گیا۔ کیدار شرما نے یہ فلم بنائی اور اس فلم سے اُسے جو مالی فائدہ ہوا اُس سے اُس نے امرتسر خالصہ کالج سے ماسٹرس ڈگری حاصل کی۔ اسی بیچ وہ ایک لوکل تھیٹر گروپ سے وابستہ ہوگیا جہاں سے اُسکا گذارہ چلتا رہا۔ اسی تھیٹر گروپ سے اُسکی اداکارانہ صلاحتیں باہر آگئیں۔ 1931 تک وہ اس تھیٹر سے جڑا رہا۔ 1932 میں اُسکی شادی ہوئی۔ خانہ داری کی ذمہ واریاں بڑھتے دیکھ کر کیدار شرما نے پینٹنگ کا کام شروع کیا۔ 1933 میں جب اُسنے ہدایت کار دیبکا بوس کی فلم ''پورن بھگت'' دیکھی تو وہ اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔ اُسنے اپنی بیوی سے پچیس روپے اُدھار لے کے سیدھے کلکتہ کا رخ کیا۔ اس اُمید کے ساتھ کہ ''نیو تھیٹرس'' سے اُسے بھی فلم ڈائرکٹ کرنے کا موقع ملے گا پر ایسا نہیں ہوا۔ وہ مہینوں کلکتے میں ڈنڈے بجاتا پھرتا رہا۔ ''نیو تھیٹرس'' تک پہونچنا تو دور اُسے کسی نے ایک چھوٹی سی نوکری کی پیش کش تک نہ کی۔ اس بیچ وہ ایک گم نام ایکٹر سے ملا جس کا نام پرتھوی راج کپور تھا اور جو خود فلموں میں بریک پانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ بہت جلدی یہ دونوں دوست بن گئے۔ کیدار شرما پرتھوی راج کپور کے گھر میں آیا جایا کرتا تھا۔ وہیں پر اُس کی ملاقات آٹھ سال کے راجکپور سے ہوجایا کرتی تھی۔ ایک دن کیدار شرما کو پتا چلا کہ کندن لال سہگل پرتھوی راج کپور کے پڑوس میں رہتا ہے تو اُس نے سہگل صاحب کو ملنے کی ٹھانی۔ کندن لال سہگل کا بھی اُن دنوں کافی زیادہ نام نہ ہوا تھا۔ ایک غزل گو کے طور پر اُنہوں نے اپنی پہچان بنالی تھی البتہ وہ اتنے مقبول نہ تھے۔ پرتھوی راج کپور نے کیدار شرما کو کندن لال سہگل سے ملا دیا۔ دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔ وہ سہگل صاحب کو اپنی غزلیں سنایا کرتا تھا۔ سہگل صاحب سے کیدار شرما کی مالی حالت چھپی نہ تھی۔ اُنہوں نے کیدار شرما کی اس طرح مالی مدد کی کہ وہ اُن کی غزلیں پانچ روپے کے حساب سے خریدنے لگے۔ اُن دنوں پانچ روپیوں کی بھی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ قسمت کا کھیل دیکھئے کہ ایک دن سہگل صاحب نے درگا کھوٹے کی معرفت کیدار شرما کی ملاقات دیبکا کمار بوس سے کروائی۔ درگا کھوٹے ہندی سینما میں ایکٹرس کے طور پر جانی جانے لگی تھی۔ کیدار شرما جب اپنے آئیڈیل دیبکا کمار بوس سے ملا تو اُس نے بنگال کے اس معروف فلمساز کو پہلی ملاقات میں ہی قائل کر دیا۔ دیبکا بوس نے سن 1934 میں کیدار شرما کو فلم ''سیتا'' کی سٹل فوٹو گرافری کرنے کا موقع دیا۔ کیدار شرما نے اپنے محسن کا دل بہت جلدی جیتنے میں کامیابی حاصل کی۔ 1935 میں دیبکا بوس نے کیدار شرما کو فلم ''انقلاب'' میں ایک چھوٹا سا رول ادا کرنے کے علاوہ اُسے سیٹ کو پینٹ کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔ کیدار شرما بڑا ذہین اور تیز طرار تھا۔ اُسے لوگوں کو اپنے بس میں کرنا بخوبی آتا تھا۔

کیدار شرما 1936 تک ''نیو تھیٹرس'' میں ہر طرح کے کام کرتا رہا۔ بہت جلد اُسکی مراد تب برآئی جب ''نیو تھیٹرس'' نے فلم ''دیوداس'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ کیدار شرما کو اس فلم کے مکالمے اور گیت لکھنے کے لئے کہا گیا۔ اس

فلم میں اُس کا دوست کندن لال سہگل مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔فلم نے ہر طرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔اس فلم کے گانے ”بالم آئے بسو میرے من میں“اور ”دکھ کے دن اب بیتت نا ہیں“ نے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ یہ گانے آج بھی مقبول ہیں۔اس فلم نے راتوں رات کیدار شرما کو کامیابی کی بلندیوں پر لا کر کھڑا کر دیا۔فلمی نقادوں نے کیدار شرما کے گیتوں اور مکالموں کی بھرپور تعریف کی۔کیدار شرما اپنے انٹرویو کے دوران اکثر کہا کرتے تھے۔”مجھے اور بمل رائے کو پہلا بریک ”دیوداس“ سے ملا۔اُسے کیمرہ مین اور مجھے گیت کار اور مکالمہ نگار کے طور پر“ کیدار شرما کو ڈائرکٹر کے طور پر پہلا بریک 1940 میں تب ملا جب اُسکو فلم ”پہلی جیت“ جو کہ کسی وجہ سے ادھوری پڑی تھی کو پوری کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس فلم نے اُسکے لئے آگے کے دروازے کھول دیئے۔”پہلی جیت“ کے بعد وہ ”نیو تھیٹرس“ میں گھٹن سی محسوس کرنے لگا۔اُسنے کلکتہ کو خیر باد کہا اور اپنے جگری دوست پرتھوی راج کپور کے ساتھ بمبئی چلا آیا۔یہاں پر اُسکی ملاقات ”رنجیت موی ٹون“ کے مالک سیٹھ چندو لال شاہ سے ہوئی۔چندو لال شاہ نے اُسے فلم بنانے کی آفر دی۔1941 میں اُسنے اپنے ہی لکھے ہوئے اسکرین پلے پر فلم ”اولاد“ بنائی جو اُسوقت کی روش سے ہٹ کے تھی ۔روایتی فارمولے سے ہٹ کر انسانی اقدار کے ٹکراو پر بنی یہ ایک اچھوتی اور بے باک فلم تھی۔اس فلم سے ایک نئے سینما کا آغاز ہوا۔اس فلم کے اداکار اے۔ ایس۔گیانی اور رمولا تھے۔اس فلم کے بعد اُس نے فلم ”دل ہی تو ہے“ کی ہدایت کاری کی۔یہ فلم باکس آفس پر کوئی ہنگامہ نہ مچا سکی۔بہرحال قسمت کی دیوی اُس پر مہربان ہو گئی تھی۔1941 میں اُسے فلم ”چتر لیکھا“ کی ہدایت کاری کی کمان سونپی گئی۔اس فلم کی کہانی بھگوتی چرن ورما کے ایک مشہور ہندی ناول پر مبنی تھی۔اس فلم کے اداکار اے۔ ایس۔گیانی اور مہتاب تھے (جو بعد میں مسز محبوب بنی) یہ فلم جب بن کر ریلیز ہوگئی تو اس نے باکس آفس پر ہنگامہ مچا دیا۔ کیدار شرما پر قسمت کی دیوی اب پوری طرح سے مہربان ہو گئی تھی۔کیدار شرما کے نام کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بج رہا تھا۔اس فلم کے بعد اُس کے گھر کے باہر پرڈیوسروں کی لائن لگنے لگی۔اُن دنوں فلم کی کامیابی کا سہرا ڈائرکٹر کے سر جاتا تھا نہ کہ ایکٹر یا ایکٹرس کو۔کیدار شرما نے بحیثیت ڈائرکٹر کئی ساری فلمیں کیں جن میں 1942 کی ”امن“ اور ”گوری“ 1944 کی ”ممتاز محل“ 1945 کی ”دھنا بھگت“ اور ”چاند چکوری“ اور 1946 کی ”دنیا ایک سرائے“۔

اسی بیچ کا ایک دلچسپ قصہ ہے۔ایک دن وہ پرتھوی راج کپور سے ملنے گیا تو کیا دیکھا کہ وہ بڑے اُداس اور افسردہ ہو کے بیٹھے ہیں۔اس سے پہلے اُسنے پرتھوی راج کپور کو اس طرح کبھی بھی اتنا پریشان نہ پایا تھا۔کیدار شرما نے پاپا جی سے اس پریشانی کا سبب پوچھا تو پاپا جی نے ایک آہ بھر کر کہا کہ اُن کا بڑا بیٹا رنبیر راج کپور میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا ہے۔اُسے پڑھائی لکھائی میں کوئی دلچسپی نہیں۔بس دن بھر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔کیدار شرما نے پاپا جی کو یہ رائے دی کہ وہ اُسے اُس کے پاس بھیج دیں۔اگلے روز پرتھوی راج کپور نے اپنے بڑے بیٹے رنبیر کو کیدار شرما کے پاس بھیج دیا۔کیدار شرما نے اُسے کلپر بوائے کا کام سونپ دیا۔چھریرے بدن کا یہ نوجوان جب بھی کلیپ دینے کے لئے کیمرہ کے سامنے جاتا تھا تو بن ٹھن کے جاتا تھا۔وہ جب بھی کلیپ مارتا تھا تو سب سے پہلے اپنے بالوں میں کنگھی پھیرتا تھا۔اُسکا دھیان کلیپ میں کم اپنے آپ کو کیمرہ کے سامنے بہتر ڈھنگ سے پیش کرنے میں ہوتا تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ جب وہ کلیپ دینے کے لئے کیمرہ کے سامنے کھڑا ہوا تو اُسکا سارا دھیان کیمرہ کے لینس کی طرف تھا۔اچانک ڈائرکٹر کی آواز سن کر وہ چونکا اور ہڑبڑاہٹ میں اُس نے جو کلپ مارا تو ہیروئن کے بال کلیپ بورڈ میں اٹک گئے اور وہ زور سے چیخی۔اُسکے بال کلیپ بورڈ میں اٹک گئے تھے۔کیدار شرما یہ سب دیکھ رہا تھا۔اُسکا خون اُبل پڑا اور اُس نے بڑھ کر راج کپور کو ایسا زناٹے دار تھپڑ رسید کیا کہ دبلا پتلا یہ نوجوان کئی فٹ دور جا کر گرا۔

کیدار شرما اس واقعے کے بعد ساری رات سو نہ سکا۔پرتھوی راج کپور اُسکا جگری دوست تھا۔وہ سوچنے لگا کہ جب راج کپور نے اپنے باپ کو اس بارے میں بتایا ہوگا تو پرتھوی راج کپور کے دل پر کیا گذری ہوگی۔اُسے اپنے کیئے پر افسوس بھی ہو رہا تھا اور ندامت بھی۔بہرحال جونہی صبح ہو گئی تو وہ اپنے آفس چلا گیا۔وہ بڑی بے چینی سے پرتھوی راجکپور کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ جب آئے گا تو وہ کسی طرح اُسے سمجھالے گا اُسے منائے گا اور اپنے کیئے کے لئے اُس سے معافی مانگے گا۔وہ اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں تھا کہ اتنے میں اُسے راجکپور آتا ہوا دکھائی دیا۔اُسی کھلنڈرے پن اور بے نیازی کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ اُسنے راج کپور کو اپنے آفس میں طلب کیا اور اُس نے اپنے کیئے پر جب شرمندگی ظاہر کرنا چاہی تو راج کپور نے اُس کے پاؤں پر گر کر کہا کہ ایسا کہہ کے اُسے شرمندہ مت کیجئے۔وہ اُسکے اُستاد ہیں اور ایک اُستاد ہونے کے ناطے اُنہوں نے اگر اُسے چانٹا مارا تو اُسکی بہتری کے لئے ہی مارا نا۔کیدار شرما اُسکے اس جواب سے اتنا خوش ہوا کہ اُسنے راج کپور کو اپنی اگلی فلم ”نیل کمل“ میں بطور ہیرو پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے راج کپور نے گیارہ سال کی عمر میں ”انقلاب“ نامی فلم میں ایک مختصر سا رول ادا کیا تھا۔ہیروئین کے طور پر اُس نے دلی کی ایک گمنام لڑکی ممتاز کو منتخب کیا جسکا فلمی نام بعد میں مدھو بالا پڑا۔اس سے پہلے کیدار شرما نے گیتا بالی نام کی ایک غریب لڑکی کو فلم ”سہاگ رات“ میں بریک دیا تھا جو بعد میں ہندی فلمی اسکرین کی بہت بڑی اور بہترین ہیروئن کے طور پر جانی جانے لگی۔”نیل کمل“ کوئی خاص کمال نہ کر سکی۔اُس نے اس فلم کے بعد راج کپور کو لے کر ایک اور فلم بنائی جس کا نام ”باورے نین“ تھا۔اس فلم میں اُس نے ایک نئے موسیقار کو فلمی دنیا سے روشناس کرایا جس کا نام روشن ناگرتھ تھا۔یہ فلم خوب چلی۔اس فلم کے گانے آج تک مقبول ہیں۔اس فلم میں اُس نے گیتا بالی کو راج کپور کے ساتھ پیش کیا۔

اسی سال اُس نے دلیپ کمار اور نرگس کو لے کر فلم ''جوگن'' شروع کی۔اس سے پہلے دلیپ کمار اور نرگس کی جوڑی کافی مقبول ہوئی تھی۔نرگس کو جو شہرت اور پزیرائی فلم ''مدرانڈیا'' سے ملی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے پر قارئین یہ سن کر حیران ہونگے کہ نرگس کی سب سے پسندیدہ فلم ''جوگن'' ہے۔ایک انٹرویو کے دوران اُس نے اس بات کا خلاصہ کیا کہ اسمیں شک نہیں کہ میری سب سے بہترین فلموں میں ''مدرانڈیا'' کا نام سب سے اوپر ہے مگر اداکاری کے لحاظ سے میری سب سے عمدہ فلم ''جوگن'' ہے۔اس کا سہرا کیدار شرما کے سر جاتا ہے جس نے محبوب خان کے مقابلے میرے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو باہر نکالا۔

''جوگن'' کے پرڈیوسر چندولال شاہ تھے۔چندولال شاہ نے کیدار شرما کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اُسے یہ فلم ایک مہینے کے اندر پوری کرنی ہوگی۔کیدار شرما نے چیلنج تو قبول کیا پر ساتھ ہی اپنی طرف سے ایک شرط رکھی کہ وہ دن میں شوٹنگ کرے گا اور رات کو فلم کی ایڈیٹنگ کرے گا اسکے لئے اُسے ایک کمرہ دیا جائے اور ساتھ ہی چائے بنوانے کے لئے ایک لڑکے کو مقرر کیا جائے جو جب تب اُسے چائے بنا کے پلائے گا۔چندولال نے اُسکی دونوں شرطیں مان لیں۔فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔پہلا دن تھا شوٹنگ کا۔کیدار شرما نے دلیپ صاحب سے پوچھا۔''دلیپ صاحب، شاٹ لیں۔'' دلیپ صاحب نے کہا۔''یس باس'' لیکھ ٹنڈن نے کلیپ دیا اور ڈائرکٹر نے ایکشن بولا۔شاٹ این جی ہوا۔دلیپ کمار صاحب کا دھیان فلم میں نہیں کہیں اور تھا اور وہ بڑی بے دلی سے کام کر رہے تھے۔ری ٹیک پر ری ٹیک ہو رہے تھے۔کیدار شرما تاؤ میں آگیا۔اُسنے سوچا کہ اگر فلم کی رفتار ایسی ہی رہی تو وہ چندولال شاہ کے سامنے کونسا منہ لے کر جائے گا۔اُس نے دلیپ صاحب کو الگ لے جا کر کہا۔'' آپ اس ریس کے جیتنے والے گھوڑے ہیں اور میں آپ کا جوکی ہوں جسکے ہاتھ میں آپ کی لگام ہے اور جو آپ کو منزل تک پہونچانے کے لئے مہمیز کرے گا'' اتنی سی بات سننے کے بعد دلیپ صاحب نے اس طرح کیدار شرما کو تعاون کیا کہ فلم 29 دن میں بن کر تیار ہوگئی۔1950 کی یہ سب سے بڑی ہٹ ہے جس نے اُس زمانے میں ایک کروڑ بیس لاکھ کی کمائی کی۔

اُسنے فلم انڈسٹری کو کئی نئے چہرے دئے جن میں راج کپور، گیتا بالی، مدھو بالا، مالا سنہا، بھارت بھوشن اور تنوجہ شامل ہیں۔وہ ہمہ جہت فن کار تھا۔اُس نے کئی کامیاب فلموں کے مکالمے اور گیت لکھے۔جن میں کے۔ایل۔سہگل کی دیوداس، ودیاپتی، چترلیکھا، نیل کمل، سہاگ رات، جوگن، باورے نین اور ہماری یاد آئے گی جیسی چند فلمیں ہیں جو کیدار شرما کے مکالموں اور گیتوں سے مزین ہیں۔

کیدار شرما صیح معنوں میں ہرفن مولا تھا۔وہ ایک مصور، ایک پینٹر، ایک فلاسفر، گیت کار، کہانی کار، مکالمہ نگار اور ایک کامیاب ہدایت کار تھا۔اُس نے اپنے شروعاتی دور میں کندن لال سہگل کی ایک تصویر کھینچی تھی جسمیں وہ ہیٹ پہنے ہوئے تھے۔یہ تصویر برسہا برس تک فلمی میگزینوں کی زینت بنی رہی۔وہ کمال کا صناع کار تھا۔''جوگن'' میں لئے ہوئے اُسکے بے مثال کلوز اپ اس بات کے غماز ہیں کہ کیدار شرما سلولائڈ کے پردے پر بھی مصوری کرتے رہے۔''جوگن'' کے گیت سن کر اُس وقت کے وزیر اعظم مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو اس حد تک متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے کیدار شرما کو 1950 میں دلی طلب کیا اور اُسے چلڈرنز فلم سوسائٹی کے ڈائرکٹر۔ان۔چیف کا عہدہ سنبھالنے کے لئے منالیا۔وہ اس عہدے پر کئی سالوں تک براجمان رہا۔اُس نے بچوں کے لئے کئی ساری فلمیں بنائی جن میں سے چند ایک کو اعزازات سے نوازا گیا۔

میں کیدار شرما سے رنجیت اسٹوڈیو میں بارہا ملا ہوں۔یہ وہ وقت تھا جب اُن کی شہرت کا سورج ڈھل چکا تھا۔ایک بات بار بار میری توجہ اُن کی اور کھینچتی تھی۔وہ یہ کہ اُنکی آواز بڑی گرجدار تھی۔وہ اگر آہستہ سے بھی بولتے تب بھی اُنکی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔وہ آخری وقت تک فعال رہے۔میں نے ہر روز اُسے رنجیت اسٹوڈیو میں کسی نہ کسی نوآموز اداکار کے ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔29 اپریل 1999 کو وہ 89 برس کی عمر میں عدم آباد کے سفر پر نکل پڑے۔اور اپنے پیچھے بے شمار فلمیں اور ڈھیر ساری یادیں چھوڑ کر گئے۔

زمانہ کافی بدل چکا ہے۔فلموں کی تکنیک بدل چکی ہے۔فلم کے ہر شعبے میں ایک انقلابی بدلاؤ آچکا ہے۔اب نہ وہ لوگ رہے نہ وہ نگار خانے جنھوں نے ہندی فلموں کو ایک نئی جہت اور سمت عطا کی۔دھیرے دھیرے لوگ اُن فن کاروں کو بھولنے لگے ہیں مگر کیدار شرما جیسے نابغہ روزگار ہمیشہ زندہ وتابندہ رہیں گے۔

## بقیہ: اے محبت زندہ باد

میں گیت گا کر دلیپ صاحب سے محبت اور نیاز مندی کا ثبوت دے رہے ہیں، گلوکار ہنس راج پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ دھمال ڈالنے لگتے ہیں، احباب کی یہ محبت دیکھ کر دلیپ کمار کسی قدر آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور سائرہ بانو کا ہاتھ پکڑ کر دھرمیندر، امیتابھ بچن اور شترو کے ساتھ دائرے کی شکل میں کھڑے ہو کر دوستوں کی محبت کا شکریہ ادا کرتے ہیں، مگر اُن کا دل اس محبت اور وارفتگی کے عالم میں سرشاری کے ساتھ کچھ سوگوار بھی ہو جاتا ہے اور انتہائی رازداری کے عالم میں یہ شعر گنگنانے لگتا ہے۔

ہمارے بعد اس محفل میں افسانے بیاں ہوں گے
بہاریں ہم کو ڈھونڈیں گی نہ جانے ہم کہاں ہوں گے
نہ ہم ہوں گے، نہ تم ہو گے، نہ دل ہوگا مگر پھر بھی
ہزاروں منزلیں ہوں گی ہزاروں کارواں ہوں گے

☆

# رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

**وقار جاوید**

(کراچی)

گلزار جی

بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں' آپ کو تفصیلی خط لکھوں گا لیکن پہلے منشا یاد کی روانگی نے پریشان کئے رکھا' پھر اِدھر اُدھر کی فضول پریشانیوں نے جکڑ لیا' آپ کو نہیں لکھ سکا' معذرت کا طلب گار ہوں۔ منشا یاد کے جانے نے جیسے بالکل تنہا کر دیا ہے' لگتا ہے میرے لئے اِسلام آباد خالی ہو گیا ہے۔ میرا اُس کا پچا لیس برسوں کا ساتھ تھا' ٹوٹنے میں پچا لیس منٹ بھی نہیں لگے۔ ہم مل بیٹھتے تھے تو جانے کیا کیا مل جُل کر کرنے کے بارے میں پہروں منصوبے بنایا کرتے تھے لیکن وہ کیسا کٹھور نکلا کہ پل بھر میں دنیا ہی بدل لی۔۔ دیکھئے اُسے بھولنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟

شمارہ آنے سے پہلے میں نے سوچ رکھا تھا' آپ کو زائد کاپیوں کے لئے لکھوں گا' اللہ آپ کو خوش رکھے' مجھے کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مضامین کی ترتیب' انٹرویو کے سوالات اور آپ بیتی سے اِنتخاب سبھی کچھ آپ کے حُسنِ انتخاب کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میں اپنی ذات کے بارے میں اتنی تفصیل کی اشاعت کے حق میں تو نہ تھا لیکن آپ کا بھلا ہو' آپ کے تقاضے کے سامنے انکار بھی نہیں کر سکا۔ یا شاید اس کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ چھٹی دہائی کے اواخر میں ہی بہت کچھ لوٹ لیا تھا' مزید کی خواہش ہی نہ رہی۔

آپ اپنی جیب سے خرچ کر کے صرف پرچہ ہی شائع نہیں کرتے' ساری دنیا میں اُس کی (آن لائن اور ڈاک سے) ترسیل بھی کرتے ہیں' کم از کم میرے لئے باعث حیرت ہے۔ میں تو دعائیں اور نیک خواہشات ہی بھیج سکتا ہوں۔ مجھے اپنی محفلوں میں یاد رکھئے گا۔

**وقار بن الٰہی** (اسلام آباد)

بھائی گلزار جاوید، سلام خلوص ومحبت۔

آپ نے ہم' میاں بیوی' کو قرطاسِ اعزاز سے نوازا۔ اس قدر دانی کے لئے ہم دونوں آپ کے اور چہار سو کے ممنوں ہیں۔ جناب اقبال بھٹی (یوکے) نے غزلیہ کلام سے انتخاب کی سوغات دی اور کینیڈا کے جواں سال شاعر و فرزندِ دلبند شبنم رومانی (مرحوم) نے نظمیہ کلام سے اپنا حسنِ انتخاب کیا اور آپ نے 'براہِ راست' سے نوازنے کے علاوہ مجھ گوشہ نشین کو چہار سو کی وسعت عطا کی۔ حضرت آصف ثاقب کو کو عرصہ دراز سے (معرفت فنون) عروض کے ایک رمز شناس، عالم، اور بڑے شاعر و نثر نگار کے طور پر جانتا اور یاد رکھتا ہوں۔ ان کی توجہ کے لئے شکر گزار ہوں۔ انور سدید، ڈاکٹر سید سعید نقوی (نیو یارک)، یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا) انوار فیروز (راولپنڈی) نجیب عمر (کراچی)، نوید سروش (میرپور خاص)، رومانہ رومی (کراچی)، سجاد نقوی (لاہور)، قیصر نجفی (کراچی) امین راحت چغتائی، شبنم شکیل، غفور شاہ کے قدر دانہ تاثرات کے لئے شکر گزار ہوں۔

وقار بن الٰہی کا 'قرطاسِ اعزاز' دیر آید درست آید کے مطابق بڑا پُر وقار اور تفصیلی ہے سرسری مطالعے سے بھی بڑی سیری ہوئی منشا یاد مرحوم نے جس انداز سے لکھا وہ لاجواب ہے، عجیب اسلوبِ نگارش ہے کہ لگتا ہے سرسری اور سطحی لیکن آدمی بھی سامنے آ جاتا ہے اور اس کی فنی قد آوری بھی۔ وقار بن الٰہی کی تخلیقات کا تکنیکی تجزیہ کرنے میں احمد جاوید نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دوسرے لکھنے والوں نے ذہن اور دل دونوں وقار بن الٰہی کی شخصیت اور فنکاری پر مرکوز کر کے اپنی تحریروں کو محض رسمی ہونے سے بچالیا۔ وقار بن الٰہی کی خود نوشت پڑھنے کی جانب طبیعت مائل ہے اگر چہ کہ خود نوشتوں سے دور بھاگتا ہوں۔ وقار بن الٰہی ایک بے حد بھلے ہونے کے ساتھ کھرے آدمی ہیں۔ اور کردار اساسی افسانوں میں ایک بڑے مقام کے حامل حقیقت نگار ہیں۔ آپ نے 'براہِ راست' میں ان کی شخصیت اور فن کو پَرت پَرت کھلوا کر ایک عجیب فضا سی تشکیل دے دی جس میں وقار بن الٰہی کیمبل پوری ہر پڑھنے والے کے ساتھ بیٹھے، باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ براہِ راست سے بڑا کام عطیہ سکندر علی نے مانوس خطوط کے انداز سے کیا ہے۔ 'صاحبِ قرطاسِ اعزاز کی تصویر جوان' مانوس خطوط' کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے مرتب ہوئی ہے وہ 'براہِ راست' سے مشکل اور مرتب ہونے والی تصویر سے زیادہ من موہنی ہے۔ اختر آزاد کا 'گھر' ایک دل گداز افسانہ ہے۔ لیکن اسلوب، زبان، بیان، عصریت کے لَس سے خالی ہے۔ 'محفل ہست وبود' عذرا اصغر کا اچھا افسانہ ہے۔ 'بے لگام' ڈاکٹر سید سعید نقوی کا یہ افسانہ آج کی دنیا کے اچھے افسانوں میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دیر سے قدم اٹھایا لیکن بڑے اعتماد کے ساتھ۔ صفاتِ نوید نو کے تحت مشکور حسین یاد کا کلام لاجواب ہے۔ منظر ایوبی نے پیارے وطن کے حال احوال کو اشعار میں ڈھال دیا ہے۔ آصف ثاقب کا انداز نیا ہے لیکن دکھ پرانے ہیں

ہوا تو چومنے آتی ہے پر ایسا نہ ہو
تمہارے گال کے سارے گلاب لے جائے

کیسا پیارا، خوبصورت، معصوم لیکن دل کو چھو جانے والا شعر ہے۔ غلام مرتضیٰ راہی غزل کو غزل رکھتے ہوئے بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ غالب عرفان کی غزل سوچتی بہت ہے۔ یہ ان کا اسلوبِ شعری ہے۔ پی۔ پی۔ سری واستوا رند نے کیا خوب کہا ہے۔ میں اپنے آپ بکھرا ہوا ہوں مدت سے راگر میں خود کو سمیٹوں تو

زندگی کم ہے ر' آفتاب' کی ردیف نے جناب خیال آفاقی کی غزل کو نظم بنا دیا ہے۔ایسی غزلیہ نظمیں اور نظمیہ غزلیں اردو شاعری میں اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتی ہیں۔خدا وہ دن نہ دکھائے والی بات رسمی سی ہو کر رہ گئی ہے۔لیکن شاہین فصیح ربانی نے نئی بات پیدا کی ہے۔خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میرا ہم راہی رسفر بھی ساتھ کرے اور ہمسفر بھی نہ ہو۔سب ہی غزلیں من موہنی ہیں لیکن جگہ کم میسر ہے۔شاعر حضرات سے معذرت۔مراق مرزا کے افسانے میں انگریزی لفظوں کی بہتات کے باوجود' سواتی' کی اپنے پیشے کے بارے میں اعتماد سے معمور بات چیت پڑھنے کی چیز ہے۔''ابابیلیں منڈلا رہی ہیں'' بی جی کا کردار اور اس سے مربوط واقعات اور پوری فضا افسانے کی ایک دنیا کی تشکیل دے رہی ہے یہ اندر سے باہر آنے والا افسانہ ہے۔گلزار جاوید جی۔حیات رضوی امروہی نے کیا کہہ دیا ہے ۔ چارۂ دردِ لا دوا اس کے سوا نہ ہو سکا رجس دن جدا ہوئے تھے تم وہ دن جدا نہ ہو سکا۔مصرع ثانی تو تیر کی مانند ذہن و دل میں پیوست ہو کر رہ گیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی خودنوشت ''شام کی منڈیر سے'' کو بجا طور پر انور سدید نے ایک فکری خود نوشت کے طور پر پیش کیا ہے اپنی نظموں کو سامنے رکھکر آپ بیتی تصنیف کی جا سکتی ہے یہ میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔میں تو آپ بیتیوں سے بیزار آدمی ہوں۔

**عبداللہ جاوید** (کینیڈا)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب، اسلام علیکم۔

ستمبر اکتوبر 2011 کا شمارہ نظر نواز ہوا جو حسب معمول اپنے دامن میں ڈھیروں ادبی سوغاتیں لئے ہوئے ہے کس کس نگارش کو سراہا جائے جہاں ''کرشمۂ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست'' والا معاملہ ہو وہاں کس کس چیز کی داد دی جائے۔''وقار بن الٰہی'' سے متعلق ''قرطاس اعزاز'' بڑے خاصے کی چیز ہے جس کے وہ جائز طور پر حقدار ہیں۔آپ نے ان کو نئے سرے سے متعارف کرا کر وہ قرض ادا کیا ہے جو اردو ادب پر واجب تھا۔وہ نہایت خلیق، مخلص، انتھک ادبی کارکن اور کھرے انسان ہیں جو ایک طویل عرصہ سے علم و ادب کی بے لوث خدمت سرانجام دے رہے ہیں وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کہنی مار کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُنہیں توفیق ارزانی فرمائے کہ وہ اسی طرح اپنا ادبی سفر جاری رکھیں۔

**سُرور انبالوی** (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید صاحب، آداب و تسلیمات۔

شکر ہے کہ آپ کا دو ماہی ''چہارسوٗ'' باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے جبکہ دوسرے ادبی سہ ماہی اب شش ماہی (جبکہ نو ماہی) میں تبدیل ہو رہے ہیں۔چہارسو کا نثری اور شعری ''حصہ'' بھی معیاری ہوتا ہے جو پڑھنے کی دعوت دیتا ہے لیکن کاغذی پیرہن کی صورت میں۔اس رسالہ کی ایک اور ادا مجھے پسند ہے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تعداد میں شرکت اور اُن کا اعلیٰ پایہ کا ادبی ''کنٹری بیوشن''۔ان میں میرے ایک ''ہم تخلص'' بھی موجود ہیں۔یہی اُردو کی بہار ہے مگر خزاں پرست حضرات کچھ اور چاہتے ہیں۔

**تشنہ بریلوی** (کراچی)

محیطِ چہارسو!! خوش رہیں سلامت رہیں، السلام علیکم۔

چہارسو کی تازہ آوری، مطالعے کی یاوری میں پیش پیش ہے۔ تحریروں کی پیش رفت خوش آئند ہے آپ اس ضمن میں خوب انصرام و انتظام سے کام لیتے ہیں۔وقار بن الٰہی کا کھِلا کھِلا مسکراتا چہرہ اچھا لگا موصوف سے میری پرانی قلمی دوستی ہے۔انہیں دیکھا نہیں پایا ضرور ہے۔آپ کی مہربانی ہے آپ نے وقار بن الٰہی سے متعلق میرے اشعار ''بے زبانی کا کیا ہے'' شائع کئے۔بڑی عزت ملی۔اب کے بھی رسالے کی شاعری اور نثر پسند آئی۔ایک صدی کا قصہ، اے آر کاردار از دیپک کنول معلوماتی ہے فلم انڈسٹری کے حالات کا پتہ چلا۔''دل دیا درد لیا'' فلم میں نے بھی دیکھی۔اس فلم کی بہت شہرت تھی۔ایک جگہ وحیدہ رحمان سے دلیپ کمار کے ڈائیلاگ زبردست تھے۔ان کے زیر و بم سے ہوش اڑ جاتے ہیں۔یہاں دلیپ کمار کی اداکاری ہمیشہ کی طرح عروج پر ہے۔''دل دیا درد لیا'' اپنے عنوان کے مطابق دردِ دل کی بھرپور آئینہ دار ہے۔کاردار ان دنوں بیمار تھے مرحوم نے اپنا کام کہیں کہیں دلیپ کمار کے ذمے لگا رکھا تھا۔گمنامی اور ناکامی کا الزام کم از کم میری سمجھ میں نہیں آیا۔دلیپ کمار کا رول کہیں بھی منفی نہیں تھا انہوں نے اس رول میں بھی کامیاب اداکاری کی ہے۔

آخر میں ''چہارسوٗ'' کے اس شمارے کے ان دو شعروں کے ساتھ رخصت

مرے پیر کی ہے عجب ادا مرا وہ زہیر ہے دل رُبا
جو غزل میں دے گا وہ مشورہ مرے فن کی زندہ مثال ہے

ہر بلا میرے سر سے ٹلتی ہے
دل سے جب بھی دعا نکلتی ہے

**آصف ثاقب** (بوئی، ہزارہ)

جناب گلزار جاوید صاحب، سلام۔

۲۶ اکتوبر کو کمپیوٹر کھولا، چہارسو کے Latest issue کے لِنک پر گئی۔چہارسو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اسکرین پر جلوہ فگن تھا۔اتنا خوبصورت اور معیاری رسالہ نکالنے پر آپ اور آپ کی ٹیم کے لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔پاکستان کے ان نامساعد حالات میں جہاں بجلی کے بحران کے ساتھ اور بھی نجانے کتنے بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے آپ کیسے وقت پر رسالہ نکال پاتے ہیں۔یہ آپ کی ہی ہمت ہے ڈاکٹر سید سعید نقوی (نیویارک) یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا) انوار فیروز (راولپنڈی) نجیب عمر (کراچی) نوید سروش (میرپور خاص) رومانہ رومی (کراچی) سجاد نقوی (لاہور) قیصر نجفی (کراچی) میں ان تمام لوگوں کی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے ہم میاں بیوی کے گوشے کو پسند کیا اور قدردانی کے الفاظ سے نوازا۔

وقار بن الٰہی (مختار احمد) کا گوشہ دیکھا بھی اور سرسری طور پر پڑھا بھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے 'قرطاسِ اعزاز' سے نواز کر آپ ایک اچھا کام کرتے ہیں۔ اس طرح صاحبِ قرطاسِ اعزاز کے متعلق کافی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ نہ صرف ان کی ادبی شخصیت کے بارے میں بلکہ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے بھی شناسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس مرتبہ وقار بن الٰہی کے قرطاسِ اعزاز کے ضمن میں عطیہ سکندر علی کے ''مانوس خطوط کا جواب نہیں۔ ایسا لگا جیسے کولاج ورک کے ذریعے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ٹکڑوں سے وقار بن الٰہی کی شخصیت سامنے آ گئی ہو۔ اور پھر منشا یاد کی تحریر 'عداوت ہی سہی' وقار بن الٰہی کی شخصیت کی اچھی عکاس ہے۔ اختر آزاد کا 'گھر' عذرا اصغر کا 'محفل ہست و بود' اسلم جمشید کا 'عیدگاہ سے واپسی' سب ہی افسانے اچھے ہیں۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی اچھا لکھتے ہیں ان کا افسانہ 'لگام' ایک اچھا افسانہ ہے۔ آپکا افسانہ 'ابابیلیں منڈلا رہی ہیں' بہت اچھا کردار اساسی افسانہ ہے قاری کو آخر تک پکڑے رکھتا ہے۔ تجسس بھی برقرار رہتا ہے۔ بی جی کے کردار کو آپ نے شروع سے آخر تک نہایت ہنر مندی سے جھلک جھلک پیش کیا ہے۔ اختتام غیر متوقع ہے اور المناک بھی۔

**شہناز خانم عابدی** (کینیڈا)

محترم بھائی گلزار جاوید' السلام علیکم۔

تازہ شمارہ وقار بن الٰہی کو اپنے جلو میں لے کر وارد ہوا یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ میں جب ہائی اسکول میں تھا اُس وقت سے اُن کی کہانیاں شمع / بیسوی صدی وغیرہ میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں ایک عرصے کے بعد انہیں چہارسو کے قیمتی صفحات پر دیکھ کر اطمینان ہوا۔ حق بہ حق دار رسید۔ پھر آپ نے صحیح اعتراف تاخیر فرما کر جریدے کی لاج رکھ لی۔ موصوف کے متعلق یوں تو بہت سارے نامی گرامی لوگوں نے لکھا ہے لیکن حمید شاہد نے مختصراً جو بھی لکھا ہے اُس میں وہ پوری طرح منکشف ہوئے ہیں۔ مراق مرزا کا افسانہ ''پیکدان'' یوں تو بہت خوب ہے لیکن عنوان پر اگر ذرا سا غور فرما لیتے تو ایک خوبصورت عنوان بھی ساتھ ساتھ ہی اُن کے ذہن کے پاس سے گزر گیا ہوگا۔ ''اُگالدان'' پیک دان سے زیادہ مہذب اور شائستہ لگ رہا ہے اور پھر اس سے وہ کراہت نہیں لگتی جو ''پیک دان'' سے لگ رہی ہے گلزار جاوید کی کہانی پسند آئی۔ اس میں زبان و بیان کی چاشنی کے علاوہ موجودہ حالات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ بہت کچھ موجود ہے مبارکباد قبول کیجیے! اس بار شاعری کا حصہ بھی بہت آراستہ ہے۔ امین راحت چغتائی، غلام مرتضٰی راہی اور بھائی خیال آفاقی کی غزلیں بھی پسند آئیں۔

**غالب عرفان** (کراچی)

گلزار بھائی، خوش رہو۔

چہارسو کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ کمپیوٹر کی سہولت سے فوری طور سے نظروں کے سامنے آ جاتا ہے بیٹے سے کہہ کر اِسکا پرنٹ نکلوا لیا تھا تاکہ پڑھنے میں ذرا سہولت ہو جائے۔ براہِ راست میں وقار بن الٰہی سے آپ کا سوالوں کا انداز اور وقار بن الٰہی کے جواب جوانہوں نے تفصیل سے دیئے پسند آئے۔ وقار بن الٰہی کی ''انہی کے دم سے برکت'' کافی دلچسپ ہے اور منشا یاد کا ''عداوت ہی سہی'' اچھا مضمون ہے۔ اختر آزاد کا افسانہ ''گھر'' نئی نسل کی سوچ اور ہمارے وقتوں کے لوگوں کے احساس کی خوب ترجمانی ہے، اور آپ کا ''ابابیلیں منڈلا رہی ہیں'' کس سادگی اور روانی کے ساتھ آپ نے آخر تک نبھایا ہے۔ یہ اُس وقت کے ماحول کی حقیقت بیانی ہے جو آج کل مفقود ہے۔ پڑھ کر اپنا زمانہ یاد آ گیا، کیا لوگ تھے وہ ''مراق مرزا'' کا پیکدان اچھا لگا۔ اس مرتبہ بیشتر افسانے ملک کے بٹوارے پر ہیں اور عذرا اصغر کا ''محفل ہست و بود'' بھی ویسے ہی احساس پیش کرتا ہے حالانکہ انہوں نے ہلکی سی جھلک ہی دکھائی ہے ''ہوا کے دوش پر'' ڈاکٹر فیروز عالم کی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے اور اس مرتبہ خاص طور سے کتّے کے کاٹنے کا ذکر حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ بقیہ تخلیقات بھی چہارسو کے مزاج کی آئینہ دار ہیں۔

**یوگیندر بہل تشنہ** (کیلی فورنیا)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب' سلام و رحمت۔

اس بار ممتاز افسانہ نگار وقار بن الٰہی کے نام قرطاس اعزاز باعث مسرت ہے۔ آپ اردو زبان و ادب کے محسنوں کی شخصیت اور فن کو جس طرح زیرِ بحث لاتے ہیں، وہ تاریخ بھی ہے اور تاریخ ساز بھی۔ وقار بن الٰہی کی خود نوشت ''ماں میں تھک گیا ہوں'' سے انتخاب کئے گئے اقتباسات سبق آموز حکایات کے زمرے میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ ان میں تجربات و مشاہدات کے چراغ بھی روشن ہیں اور علم و حکمت کی جوت بھی جگائی گئی ہے۔ منشا یاد نے ''عداوت ہی سہی'' کے عنوان سے یکسر ایک اچھوتے انداز میں وقار بن الٰہی کا خاکہ تحریر کیا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خاکے مرثیے کہلاتے ہیں۔ منشا یاد نے شگفتہ نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ ریاضی کا ایک کلیہ ہے۔ نفی ضرب نفی = اثبات۔ منشا یاد نے اس کلیے کو ادبی کلیہ بھی بنا دیا ہے اور یوں معاصر خاکہ نگاروں میں خود کو ایک الگ شناخت دی ہے۔ خیال اور واقعہ جب ایک اکائی بنتے ہیں تو افسانہ جنم لیتا ہے۔ اس بات کو ہم رشید امجد کے مضمون ''اپنے دور کا فاتح'' کا ماحصل کہہ سکتے ہیں اور جو وقار بن الٰہی کے فن افسانہ نگاری پر صائب ترین تبصرہ ہے۔ رشید امجد بذات خود اردو افسانے کا وقار ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ وقار بن الٰہی کے دریائے فن کے ایک ایسے شناور ہیں، جو اس کے پھیلاؤ، چڑھاؤ اور بہاؤ کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں آپ بیتی یا خود نوشت پر تبصرہ آرائی ایک کار دشوار ہے، جو ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں۔ پروفیسر جمیل آذر اس حوالے سے ان خواص میں شامل ہیں، جو یہ کار دشوار اپنی معتدل و متوازن رائے کے بل پر کر گزرتے ہیں۔ ''ماں میں تھک گیا ہوں'' پر پروفیسر صاحب کا تبصرہ وقار بن الٰہی کی شخصیت و فن کو خراج عقیدت بھی ہے اور دیانت دارانہ مطالعاتی جائزہ بھی۔ ان کی ہر سطر اور ہر جملہ ان کے دیدۂ و دل کے

بینا ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

احمد جاوید کے ایک زیرک قلمکار ہیں۔ بظاہر انہوں نے وقار بن الٰہی کے دو افسانوی مجموعوں کی زمانی تقسیم پر خیال آرائی کی ہے۔ لیکن درحقیقت انہوں نے افسانہ نگار کے دریائے فن کو کوزے میں بند کر دیا ہے، حمید شاہد نے اپنے مضمون ''پنکھڑی کا گداز'' میں وقار بن الٰہی کو ایک وسیع تناظر میں اپنے ہم عصروں سے بچھڑا ہوا افسانہ نگار لکھا ہے۔ ''پنکھڑی کا گداز'' کا اسلوب ایک نثری نظم کے مماثل ہے۔ ایک افسانہ نگار کے فنّی تجزیئے کے دامن میں لفظ و بیان کے موتی جڑنا مرصع سازی ہے اور یہ ہُنر حمید شاہد کو بدرجۂ اتم نصیب ہے۔ احسان بن مجید ہمارے لئے ایک مانوس نام ہے کہ وہ ایک مستند قلمکار ہیں۔ نظم ہو یا نثر، ان کی فنکارانہ صلاحیت، ہر دو اصناف ادب کے دریچوں سے سورج کی کرنوں کی طرح جھانکتی ہے اور دل و دماغ میں اجالے بکھیر دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون ''ایک شخص کئی کہانیاں'' میں ادبی سلیقے سے وقار بن الٰہی کی خودنوشت پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کا مضمون بجائے خود وقار بن الٰہی کا ایک خاکہ ہے۔ جس میں وقار صاحب کی شخصیت کے تمام رنگ سمٹ کر آ گئے ہیں۔

افسانہ جب تاریخ بن جائے اور اگر اس میں سیاست کا بھی تڑکا لگا دیا جائے تو پھر وہ کیا بن جاتا ہے۔ یہ اہلِ علم جانتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر آزاد نے ''گھر'' کے عنوان سے لکھے گئے اپنے ایک تاثر انگیز افسانے کو تاریخ وسیاست کی نذر کر دیا ہے۔ اگر وہ بٹوارے کے تناظر میں افسانے کے واقعات کا تانا بانا بنتے ہوئے خالصتاً ہجرت کے دکھ اور مٹی کی محبت کے جذبات کو پیشِ نظر رکھتے تو زیادہ مناسب تھا۔ غیر ضروری سیاسی مباحث نے افسانے کی ادبیت پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ اگر کوئی بیک وقت کسی افسانے میں کہانی کاری کے سلیقے، اسلوب کی جاذبیت، واقعات کی بنت کاری، فلیش بیک کے ہنر، منظر نگاری اور سب سے بڑھ کر رگ و ریشہ میں اتر جانے والے ہجرت کے کرب کو یکجا دیکھنا چاہے تو عذرا اصغر کے افسانہ بعنوان ''محفل ہست و بود'' کا مطالعہ کرے۔ مختصر سے افسانے میں تاثر کا ایک کہسار کھڑا کر دینا ایسا وصف ہے جو عذرا اصغر کا فنّی اختصاص ہے اور انہیں صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شامل کرتا ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے ''لگام'' کے عنوان سے ایک خوبصورت علامتی افسانہ تحریر کیا ہے۔ اس افسانے کی اساسی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علامت ابہام کے بجائے ابلاغ کے در وا کرتی ہے۔ یہ افسانہ امریکہ کے اصل سیاہ فام باشندوں اور سفید فام آبادکاروں کے درمیان نسلی تعصب کی جاری سرد جنگ کا بھرپور محاکمہ پیش کرتا ہے۔ علامت کی کوکھ سے کہانی کا جنم لینا ایک ایسا تجربہ ہے جو صرف ڈاکٹر سید سعید نقوی کے یہاں دیکھنے کو ملا ہے۔ مراق مرزا کا افسانہ ''پیکدان'' عصر حاضر میں مروج کہانی کاری کے جدید رجحان، حقیقت نگاری کا مظہر ہے۔ اس افسانے کی نمایاں خوبی تجسس ہے۔ علاوہ ازیں نقطۂ عروج میں بھی افسانہ نگار نے مہارتِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ موضوع میں عمومیت کا عنصر ہونے کے باوصف مراق مرزا نے اسلوب بیان کی اثر آفرین سے افسانے کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''عیدگاہ سے واپسی'' بھی ایک نہایت مانوس موضوع پر لکھی گئی کہانی ہے۔ ہندو مسلم فسادات پر اس قدر افسانے لکھے گئے ہیں کہ ان کا شمار کرنا بھی محال ہے۔ تاہم افسانہ نگار کا جذبہ انسانیت قابل قدر ہے، جس کا اظہار انہوں نے اپنے افسانے میں کیا ہے۔ اس موقع پر ایک تاریخی حوالے کی تصحیح ضروری ہے۔ حضرت علی اصغرؑ کو حرملا نامی یزیدی فوج کے تیرانداز نے تیر سہ شعبہ سے نشانہ بنایا تھا۔ جبکہ شمر بن ذی الجوشن نے سیّد الشہدا حضرت امام حسینؑ کا حالت سجدہ میں سر قلم کیا تھا۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ ''ابابیلیں منڈلا رہی ہیں'' گلزار جاوید کا ایک شہکار افسانہ ہے، جو واقعات کی فنکارانہ بنت، کردار نگاری، تجسس اور چونکا دینے والے انجام کی بدولت ایک معیاری افسانہ کے طور پر منصۂ شہود پر آیا ہے۔ بی جی ایک زندہ کردار کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ گلزار جاوید نے ایک جدید موضوع پر قلم اٹھایا ہے، جسے وقت کی ضرورت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس افسانے پر افسانہ نگار کی بہر زاویہ فن گرفت مضبوط ہے۔ کئی مقامات پر شگفتہ نگاری نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

آصف ثاقب ایک پختہ کار شاعر ہیں۔ ان کے سماجی و معاشرتی شعور میں سمندر کی سی گہرائی ہے۔ ان کی نظم ''بے زبانی کیا ہے'' فرد سے اجتماع تک کے سفر کی کہانی ہے۔ اس نظم میں پیش نظر معاشرتی زبوں حالی کے حوالے سے جس نوع کی بے حسی و بے زبانی کے کلچر کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس پر انہوں نے بھرپور طنز کیا ہے۔ نظم کی نمایاں فنّی خوبی تہ داری کا وہ اسلوب نو ہے جو آصف ثاقب سے مخصوص ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کمپوزنگ کے تیر کا نشانہ بننے کے باوجود نظم اپنا تاثر قائم رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔ ہم نے ''چہارسُو'' کے مدیر کے نام ایک مراسلے میں مشکور حسین یاد کی غزل پر ایک اجمالی تبصرہ رقم کیا تھا، مگر مراسلہ تاخیر سے پہنچنے کے باعث شائع نہ ہوا۔ ہماری یہ دیرینہ خواہش ہے کہ یاؔد صاحب کی غزل پر اپنی رائے کا بالتفصیل اظہار کریں۔ بہر کیف! آج ہم اجمالی اظہار رائے پر اکتفا کرتے ہیں۔ تقسیم کے بعد (ہمارے نزدیک) تین ایسے غزل گو شعراء افق شعر و سخن پر طلوع ہوئے۔ جنہوں نے اپنے اپنے منفرد اسلوب شعر کی روشنی سے ایوان اردو غزل کو منور کر دیا۔ ناصر کاظمی نے میر تقی میرؔ کی غزل میں توسیع کی۔ لیکن اس انداز سے کہ تغزل تو میرؔ کا رہنے دیا۔ لیکن موضوع و مواد میں تنوع لائے اور لفظیات، تراکیب اور مرکبات لفظی کو جدید رنگ و آہنگ بخش دیا۔ شکیب جلالی نے یکسر اردو غزل کی کایا پلٹ دی۔ جذبہ، خیال، ڈکشن، غرض ہر زاویہ فن سے انہوں نے ایک نئی غزل سے متعارف کرایا۔ ان کے آگے بڑے بڑے غزل گو چت ہو گئے اور ان کے رنگ میں غزل کہنے پر مجبور ہو گئے۔ کیونکہ یہ سکّہ رائج الوقت تھا۔ لیکن اس بھیڑ میں مشکور حسین یاد سب سے الگ نظر آئے۔ بلکہ انہوں نے شکیب کا فسوں توڑ دیا۔ آج وہی ایک ایسے غزل گو ہیں جو

میدانِ غزل گوئی میں اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑے ہیں۔ان کی سی تہہ داری اور رمزیت کے ساتھ ساتھ تنقیدی ایمائیت بھی معاصر غزل گوشعراء میں کہیں بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یاد صاحب کی اپنی لغت غزل ہے۔ بالخصوص ردیف کا ان کے یہاں ایسا بے بہا خزانہ ہے جس کی مثال غزل کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ مشکور حسین یاد ایک نہایت زرخیز ذہن کے شاعر ہیں۔وہ جہاں تازہ بتازہ تراکیب ومرکبات لفظی تخلیق کرتے ہیں، وہاں نو بہ نو موضوعات ومضامین بھی اختراع کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزل سر بسر فلسفۂ حیات و کائنات سے مملو ہے۔ان کا گردوپیش کی اشیاء وموجودات کے بارے میں اپنا ایک زاویۂ فکر ونظر ہے۔اگر بنظر غائر ان کی غزل کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کم وبیش ہر غزل میں ان کی فکر کی زیریں لہریں عظمت انسانی کو اپنی جلو میں لئے ہوئی ہیں۔

**قیصر نجفی** (کراچی)

محترم گلزار جاوید، تسلیمات۔

آج ہی نومبر، دسمبر کا چہارسو موصول ہوا، وقار بن الٰہی سے آپ کا انٹرویو بہت دلچسپ ہے۔''ابابیلیں منڈلا رہی ہیں'' کے عنوان نے اپنی طرف کھینچ لیا اور خود کو پڑھوا کر چھوڑا۔اس قدر پُر اثر تحریر ہے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ نظمیں بھی پسند آئیں، آؤ نوحہ لکھیں، طوفان تجزیہ نہیں سنتے، بہت خوب ہیں۔ سارا شمارہ ہی آپ کے حسنِ ترتیب کا بہترین آئینہ دار ہے۔

**پروین شیر** (کینیڈا)

پیارے گلزار بھائی! سلامِ شوق۔

اب کی بار قرطاس اعزاز میں وقار بن الٰہی صاحب کے بارے میں سبھی مندرجات نے بہت مزہ دیا۔ براہِ راست کی مفصّل اور مدلّل گفتگو کے علاوہ ان کی اپنی دو تحریروں اور چند دیگر مشاہیر، خاص طور پر حضرت منشا یاد، احسان بن مجید اور پروفیسر جمل آذر کے مضامین پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوا گویا وقار صاحب کے اعلیٰ کردار اور اُن کی علمی وادبی شخصیت کے سبھی گوشے روشن ہو گئے ہیں۔اسی کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح کو مکمل پڑھنے کا شدید اشتیاق بھی جاگ اٹھا ہے۔ یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ پروفیسر جمیل آذر کی پیدائش انبالہ کی ہے۔مجھ کم فہم کو یہ معلوم ہی نہ ہوسکا ورنہ ہریانہ کے شعراء وادباء سے متعلق اپنے تحقیقی پروجیکٹ پر کام کرتے وقت ان سے بھی رجوع کرتا۔ بہرحال آپ اگر ان کے مفصّل کوائف کسی طرح مجھے فراہم کراسکیں تو کم از کم ''انبالہ کے مسلم شعراء وادباء'' سے متعلق مقالے کو اپنے اگلے مجموعۂ مضامین میں شامل کرتے وقت ان کا ذکر خیر کرسکوں۔ افسانے بھی بہت خوب ہیں۔فرقہ وارانہ فسادات اور ۱۹۴۷ء کے ماحول اور خونیں مناظر پر مبنی آپ نے اب کی بار تین کہانیاں شائع فرمائی ہیں ''گھر''، ''عیدگاہ سے واپسی'' اور آپ کی دل دوز تحریر ''ابابیلیں منڈلا رہی ہیں''، جنہیں پڑھ کر دل کئی بار رو اُٹھا اور اپنے بچپن کے کئی زخم پھر سے تازہ ہو گئے۔ان کہانیوں کو دو دو تین تین بار پڑھ چکا ہوں اور ہر بار آنکھیں نم ہو گئیں۔ وقار صاحب نے بھی اپنی سوانح میں ایسے ہی کچھ دردناک اور دل خراش واقعات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن میرا یقین ہے کہ جب تک اطہر علی خاں، ستیہ کمار، بابا سُکھدیو اور بی جی جیسی فرشتہ سیرت شخصیتیں دنیا میں زندہ ہیں انسانیت کبھی نہیں مر سکتی۔ حصہ نظم میں حضرات امین راحت چغتائی، مشکور حسین یاد، محمود الحسن، سعید قیس، شاہین فصیح ربانی، عرش صہبائی، خورشید انور رضوی، اکرام تبسم، محمود شام، کشمیری لال ذاکر، انوار فیروز، قیصر نجفی، توقیر حیدر اور تنویر شاہد کے کلام نے خاص طور پر متاثر کیا۔ فیروز عالم اور دیپک کنول دونوں صاحبان کے کالم ہمیشہ کی طرح بہت دل چسپ اور معلوماتی ہیں۔ وزیر آغا (مرحوم) سے متعلق ڈاکٹر انور سدید صاحب کے گراں قدر ارشادات عالمانہ بھی ہیں اور دل آویز بھی۔ منشا یاد صاحب کی وفاتِ حسرت آیات کی خبر سے دل بہت رنجیدہ ہوا۔ خدا انہیں مغفرت عطا کرے۔

**مہندر پرتاپ چاند** (انبالہ بھارت)

مُدیرِ محترم سلام ورحمت۔

ہارڈ کاپی کی عدم دستیابی کی صورت میں مقام شکر کہ سافٹ کاپی کی راہ ہموار ہوئی کہ (سہواً ستمبر، اکتوبر کا شمارہ لکھا گیا ہے) اور جستہ جستہ نومبر دسمبر کے شمارے سے استفادے کا موقعہ ملا جو اس مرتبہ دیگر مشمولات نظم ونثر کے ساتھ صاحب قرطاس اعزاز جناب وقار بن الٰہی کے نام سے مرتب ومزین ہوا۔ ''براہِ راست'' کا آغاز ہی جناب منیر نیازی کے پہلوئے تاخیر کے تذکرے سے ترفع پا گیا اور مکالمہ تو ہمیشہ سے ہی مذکورہ شخصیت کے متنوع جہات کو کمال ہنروری و مشاقی سے چند صفحات کے اندر دریافت کرنا ہوتا ہے۔ مانوس خطوط میں مشاہیر ادب نے انہیں خوبصورت پیرائے سے یاد کیا ''عداوت ہی سہی'' میں منشا یاد صاحب کے دوستانہ وبے تکلفانہ اسلوب کی بے ساختگی خوشگوار اضافے کی طرح ساتھ ساتھ رہی، بلاشبہ وہ دنیائے ادب میں انمنٹ خلا چھوڑ گئے تاہم اپنی پنجابی وارد و تخلیقات کے توسط سے قارئین کے ذہنوں کو روشن کرتے رہیں گے۔ ابابیلیں منڈلا رہی ہیں۔ بطور استعارہ پوری کہانی کی فضا کو محیط کئے ہوئے ہے بی جی کے کردار کو اُن کی جملہ صفات کے ساتھ جس گہرائی و گیرائی سے تخلیق کیا گیا ہے اُس نے اُسے جیتے جاگتے شفیق سراپے واخلاص کا رہستی کے روپ میں تبدیل کر دیا ہے اس پر مستزاد خاکہ نگاری کی خصوصیات نے کہانی کو قاری کے لیے مزید تاثر انگیز بنایا ہے۔ گزشتہ شمارے میں محترم ستیہ پال آنند اور اس مرتبہ بھی نئی کتب سے تعارف ذہنی سرشاری سے کم نہیں، طوفان تجزیئے نہیں سنتے، میرا کوئی دوش نہیں، شہر کا شہر ہو گیا اُداس، بڑی اسکرین کچھ کہتی ہے، سُنتی اور سُناتی ہوئی نظمیں محسوس ہوتی ہیں۔ شام کی منڈیر سے اور انبالہ کے مسلم شعراء میں محترم آغا جی اور دیگر علمی وادبی شخصیات کے تذکرے پرچے کو وقار واعتبار عطا کر رہے ہیں، سانسوں کا سنگیت ذاتی ردِعمل کے حوالے سے قاری کی تحسین کے انداز میں

جداگانہ تجزیہ وتبصرہ ہے اور ایک صدی کا قصہّ دلچسپی وآ گہی کے ساتھ تاریخی تسلسل کا ترتیب پانا بھی ہے۔ دعا ہے کہ سب کشادہ دلی سے ''چارہ گری'' کریں۔''خدا کرے کہ نیا سال سب کوراس آئے !۔

**شگفتہ نازلی** (لاہور)

محّبی گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

اس دفعہ قرطاسِ اعزاز (وقار بن الٰہی کے نام) پڑھ کر مزا آ گیا۔ میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ سچ لکھنا اور حق کہنا بڑا مشکل کام ہے۔ وقار بن الٰہی نے سچ لکھ کر دکھایا ہے اور سچ لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ قلم مقدس ہے۔ قلم اُس نور کا تیسرا حصّہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے الگ کر کے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلے حصّہ سے کائنات بنی، دوسرے حصّہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ظہور میں آئی اور تیسرے حصّہ سے قلم بنا۔ خوش قسمت ہیں وہ رائٹرز جو مقدس قلم سے سچ لکھتے ہیں۔ وقار بن الٰہی کا طرزِ تحریر موجودہ شمارے میں شامل اُن کا افسانہ ''چاہ درپیش'' ہی سے عیاں ہے۔ وقار بن الٰہی تو خوش قسمت ہے کہ اُس نے پھر بھی اپنا مقام حاصل کر ہی لیا ہے۔ ورنہ میرے ایسے کئی سچ لکھ کر مسکین بنے بیٹھے ہیں۔ آپ بیتی ''ماں میں تھک گیا ہوں'' سے ''اُنھیں کے دم کی برکت'' عنوان سے انتخاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ بیتی ''ماں میں تھک گیا ہوں'' پڑھنے کے لائق ہے میں انشاء اللہ جلد ہی اسے حاصل کر کے پڑھوں گا اور پھر ذاتی کتب خانہ کی زینت بناؤں گا منشایاد (اللہ اُسے جنّت نصیب کرے) پروفیسر رشید امجد اور جمیل آذر نے بڑے عمدہ، معلوماتی اور دلچسپ مضامین سے وقار بن الٰہی کی عظمت کو عیاں کیا ہے۔ عطیہ سکندر علی کا ''مانوس خطوط'' کے عنوان سے وقار بن الٰہی کے بارے خطوط کا انتخاب بھی پڑھنے والا ہے۔ ''رس رابطے'' بھی اس دفعہ تنقید، تحقیق اور عمدہ تحریروں کا دلچسپ انتخاب ہے۔ محترم انور سدید صاحب نے ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی ''شام کی منڈیر سے'' پراچھا تبصرہ کیا ہے۔

**پروفیسر زہیر کنجاہی** (راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

چہارسو آج ہی ملا اور میں نے قرطاس اعزاز ایک ہی رَو میں اسی انہماک کے ساتھ پڑھا جس طرح 65-64ء میں وقار صاحب کا لیکچر سنا کرتی تھی۔ گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں مجھے ان کی شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل رہا اور یہ میری خوش بختی تھی۔ حرف شناسی کا شعور اسی دور میں اجاگر ہوا۔ ویسے وقار صاحب ''ڈاہڈے'' بہت تھے اور وہ بھی فقط ہمارے لئے۔ کسی کی توجہ ذرا بھٹکتی نہیں اور رول نمبر فلاں کا کوڑا شائیں سے ہوا میں لہرا کر اس کی طبیعت درست کر دیتا۔ جی ہاں، وہ ہمیں ناموں سے نہیں رول نمبر سے بلاتے تھے (کیا خوبصورت ترکیب ہے خطاب کو غیر شخصی بنانے کی) مگر ان کے لیکچر میں وہ بہاؤ، روانی اور تناسب ہوتا تھا جو ہمیں باندھ کے رکھتا تھا۔ اللہ انہیں صحت وتندرستی کے ساتھ سلامت رکھے مجھے فخر ہے کہ ابتداء میں ہی ان جیسا استاد نصیب ہوا۔ اچھا استاد شخصی رابطہ نہ رکھتے ہوئے بھی کیسے آپ کی شخصیت کو نکھارتا ہے، ہم سے پوچھیئے۔

**پروین ملک** (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ قرطاس اعزاز میں آپ نے اس مرتبہ وقار بن الٰہی کے نام کا انتخاب ہے۔ وقار بن الٰہی کو میں نے کبھی نہیں پڑھا لیکن چہارسو میں ان کے فن اور شخصیت پر مضامین اور انٹرویو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ بڑے پائے کے ادیب ہیں۔

**صابر عظیم آبادی** (کراچی)

برادرِعزیز گلزار جاوید صاحب' سلام مسنون۔

چہارسو جس طرح آگے بڑھ رہا ہے اور جس طرح ایک نئے سے نئے فکری مباحثہ کی صورت مکتوبات میں بھی دوسرے مواد کے ساتھ اختیار کر رہا ہے میں تو کہتا ہوں کہ یہ اب اپنی جگہ تاریخ بھی ہے فلسفہ بھی ہے ایسے پیچ در پیچ مسائل کی گرہ کشائی بھی کہ کہاں ایسے معمولی گنا جاسکے اور پھر آپ کا براہِ راست تو آپ کو ادب کا ایسا بہی خواہ بھی قرار دے رہا ہے کہ شاید ہی کئی حیثیتوں میں کوئی اور ہو۔ میرے بہت پیارے دوست جب کہ میں اُس کے مقابلے میں کبھی چھوٹا سرکاری اہل کار تھا اب کیسے کیسے معانی کی تہوں کو لئے ہوئے ایک گنجلک موضوع بھی آگے لایا ہے زندہ باد۔

**رب نواز مائل** (کوئٹہ)

مکرمی جناب گلزار جاوید صاحب' تسلیمات۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ قرطاسِ اعزاز وقار بن الٰہی کے نام، آپ نے خود تسلیم کیا ہے کہ یہ اعزاز انہیں بہت پہلے ملنا چاہیے تھا۔ بہرحال ہمیں ان کا تفصیلی تعارف حاصل ہوا۔ اب ان کی بعض تخلیقات کو پڑھنے کے لیے بے چین ہوں خصوصاً ''ماں میں تھک گیا ہوں''۔ سرکاری ملازمت اور ادب کا سنگم ذرا مشکل سے ہوتا ہے تاہم انہوں نے دونوں جگہ دیانتداری کا سکہ جمایا جو ایک روشن مثال ہے۔ بنجامن فرینکلن نے کہا تھا ''اگر تم چاہتے ہو کہ مرنے اور گل سڑ جانے کے بعد تمہیں فراموش نہ کر دیا جائے تو یا پھر پڑھے جانے کے قابل چیزیں لکھو یا لکھے جانے کے قابل کام کرو''۔ جب زندگی کی شام سر پر ہو تو شاید ہم میں سے ہر ایک یہی کہے ''ماں میں تھک گیا ہوں'' اس قدر خوبصورت عنوان رکھنے پر وقار بن الٰہی لائق صد مبارکباد ہیں۔ وقار بن الٰہی پر منشایاد، رشید امجد اور پروفیسر جمیل آذر تینوں مضامین منفرد ذائقہ لیے ہوئے ہیں۔ ان کا نمائندہ افسانہ ''چاہ درپیش'' پڑھ کر اندازہ ہوا کہ معاشرے کی دکھتی رگ پر ان کی گہری نظر ہے۔ دفتری داؤ پیچ کے درمیان تو انہوں نے برسوں گزارے ہیں۔ ڈاکٹر اختر آزاد نے اپنے افسانے ''گھر'' میں

تقسیم کا نوحہ بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ خون میں وفا اور شرافت کے جراثیم ہوں تو وہ ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی کا افسانہ ''بے لگام''۔ انتقام گھوڑے کا ہی کیوں نہ ہو۔ دہشتناک ہوتا ہے۔ مراق مرزا نے ''پیک دان'' میں معاشرے کے کڑوے سچ کو بے باکی سے پیش کیا۔ پیک دان کا عنوان انتہائی معنی خیز ہے۔ اسلم جمشید پوری کا ''عید گاہ سے واپسی'' سرحد کے دونوں طرف انسان ہی انسان کا دشمن ہے۔ کہیں تفریق مذہب کی تو کہیں فرقوں اور آئیڈیالوجی کا اکھاڑہ۔ حیوانوں میں کوئی جنس اپنے ہم جنس سے نہیں لڑتا نہ چیرتا پھاڑتا لیکن واہ رے حضرت انسان۔ انسان کے سب سے بڑے دشمن۔ آپ کی نگارش ''ابابیلیں منڈلا ہی ہیں'' پڑھ کے دل سے ہُوک اٹھی۔ کاش ہم ہمیشہ بچے رہتے کبھی بڑے نہ ہوتے۔ آپ کی ''بی جی'' ہمارے معاشرے میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ کاش ہم ان کی قدر کرتے اور اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ غالب عرفان، تشنہ بریلوی اور خیال آفاقی کی غزلوں نے مزہ دیا۔

نجیب عمر (کراچی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ حسبِ معمول وقت پر ملا۔ خطوط کے بعد ڈاکٹر فیروز عالم کی داستان حیات ''ہوا کے دوش پر'' پھر براہِ راست اور پھر بقیہ تحریروں کو مزے سے پڑھتا رہا۔ ہوا کے دوش پر کی زیرِ نظر قسط پُر اسرار فضا میں لپٹی ہوئی ہے، عجیب خوف و دہشت کے احساسات کو بڑی ہنر مندی سے صفِ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ حقائق کی تصدیق میں نے اپنے والد صاحب سے کی۔ اُنہوں نے بھی ایک انجانے ڈر اور بے یقینی کی داستان بیان کی کہ ڈاکٹر صاحب کے مکان سے ملحقہ مکان میں کتے کے بھونکنے کی آوازیں آنا اور پھر ارشد کی موت غیر معمولی واقعات ہیں۔

''قرطاس اعزاز'' وقار بن الٰہی کے نام کر کے آپ نے ایک ادبی مقام اور مدبرانہ شان میں اضافہ کر لیا ہے۔ ''براہِ راست'' میں وقار صاحب نے آپ کے سوالات کے جوابات بڑے اطمینان اور تفصیل سے دیئے ہیں جن سے اُن کی افسانہ نگاری کی بابت بہت کچھ سامنے آیا ہے۔ رسائل میں تنقیدی و تجزیاتی نوعیت کے خطوط اور انٹرویو سے اہلِ علم وفن کے نظریے اور زاویے کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ وقار صاحب کی خودنوشت سوانح عمری ''ماں میں تھک گیا ہوں'' کے اقتباسات دلچسپ ہیں جس سے کتاب پڑھنے کی جانب ذہن ودل مائل ہوئے ہیں۔ منشا یاد مرحوم کا مضمون ''عداوت ہی سہی'' کا پہلا جملہ ہی وقار صاحب کی شخصیت کا خوب احاطہ کر رہا ہے۔ محترم رشید امجد، پروفیسر جمیل آذر، احمد جاوید اور حمید شاہد کی تحریریں وقار صاحب کی شخصیت اور فن کو نہ صرف سمجھنے میں مدد دیں گی بلکہ اُن کی افسانہ نگاری کو اعتبار بخش رہی ہیں۔ وقار بن الٰہی کا ایک افسانہ ''چاہ درپیش'' پرچے میں شامل ہے جو کم محسوس ہوا۔ البتہ اس بار افسانوں کا انتخاب آپ کے ذوق کا حامل ہے۔ محترمہ عذرا اصغر کا ''محفل ہست وبود'' آخیر تک اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے۔ محترمہ نے احساسات کو خوب پینٹ کیا ہے۔ ڈاکٹر اختر آزاد کی کہانی میں گھر کو ایک وسیع علامت کے طور پر برتا گیا ہے، اس میں محبتوں کے رشتے اور امانت کے عظیم جذبے کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے جبکہ نئی نسل کی حوسِ زر کی طرف بھی اشارہ موجود ہے اور جنگ سے نفرت، امن سے محبت کا درس بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر سعید نقوی کا ''بے لگام'' موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی سے اچھا افسانہ بن گیا ہے۔ گلزار جاوید کا ''ابابیلیں منڈلا رہی ہیں'' پُر خلوص محبت کے رشتوں کی پُر کشش داستان ہے۔ ہجرتیں، جدائیاں، ذات قبیلے اور مذہب، تو کہیں محبت کی راہ بنتی ہیں تو کہیں دشمنیوں کا سبب پیدا کرتی ہیں۔ یہ افسانہ جس دور سے تعلق رکھتا ہے گلزار جاوید نے پرانے موضوع میں نئے رنگوں اور دکھوں کا اضافہ کیا ہے، بہت خوب۔

مشکور حسین یاد نے اپنی غزل کی انفرادیت برقرار رکھی ہوئی ہے، منظر ایوبی چھوٹی بحر میں اچھے شعر کہتے ہیں، کرامت بخاری بھی چھوٹی بحر میں غزل کیا کہتے ہیں کمال کرتے ہیں۔ امین راحت چغتائی کی غزل داخلی و خارجی کیفیت کی ترجمان ہے۔ باقی شعراء بھی اپنی جگہ خوب بلکہ بہت خوب ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے وزیر آغا مرحوم کی منفرد خودنوشت ''شام کی منڈیر سے'' کا تجزیہ اُس کے باطن میں اُتر کر کیا ہے۔ مہندر پرتاپ کا مضمون ''انبالہ کے مسلم شعراء وادبا'' پر مزید محنت کی جاتی تو بہتر تھا۔

نوید سروش (میر پور خاص)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسو یوں تو بہت سے خوبصورت رنگوں کا مجموعہ ہے چاہے وہ رنگ شاعری کے ہوں یا نثر کے لیکن اس میں شائع ہونے والے ایک نثر پارے کا رنگ ایسا ہے جو سب سے دلفریب اور اچھوتا ہے اور اسی اچھوتے سلسلے نے آج مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ فیروز عالم کی خودنوشت ''ہوا کے دوش پر'' کی ہر قسط یوں تو دلچسپ اور شاہکار ہوتی ہے لیکن پچھلے شمارے میں شائع کردہ ''کچھ پراسرار واقعات'' نے دل چھو لیا۔ پراسرار اور مافوق الفطرت واقعات شائد یوں بھی توجہ جلد حاصل کر لیتے ہیں پھر اگر انہیں فیروز عالم جیسے لکھنے والے مل جائیں تو یقیناً ان کے اثر سے نکلنا جلد ممکن نہیں ہوتا۔ ان کا انداز تحریر اور انکی یادداشت اس غضب کی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور بہترین منظر نگاری سے پڑھنے والے کے سامنے جیسے اس دور اور واقعے کی تصویر سی پھر جاتی ہے۔ خدا ان کے قلم میں یہی روانی اور تاثیر قائم رکھے کہ ہم پڑھنے والوں کو ایسا لکھنے والوں کی اشد ضرورت ہے۔ میری فیروز عالم صاحب سے گزارش ہے کہ اپنی سوانح حیات کو جلد کتابی صورت میں شائع کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں۔ میں دعویٰ کر سکتی ہوں کہ انکی یہ کتاب اردو ادب کے خزانے میں ایک نادر اور منفرد اضافہ ثابت ہوگی اور ادبی حلقوں میں بہت پزیرائی حاصل کرے گی۔

ثمینہ روحی (کینیڈا)

## ...... پاک چین دوستی ......

یہ مجموعۂ قطعات جوڈاکٹر خالد عباس الاسدی (مقیم مدینہ منورہ) کے رشحاتِ قلم پر مشتمل ہے، پاکستان چین دوستی کو لائق اعتنا خراجِ تحسین ہے۔اس میں کوئی دُوسری رائے نہیں کہ چین کے ساتھ دوستی نہ صرف دوطرفہ بلکہ اس قدر گہری ہے کہ اس کی جڑیں پاتال میں اُتر چکی ہیں۔ مصائب و آلام کے ہر دور میں اس عظیم دوست نے ہماری ''اداؤں'' کے باوجود پاکستان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر،ممکنہ حد تک تعلقِ خاطر نبھایا ہے۔ یہ قطعات، قطعہ نگاری کے حوالے سے بے سقم ہیں: یہ محبت کی ایک لازوال داستان ہیں جو دونوں ملکوں کو مزید قریب لانے میں ممد ثابت ہوں گے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چین نے اب تک پاکستان کے ساتھ جس میدان میں بھی تعاون کیا، اُس کی پوری رُوداد چار چار مصرعوں میں اس سلیقے سے پیش کی گئی ہے کہ ہر قطعہ دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔کیا ہی اچھا ہو اگر ان کا چینی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے دل سے قریب دوست چین کو ہدیہ پیش کیا جائے! پاک چین دوستی کی امین یہ مجلد کتاب چھہتر صفحات کو محیط ہے جس پر ایک سو پچاس روپے قیمت درج ہے اور دستیابی کا پتہ کاغذی پیرہن لاہور بتلایا گیا ہے۔

...... مجید نظامی

## ...... واہگہ کے اُس پار ......

''واہگہ کے اس پار'' شمشاد احمد کے اُس سفر کی وہ روداد ہے جو سفر انہوں نے بھارت کا کیا۔شمشاد احمد اردو ادب کی نمایاں شخصیات میں سے ایک شخصیت ہیں۔ان کا تعارف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ادبی دنیا کے پہاڑ و دمن میں ان کا سفر طویل برسوں پر محیط ہے۔ لاتعداد افسانوں اور ناول کے بعد اب انہوں نے ''واہگہ کے اُس پار'' کے سفر کی روداد کو قلم کی وساطت سے قارئین تک پہنچایا ہے۔شمشاد احمد کو ۲۰۰۰ء میں انجمن ''قلم برائے امن'' کے وفد میں شامل ہوکر بھارت جانے کا موقع ملا۔ بھارت کے دس روزہ قیام میں شمشاد احمد نے بھارت اور بھارتی باشندوں کو کیسا پایا، اپنے من موہنے اسلوب میں ان تاثرات کو تصویر کیا ہے۔ایک سو بیالیس مجلد صفحات کا یہ سفرنامہ مبلغ دو صد روپے کے عوض ویلکم بک پورٹ، کراچی پر بآسانی دستیاب ہے۔

...... عذرا اصغر

## ...... منور چہرے ......

سرگودھا اِس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہے کہ اس کے باسیوں میں پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم جیسی دردِ دل رکھنے والی شخصیت موجود ہے۔جس نے سرگودھا سے تعلق رکھنے والے تمام نامور افراد کی یادوں کو بالخصوص اور ملکی سطح کی اہم شخصیات کی یادوں کو بالعموم زندہ جاوید بنانے کا مشکل مگر اہم کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔اس سے پہلے اس ضمن میں ان کی متعدد کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں ''جنہیں ہم بھول بیٹھے ہیں''''اب اُنہیں ڈھونڈ چراغ رخِ زیبا لے کر''''راؤ عبدالمنان۔ایک تحریک''''فقیر سرگودھا (علامہ رشک ترابی)''''نوائے انور (انور گوئندی)''''نوائے شوق (محمد حسین شوق)''''میرے عہد کے عہد ساز''''گلِ دیدور''''روشنی زندہ ہے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''منور چہرے'' اس سلسلہ کی تازہ ترین کڑی ہے۔اس میں حسبِ سابق مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مرحوم اشخاص کے اذکار شامل ہیں۔ڈاکٹر تبسم نے بڑی محنت سے اسماء الرجال کے حوالہ سے کم و بیش ایک صدی کی علاقائی تاریخ مرتب کی ہے اور اس کہکشاں میں قومی شہرت کے ستارے اپنی اپنی جگہ ضوفشاں نظر آتے ہیں۔منور چہرے دو سو چوبیس صفحات مجلد، تین صد روپے کے عوض القمر انٹر پرائز اردو بازار لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

...... پروفیسر صاحبزادہ محمد عبدالرسول

## فیض فہمی

نیویارک (خالق حسین صدیقی) پانچویں عالمی اردو کانفرنس اور فیض کے صد سالہ جشن کے موقع پر اردو ٹائمز کی سرپرستی میں 24 جون 2011ء کو نیویارک میں منعقد ہوا۔ ممتاز محقق، شاعر، دانش ور ڈاکٹر سید تقی عابدی کی شاہکار کتاب ''فیض فہمی'' کی رسمِ رونمائی انجام ہوئی جو اس تقریب کی خاص توجہ کا مرکز بنی رہی۔ اس کتاب میں 162 مضامین کے ذریعہ عظیم شاعر فیض احمد فیض کی شخصیت، شاعری، نثری تخلیقات کا ہر زاویہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ فیض احمد فیض کی چھوٹی بیٹی منیزہ ہاشمی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے افتتاحیہ اجلاس کے دوران اس کتاب کی رونمائی کی۔ محترمہ منیزہ ہاشمی نے کتاب کو فیض سے محبت رکھنے اور فیض کو پڑھنے والوں کے لیے ایک انمول تحفہ قرار دیا۔ پروفیسر نارنگ نے ''فیض فہمی'' کو عظیم ترین اور تاریخی تحفہ قرار دیا اور کہا کہ یہ کتاب فیض پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک بڑا خزانہ ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے ذاتی خرچ سے شائع کروائی ہے تاکہ بغیر کسی قیمت کے فیض کے چاہنے والوں اور فیض پر کام کرنے والوں کو تحفہ کے طور پر پیش کی جاسکے۔ اس کتاب میں تقریباً پچاس (50) سے زیادہ مضامین ڈاکٹر تقی عابدی نے لکھے ہیں۔ کتاب کے پیچھے مشہور آرٹسٹ ایم ایف حسین کی قلم سے بنائی ہوئی 1976ء کی تصویر بھی چمڑے کی جلد پر پرنٹ کی گئی ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں فیض کا غیر مدوّن کلام بھی موجود ہے جو اُن کی کلیات میں شامل نہیں ہے۔